معارفِ آیۃ الکرسی

اَز اِفادات

مرتبہ:
محمد عمر حیات الحسینی

مِنہاجُ القرآن پبلیکیشنز
365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 042-111-140-140
یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 042-7237695
www.Minhaj.org - sales@Minhaj.org

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش
www.MinhajBooks.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	معارِفِ آیۃ الکرسی
اَز اِفادات	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
مرتبہ	:	محمد عمر حیات الحسینی، اَجمل علی مجددی
نظرِ ثانی	:	ڈاکٹر علی اَکبر الازہری
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّت رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعتِ اَوّل	:	ستمبر 2007ء
تعداد	:	1,100
قیمت پریمئر کاغذ	:	-/250 روپے

❁ ❁ ❁

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

sales@minhaj.org

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاج القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	معارِفِ آیۃ الکرسی
اَز اِفادات	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
مرتبہ	:	محمد عمر حیات الحسینی، اَجمل علی مجددی
نظرِ ثانی	:	ڈاکٹر علی اَکبر الازہری
زیرِ اہتمام	:	فریدِ ملّت رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعتِ اَوّل	:	ستمبر 2007ء
تعداد	:	1,100
قیمت VRG کاغذ	:	-/340 روپے

❁ ❁ ❁

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

sales@minhaj.org

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

فہرس

صفحہ	مشتملات
۲۳	پیش لفظ
۲۹	آیۃ الکرسی
۳۰	مفردات اور جملوں کی تشریح
۳۳	آیت الکرسی کے فضائل
۳۳	سورتوں کے فضائل کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ
۳۵	تعلیمِ نبوی ﷺ کا منہاج
۳۶	شیطان اور جن کا چوری کرنا
۳۹	فوائدِ حدیث
۵۰	آیت الکرسی کے فضائل کا خلاصہ
۵۱	لطائف
۵۲	آیت الکرسی کے جُملوں میں منطقی ربط
۵۶	آیت الکرسی اور اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ
۵۷	آیت الکرسی ربط بین الآیات کی روشنی میں

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
آیت الکرسی کے عارفانہ نکات	۶۰
قلب پاک ہو تو ہر اسم، اسمِ اعظم ہے	۶۰
اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ کا معنٰی	**۶۳**
لفظِ اللہ کے تفسیری معارف	۶۳
لفظِ اللہ جامع اور مانع شان کا حامل ہے	۶۵
نفی و اثبات کی حکمت	۶۵
اشتقاقی مادہ کے لحاظ سے لفظ اللہ کے معانی	۶۶
صفاتِ خداوندی اور کائناتی نظام	۶۹
ذاتِ واجب الوجود کو بادشاہوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا	۷۰
ایمان باللہ کا صحیح مفہوم	۷۲
قُربتِ خداوندی کا معنٰی	۷۴
اِلٰہ کا معنٰی	**۷۶**
ذاتِ واجب کا تصور انسانی فطرت کی آواز ہے	۷۷
صفاتِ خداوندی کے بارے میں گمراہ اقوام کی افراط و تفریط	۸۰
تشبیہ اور تعطیل کے مابین اعتدال کا راستہ	۸۱

مشتملات	صفحہ
آیت الکرسی میں توحید کا ایجابی اور سلبی پہلو	۸۲
اَلْحَيُّ کا معنی	۸۴
حیات کیا ہے؟	۸۴
حیات کی کُنہ کو سمجھنا ناممکن ہے	۸۷
مراتبِ حیات کیا ہیں؟	۸۸
مادہ پرستوں کے انکار کا جواب	۸۹
آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے والی ہے	۸۹
عُقلا کے لئے دعوتِ فکر	۹۱
زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے	۹۱
عذابِ قبر	۹۳
دو موتیں	۹۴
دو زندگیاں	۹۵
اللہ تعالیٰ ایک زندہ حقیقت ہے	۹۷
حمد و تسبیحِ الٰہی حصولِ صبر و توکل کا وسیلہ ہے	۹۸
حقیقی زندگی کا سرچشمہ ذاتِ واجب الوجود ہے	۹۹
ہر طرح کی زندگی کا اظہار الحيُّ کی صفت کا مرہونِ منت ہے	۱۰۳

مشتملات	صفحہ
طبیعی موت انسان کے محض جسم پر وارد ہوتی ہے	۱۰۴
سلسلۂ کائنات ہمیشہ رہنے والا نہیں	۱۰۸
اَلْقَیُّومُ کے معانی و مطالب	**۱۱۰**
اَلْقَیُّومُ کا پہلا معنٰی	۱۱۰
خُدا خاموش علت العلل نہیں ہے	۱۱۱
ہر شے لوازم حیات سے آراستہ ہے	۱۱۳
نظامِ کائنات قدرتِ خداوندی کی حکیمانہ تدبیر کا زندہ ثبوت ہے	۱۱۴
الحيّ القيّوم کے بلا عطف استعمال ہونے کی حکمت	۱۱۵
اَلْقَیُّومُ کا دوسرا معنٰی: ازلی وجود کا مالک	۱۱۶
وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جدید ذہنوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ	۱۱۶
اَلْقَیُّومُ کا تیسرا معنٰی	۱۱۸
یا حیّ یا قیّوم کا ورد ہر درد کی دواء ہے	۱۱۹
صفتِ قیوم اور مسئلہ جبر وقدر	۱۲۱
(الف) خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق	۱۲۴
کیا مخلوق ہونے کے لئے دیکھا جانا ضروری ہے؟	۱۲۷

صفحہ	مشتملات

جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے	۱۲۸
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۳۰
(ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ	۱۳۲
بین القدر و الجبر کا مفہوم	۱۳۳
۱۔ فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ	۱۳۳
۲۔ غور و خوض کا مرحلہ	۱۳۴
۳۔ انتخابِ نیت کا مرحلہ	۱۳۴
۴۔ عزّم و ارادے کا مرحلہ	۱۳۴
۵۔ تعمیل کا مرحلہ	۱۳۵
۶۔ نتیجۂ عمل کا مرحلہ	۱۳۵
اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل	۱۴۱
عدل کا مقامِ رفیع ۔۔۔۔ احسان	۱۴۳
اللہ تعالیٰ کی احسان پسندی	۱۴۵
اللہ تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا	۱۴۶
جزا و سزا اور نظامِ عدل	۱۴۷
جزا و سزا اور اتمامِ حجت	۱۴۸

مشتملات	صفحہ
اتمام حجت کا مفہوم	۱۵۱
اخلاقی جدوجہد	۱۵۲
حالتِ اضطرار اور قانونِ اسلامی	۱۵۴
سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد	۱۵۷
سلطنتِ اسلامیہ کا فرض	۱۵۷
سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ	۱۵۸
ایک صحابی کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب	۱۵۹
لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کا معنٰی	**۱۶۱**
اُونگھ اور نیند نہ آنے کی وجہ	۱۶۱
نیند مخلوق کی فطری ضرورت ہے	۱۶۲
دن اور رات کو اکٹھا بیان کرنے کی حکمت	۱۶۵
”سنة“ کو ”نوم“ سے مقدّم کیوں کیا؟	۱۶۶
لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کا معنٰی	**۱۶۷**
اللہ تعالیٰ کی ملکیت پر ایمان، فکر کو درست رکھنے میں گہرا اثر ڈالتا ہے	۱۶۸
لامِ اختصاص کی حکمت	۱۷۰
آیت الکرسی اور تصورِ ملکیت	۱۷۲

صفحہ	مشتملات

۱۷۲	انسانی ملکیت کی حدود
۱۷۴	حکومتِ خداوندی سے فرار ممکن نہیں
۱۷۵	کیا حاکمیت اور قیومیتِ خداوندی تکوینی قوانین کے ذریعے نافذ ہے؟
۱۷۸	مؤمن اور غیر مؤمن کا رویہ
۱۸۰	اسلامی تربیت کی اساس
۱۸۲	ملکیت اور تسخیرِ خداوندی
۱۸۹	تصورِ ملکیت
۱۹۱	۱۔ ملکیت کی لغوی تحقیق
۱۹۱	۲۔ مفہومِ ملکیت
۱۹۲	۳۔ ملکیت کی تعریف
۱۹۲	۴۔ مالک اور ملکیت میں افادیت کا پہلو
۱۹۵	۵۔ بالقوہ افادیت اور بالفعل افادیت
۱۹۶	۶۔ علّتِ ملکیت
۱۹۸	۷۔ حقِ انتفاع کی حقیقت
۲۰۱	۸۔ حقِ تملّک کی حقیقت
۲۰۱	(ا) حقِ تملک: قرآن مجید کی روشنی میں

مشتملات	صفحہ
(۲) حقِ تملّک : احادیث کی روشنی میں	۲۰۴
(۳) حقِ تملّک : فقہ اسلامی میں	۲۰۶
۹۔ انفرادی حقِ ملکیت	۲۰۶
۱۰۔ حقِ ملکیت کی صحت و مشروعیت کی شرائط	۲۰۷
۱۱۔ زائد از ضرورت مال کی شرعی حیثیت	۲۱۱
۱۲۔ حقِ تملّک اور حقِ انتفاع میں فرق	۲۱۳
۱۳۔ ارتکازِ دولت کی حیثیت	۲۲۳
تحدیدِ ملکیت	۲۲۵
تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والوں کے دلائل اور ان کا ردّ	۲۲۶
بحث کا ماحصل	۲۴۳
انسان اور کائنات	۲۴۳
اسلام کا تصوّرِ عبادت	۲۴۵
انسان کے عدمِ سکون اور اضطراب کی وجہ	۲۴۷
سعادت کا بنیادی رکن امن و امان کا قائم رہنا ہے	۲۴۹
مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ کا معنٰی	۲۵۲
شافع و مشفوع دونوں ملکیتِ خدا ہیں	۲۵۳

مشتملات	صفحہ
نفی و اثبات کی حکمت	۲۵۳
دنیاوی سفارش اور عقیدہ شفاعت کے مابین فرق	۲۵۴
شفاعت ارادۂ الٰہی کے منافی نہیں	۲۵۷
توبہ اور شفاعت	۲۵۷
دعا، اِستغفار اور عقیدۂ شفاعت	۲۵۸
مشرکین کا جذبہ اور اُس کا محرّک	۲۶۰
مشرکین کے شرک کا معیار	۲۶۱
باطل طرزِ فکر کی اصلاح	۲۶۲
ثبوتِ شرک کے لئے نفئ توحید کی بالصراحت ضرورت ہوتی ہے	۲۶۳
مبادیاتِ الٰہیات کو بغور سمجھنے کی ضرورت ہے	۲۶۴
تضاد کے تعیّن کا منہاج	۲۶۴
توحید اور شرک کے تعیّن کا منہاج	۲۶۵
توحید اور شرک میں بُعد المشرقین	۲۶۷
عبادت اور دُعا میں فرق	۲۶۸
قرآن حکیم میں لفظِ دُعا کے معانی	۲۷۲
ا۔ دُعا بمعنی دعوت	۲۷۲

www.MinhajBooks.com

صفحہ	مشتملات
۲۷۵	۲۔ دُعا بمعنی التجا
۲۷۸	۳۔ دُعا بمعنی عبادت
۲۸۱	مقربینِ بارگاہِ الٰہی کی شفاعت حق ہے
۲۸۳	آیت کا صحیح مفہوم
۲۸۴	آیات کا اصل منشاء یہ ہے کہ مشرکین غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں
۲۸۶	**مسئلہ شفاعت کی شرعی حیثیت**
۲۸۷	شفاعت اور تصورِ بخشش و مغفرت
۲۸۸	بخشش و مغفرت کا مرکز و محور ذات مصطفی ﷺ ہے
۲۸۸	صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کی روشنی میں بخشش و مغفرت کا تصور
۲۹۰	شفاعت اور دعا کا باہمی تعلق
۲۹۱	شفاعت پر بعض بے بنیاد اعتراضات کا بطلان
۲۹۳	شفاعت کے عدم جواز کے غلط استدلال کا بطلان
۲۹۵	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شفاعت طلبی
۲۹۸	شفاعت کا مادۂ اشتقاق اور اس کا مفہوم
۲۹۹	لفظ شفع کے اطلاقات
۳۰۰	مفہوم شفاعت

مشتملات	صفحہ
شفاعت کی اَقسام	۳۰۱
۱۔ شفاعت فی الدنیا	۳۰۱
۲۔ شفاعت فی الاخرۃ	۳۰۲
مقامِ محمود، مقامِ شفاعت ہے	۳۰۳
شفاعتِ کبریٰ اور نص قرآنی	۳۰۶
۱۔ قدرة الشافع على الشفاعة	۳۰۹
۲۔ اسلام المشفوع له	۳۱۱
نفیٔ شفاعت پر قرآنی آیات اور ان کا حقیقی مفہوم	۳۱۲
۱۔ کفار سے شفاعت کا نا مقبول ہونا	۳۱۲
قانون تعارض اور بعض مفسرین کی تصریحات	۳۱۳
۲۔ کفار سے روز قیامت دوستی اور شفاعت کی نفی	۳۱۵
۱۔ بیع کی نفی	۳۱۶
۲۔ دوستی کی نفی	۳۱۶
۳۔ شفاعت کی نفی	۳۱۶
۳۔ کفار کیلئے کوئی ولی و شفیع نہیں	۳۱۸
۴۔ مشرکین کی شفاعت کرنے والے ماذون نہیں	۳۱۹

مشتملات	صفحہ
۵۔ اللہ کو بھلا دینے والے، شفاعت سے محروم ہوں گے	۳۲۱
۶۔ کفار کی دنیا کو پلٹ جانے کی حسرت	۳۲۳
۷۔ مشرکین کی روز قیامت عدم شفعاء کی وجہ سے سخت نا اُمیدی	۳۲۴
۸۔ صداقتِ قرآن کے منکرین کی شفاعت سے محرومی	۳۲۶
۹۔ معبودان باطلہ سے نفئ شفاعت	۳۲۷
۱۰۔ ظالمین (کفار) کا کوئی شفیع نہ ہوگا	۳۲۸
۱۱۔ منکرین روز جزاء سے نفی شفاعت	۳۳۰
۳۔ الاذن للشافع	۳۳۳
شافعین ماذون ہیں	۳۳۴
شہادت بالحق کی وضاحت	۳۳۵
اذن شفاعت کے دو درجات	۳۳۷
۴۔ الرضا عن المشفوع لہٗ	۳۳۸
یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ کا معنیٰ	۳۴۰
علمِ الٰہی اور اذنِ شفاعت میں ربط	۳۴۰
مجسم شفیع ہدایت و مغفرت	۳۴۳
شفعاء کا اپنے اس مرتبہ کے لائق ہونا یقینی ہے	۳۴۳

مشتملات	صفحہ
علمِ الٰہی پر اعتقاد رکھنا صالح اعمال کی اساس ہے	۳۴۴
وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ کا معنٰی	۳۴۶
انسان اور دیگر مخلوقات کے علم میں فرق	۳۴۸
علیمٌ کے مختلف صفات کے ساتھ استعمال کی حکمت	۳۴۹
علمی ترقی اور علم الٰہی	۳۵۱
علم الٰہی اور انسانی ساخت	۳۵۳
علمِ الٰہی اور جدید علم نفسیات	۳۵۴
کیا خلوص نفسیاتی کیفیات کا نام ہے؟	۳۵۷
توحید فی العلم کا تصور	۳۵۸
شرک فی العلم	۳۶۰
علمِ الٰہی کی صفات	۳۶۰
عطائے الٰہی اور اِذنِ الٰہی شرک نہیں	۳۶۱
سب کو ملتا ہے فقط ان کی رضا کا صدقہ	۳۶۵
کارساز ذات کی بندہ نوازیاں	۳۶۶
شانِ رسالت اور مقامِ تکوین	۳۷۱

مشتملات	صفحہ
علمِ الٰہی کی وسعت کا قرآنی تصور	۳۷۳
شانِ خالقیت و مالکیت اور تصوّرِ علم	۳۷۳
اللہ تعالیٰ سے کوئی شے مخفی نہیں	۳۷۴
علمِ الٰہی کے وسیع و بسیط ہونے کا بیان	۳۷۶
اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے	۳۷۷
آیت الکرسی اور مسئلہ علمِ غیب	۳۸۰
”ھُم“ ضمیر کا مرجع کون؟	۳۸۱
ما بین ایدیھم و ما خلفھم کا مفہوم	۳۸۴
پہلا مفہوم	۳۸۴
دوسرا مفہوم	۳۸۶
تیسرا مفہوم	۳۸۶
چوتھا مفہوم	۳۸۸
پانچواں مفہوم	۳۸۹
چھٹا مفہوم	۳۹۰
احاطہ علم کی نفی اور مخلوق کا مرتبہ علم	۳۹۲
علم اور احاطہ علم میں فرق	۳۹۳

مشتملات	صفحہ
علمِ محیط خالق کی اور علمِ محاط بندے کی صفت ہے	۳۹۵
جزئی علمِ محاط	۳۹۹
کلی علمِ محاط	۴۰۰
علمہٖ کا مفہوم	**۴۰۳**
پہلا معنی: معلوماتِ الٰہیہ	۴۰۳
ذاتِ الٰہی معلوم نہیں علیم ہے	۴۰۶
علم اور معرفت میں فرق	۴۰۷
معلوماتِ الٰہیہ کا علم	۴۱۰
علمہٖ کا دوسرا معنی: علمِ غیب	۴۱۰
علمِ غیب عطائی کا جواز و ثبوت	۴۱۳
علمہٖ کا تیسرا معنی: علم بمعنی اسم مصدر	۴۱۴
صفاتِ الٰہیہ کی شانِ مظہریت	۴۱۵
ا۔ مظہرِ عزت	۴۱۶
اشتراکِ لفظی سے غلط فہمی کا ازالہ	۴۱۷
۲۔ مظہرِ قوت	۴۱۸
۳۔ مظہرِ خیر	۴۱۹

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
۴۔مظہرِ سمع و بصارت	۴۱۹
۵۔مظہرِ شہادت	۴۲۰
۶۔مظہرِ رافت و رحمت	۴۲۱
ہر گل میں ہر شجر میں اسی کا ظہور ہے	۴۲۲
شانِ ربوبیت کا مظہرِ اتم ...... ذاتِ مصطفیٰ ﷺ	۴۲۴
وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا معنٰی	**۴۲۷**
کرسی کا معنی و مفہوم	۴۳۳
خلاصۂ اقوال	۴۳۴
وَلَا يَؤُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ کا معنٰی	**۴۳۹**
نظامِ کائنات اور معرفتِ ربانی	۴۵۷
آیت الکرسی اور عقیدۂ توحید	**۴۶۰**
صفاتِ خداوندی سے ربط و تعلق کی اہمیت	۴۶۱
صفاتِ خداوندی کا اعمالِ انسانی پر اثر	۴۶۱
عقیدۂ توحید کے ثمرات و برکات	۴۷۰
عقیدۂ توحیدِ الٰہی کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت پر اثرات	۴۷۲

صفحہ	مشتملات
۴۷۷	توحید کا سچا جذبہ ہی مخلوق سے محبت کرنا سکھاتا ہے
۴۸۱	توحید کے مذاہب اور اقوامِ عالم پر اثرات و برکات
۴۸۲	توحید کا فکر و عمل پر اثر
۴۸۴	عقیدۂ توحید اور احساسِ یکتائی
۴۸۵	عقیدۂ توحید اور قربتِ خداوندی
۴۸۷	توکل کی اقسام
۴۸۸	عقیدۂ توحید سے سیرت و کردار اور اخلاق کے گوشے مہک اُٹھتے ہیں
۴۸۹	عقیدۂ توحید ذہنِ اِنسانی کو سائنسی اُسلوب کی بنیاد فراہم کرتا ہے
۴۹۱	عقیدۂ توحید علمی سے بڑھ کر اہم عملی حقیقت بھی ہے
۴۹۲	عقیدۂ توحید اِنسان کو متواضع بناتا ہے
۴۹۳	عقیدۂ توحید یقین و اُمید کا نور پیدا کرتا ہے
۴۹۴	عقیدۂ توحید، پابندِ قانون و اخلاق بناتا ہے
۴۹۵	عقیدۂ توحید اور اجتماعی زندگی
۴۹۶	عقیدۂ توحید امنِ عالم کی ضمانت فراہم کرتا ہے
۴۹۷	عقیدۂ توحید جرأت و شجاعت کا سرچشمہ ہے
۴۹۸	عقیدۂ توحید اور فکر و عمل کی یگانگت

مشتملات	صفحہ
عقیدۂ توحید انسانی مسائل کا حل	۴۹۸
عقیدۂ توحید اور فلسفہ اخلاق	۴۹۹
۞ مآخذ و مراجع	۵۰۹

www.MinhajBooks.com

پیش لفظ

قرآنِ حکیم انسانوں کی راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا وہ دستورِ حیات ہے جس کے قوانین وضوابط مکمل، ہمہ گیر، دائمی اور ابدی ہیں۔ اس صحیفۂ انقلاب کا نزول تاریخِ حیات کا عظیم الشان واقعہ ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ سرچشمۂ ہدایت ہے جس سے پوری کائنات ہمیشہ فیض یاب ہوتی رہے گی۔ یہ وہ روشنی ہے جو دلوں کو منور کرتی ہے اور ذہنوں کو روشن۔ یہ صحیفۂ ہدایت ونصیحت بھی ہے اور حکمت وبصیرت کا سرچشمہ بھی۔ اس کے نزول سے وہ تمام تاریکیاں چھٹ گئیں جنہوں نے انسانوں کو نورِ سعادت سے محروم کر رکھا تھا۔ قرآنِ حکیم کے نزول سے روشنی کا ایک تاریخ ساز عہد شروع ہوا۔ اس کے نزول سے بنی نوع انسان کو فکری پستیوں اور اخلاقی کمزوریوں سے نجات پانے کے لئے ایک نسخۂ شفاء دستیاب ہوا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں اس صحیفۂ ہدایت کی فضیلت کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس کے ادب و احترام اور اس کی تعظیم وتکریم کی پوری پوری تاکید فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقدیس وحُرمت کا اگر شعور نہ ہو تو اس کی برکات سے محرومی یقینی ہے۔ ایسے شخص کو نہ ہدایت نصیب ہوسکتی ہے نہ اللہ تعالیٰ کا عرفان نصیب ہو سکتا ہے، نہ مقامِ نبوت و رسالت کا صحیح ادراک ہوسکتا ہے، نہ زندگی کے اُصول اور قوانین اس کی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سرچشمۂ رُشد و ہدایت سے سیراب ہونے کے ساتھ اس کی تکریم کا بھی حکم دیا ہے۔ اس تکریم کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ اس کے باطنی احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو مُنزّل من اللہ سمجھا جائے اور اس سے متعلق ہر طرح کے شک اور وسوسے سے اپنے دل کو پاک رکھا جائے۔ یعنی اسے حرف بہ حرف، نقطہ بہ نقطہ وحی الٰہی سمجھا جائے اور اس نسبت کو ملحوظ رکھا جائے جو اُسے ربِ ذو الجلال سے ہے، جو عظمت و کبریائی اور تقدّس اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے

وہی صفات اس کے کلام میں بھی ہیں اور حق یہ ہے کہ جس طرح اللہ رب العزت ساری عظمتوں اور حکمتوں کا سر چشمہ ہے اِسی طرح اس کی نازل کی ہوئی یہ کتاب بھی اسی کی نسبت سے اپنے اندر پاکیزگی، تقدّس، حکمت اور عظمت رکھتی ہے۔ لٰہذا قرآنِ حکیم کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے کلام الملوک، ملوک الکلام کا شاہکار ہے۔ اس کی دوسری نسبت یہ ہے کہ یہ وہ صحیفۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضور نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا۔ جس کی روشنی میں حضور نبی اکرم ﷺ نے نوعِ انسانی کے لئے ایک ابدی اور عالم گیر نظامِ حیات عطا فرمایا۔

قرآنِ حکیم کی تعظیم و تکریم کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اسے ذوق و شوق سے پڑھا جائے اور سمجھا جائے۔ اسے صرف محرابوں، طاقوں اور الماریوں کی زینت بنا کر نہ رکھا جائے، بلکہ نہایت صحت، خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ اس کی تلاوت بھی کی جائے اور تدبّر سے بھی کام لیا جائے۔ مضامین کے لحاظ سے اپنے دل میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات کا بھی اندازہ کیا جائے۔ اگر ذکرِ عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت و خوش خبری پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر جہاد کے حکم سے حرارتِ ایمانی پیدا نہ ہو، اور اگر عظمت و کبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہوں تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہوگا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ میں روح اور قالب کا تعلق ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور رسولِ اکرم ﷺ اس کتاب کے معلّم ہیں۔ قرآن کلامِ الٰہی ہے اور آپ ﷺ اس کلامِ الٰہی کا مدّعا و مفہوم واضح کرنے والے مُبیّن ہیں۔ قرآنِ حکیم ایک دستور ہے اور آپ ﷺ اس دستور کی مستند اور معتبر تشریح و تفسیر کرنے والے اور شارع ہیں۔ آپ ﷺ کی یہ تمام حیثیات خود قرآن مجید نے متعین کر دی ہیں۔ یہی وہ منصبِ رسالت ہے جس میں اُمت کا کوئی فرد آپ ﷺ کا ہرگز شریک نہیں۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کے علاوہ اور دوسرا کوئی شخص صاحبِ وحی نہیں ہے۔

آپ ﷺ نے قرآن حکیم کے بارے میں جو تشریح و تعبیر اور تعلیم و تشریع فرمائی

اس میں کسی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ معصوم عن الخطاء ہیں اور آپ ﷺ کی تشریح و تعبیر بھی قرآنی حکم کی طرح واجب العمل ہے۔ گویا قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ ہدایت کے باب میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن اگر روح ہے تو آپ ﷺ اس کا قالب ہیں، قرآن اگر جان ہے تو حضور نبی اکرم ﷺ اس کا جسم ہیں۔ لہٰذا ہر طرح کی فکری، اعتقادی، جسمانی اور روحانی صحت و سلامتی کی ضمانت اس میں ہے کہ ہم قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے رہنمائی حاصل کریں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے قرآنی اسرار و احکام کی وضاحت فرمائی اور نفس کے اندر چھپی ہوئی برائیوں کو دور کر کے افراد کی تربیت کی، اخلاق و کردار کی تعمیر فرمائی۔

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جب تک اُمت قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کی روشنی سے اکتساب کرتی رہی دنیا اس کے آگے سرنگوں رہی، لیکن بدنصیبی سے اُمت نے قرآن و صاحبِ قرآن ﷺ کا دیا ہوا فکر و عمل کا مثالی نظام چھوڑ دیا۔ اعتقادی سطح پر یہ بگاڑ پیدا ہوا کہ قرآن کو صاحبِ قرآن ﷺ کی سنت کے بغیر سمجھنے کے لئے راہ ہموار کی گئی اور عملی سطح پر گراوٹ یہ ہوئی کہ قرآن کو صحیفۂ انقلاب اور صحیفۂ ہدایت قرار دے کر بحیثیت نظام رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے اسے محض برکت و ثواب کی کتاب قرار دے دیا گیا۔

اِن دونوں غلط فہمیوں کے ازالہ کے سلسلہ میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلّہ العالی کے کارہائے نمایاں تجدیدی شان کے حامل ہیں۔ آپ نے فکر و عمل کی صحت و سلامتی کا جو فکری ڈھانچہ تیار کیا ہے وہ اس امر کا غماز ہے کہ قرآن حکیم کا صحیح فہم صاحبِ قرآن ﷺ کی سنت اور ادب و تعظیم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اور اسی طرح قرآن کو صحیفۂ ہدایت و انقلاب قرار دیئے بغیر فرد و معاشرے کی مشکلات کا حل نہیں نکالا جا سکتا۔

قدرت نے آپ کو فہمِ قرآنی کا ایسا عدیم النظیر اور منفرد اندازِ بیان عطا کر رکھا ہے کہ جس آیت کو جتنی بار بھی موضوعِ سخن بنائیں ہر بار نئے حقائق و معارف کی دلکش لڑیاں بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ نے تحریکِ منہاج القرآن کی پوری عمارت کو جن پانچ

اساسی و بُنیادی ستونوں پر استوار کیا ہے اُن میں تعلق باللہ اور ربطِ رسالت کے بعد تیسرا اہم ستون رجوع الی القرآن ہے۔ آپ کے نزدیک رجوع الی القرآن کے پانچ تقاضے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم سے حُبّی و عشقی تعلق

۲۔ قرآنِ حکیم کی کثرت سے تلاوت

۳۔ قرآنِ حکیم کو تدبُّر و تفکر کے ساتھ پڑھا جائے

۴۔ قرآنی تعلیمات پر خود بھی عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اِس کی دعوت دی جائے۔

۵۔ قرآنی تعلیمات کو عام کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صَرف کی جائیں۔

زیرِ نظر کتاب - معارفِ آیۃ الکرسی - اِس امر کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ مذکورہ بالا تقاضوں کو اگر من میں اُتار کر قرآنِ کریم سے اکتساب و اخذِ فیض کیا جائے تو آیت الکرسی ہی ہمیں زندگی کے تمام شعبہ جات کے لئے مستقل رہنما اُصول فراہم کرتی ہے۔ بشرطیکہ تدبُّر و تفکر کرنے والا بھی بزمِ عشق و مستی کا پروردہ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ العالی ہو۔ زیرِ نظر کتاب آپ کے دروس و خطابات کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔

آیۃ الکرسی کو اَعظم الآیات کہا گیا ہے۔ اِس میں جن صفاتِ خداوندی کو بیان کیا گیا ہے اِن میں سے ہر ایک اِسلامی نظامِ حیات کے اساسی اُصولوں میں سے کسی ایک اُصول پر مشتمل ہے۔ اسلام کا اساسی اور بنیادی عقیدہ ’’عقیدۂ توحید‘‘ ہے اور یہ اسلامی نظامِ زندگی کی شہ رگ ہے، جب تک یہ اساس ٹھیک نہ ہو نظامِ زندگی کو سمجھا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس کے بغیر دیگر عقائدِ اسلامی کی صحیح تشریح ہو سکتی ہے اور نہ یہ نظامِ نفسِ انسانی کے مسلمہ حقائق سے ہم آہنگ ہوسکتا ہے اور نہ اس کی کوئی معقول اور پُر از یقین تعبیر کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا عقیدۂ توحید اِسلامی تصورات و عقائد کی اساس ہے جس سے اِسلامی نظامِ

زندگی اپنی مفصل صورت میں متشکل ہوتا ہے۔

آیۃ الکرسی میں ذات واجب الوجود کے بارے میں انسانی ضمیر کی تطہیر کی گئی ہے اور اِنسانی ضمیر جاہلیت کی تہہ در تہہ غلط افکار کے نیچے دبا ہوا تھا اور انسانی ذہن میں تصورِ الٰہ اپنی صاف و شفاف اور واضح شکل میں نہ تھا۔ یہ عقیدہ خرافات اور دیو مالائی عقائد میں لپٹا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے فلاسفر کے ہاں بھی تصورِ الٰہ واضح اور صاف نہ تھا۔ لہٰذا آیت الکرسی میں جہاں قدیم تصورات کی تصحیح کی گئی ہے وہاں عقیدہ توحید کے نام پر انبیاء و اولیاء کی تنقیص کا پہلو جو خود تراشیدہ ہے اس کی بھی خوب بیخ کُنی کی گئی ہے۔ اس میں مقامِ اُلوہیت اور مقامِ عبدیت کی اچھی طرح وضاحت کی گئی ہے، اُلوہیت اور عبدیت کے تمام تر تقاضوں اور حدود و شرائط کو تفصیلاً اُجاگر کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں وہ تمام باطل عقائد و نظریات واضح ہو جاتے ہیں جو عقیدۂ توحید کی آڑ میں پھیلائے گئے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلّہ العالی نے آیۃ الکرسی کے دروس میں حقیقتِ الٰہیہ اور حقیقتِ عبدیت کے درمیان التباس پیدا کرنے والے ہر ایک پہلو کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ صفاتِ خداوندی کے ضمن میں قدیم و جدید گمراہیوں کا جہاں ازالہ کیا ہے، وہاں عقیدۂ شفاعت اور عقیدۂ علم غیب کے بارے میں بھی پھیلائے گئے غلط عقائد کا محققانہ محاکمہ کیا ہے۔ آیۃ الکرسی پر یہ دروس عقیدہ و عمل کی اصلاح کا حسین سنگم ہیں۔ یہ حضرت شیخ الاسلام مدظلّہ العالی کے آیۃ الکرسی پر نہایت محققانہ دروس ہیں۔ عقیدہ و عمل کی تطہیر کا ہر ایک پہلو پُوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اِن میں آپ کی دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور مجتہدانہ طرزِ احساس کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کے دل نشین اُسلوبِ کلام، منطقی طرزِ استدلال اور جوشِ بیاں کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے آیۃ الکرسی کے دروس میں عقیدہ و عمل کے ہر پہلو پر نہایت متوازن بحث کی ہے اور ہر طرح کی افراط و تفریط کو بیان کر کے اسلام کی شاہراہِ مستقیم و متوازن کو واضح انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ آپ کے یہ دروس تفسیری ادب میں اپنے اُسلوبِ کلام، اندازِ بیان اور

اپنی صورتِ فکر کے لحاظ سے ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ مزید برآں آپ کا اندازِ بیان اتنا مسحورکُن ہے کہ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی کے ان علمی، عرفانی اور اعتقادی افکار سے معمور و لبریز دروس کو اَحقر خاکسار نے ضروری حشو و زوائد کے ساتھ مرتب کیا ہے، ترتیب و تدوین میں اِس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین، عنوانات اور عبارت میں تفسیری آہنگ موجود رہے۔ تاہم بعض نازک اور اہم مقامات پر ناکارہ مرتب نے کُتبِ تفاسیر و عقائد کی روشنی میں حتی المقدور وضاحت کی ہے۔ اس لئے اگر اس کاوش میں کوئی جھول اور کمی دیکھیں تو اس کی ذمہ داری عاجز خاکسار پر ہے۔ اغلاط مرتب ہی کی کوتاہی سمجھیں۔ اہلِ علم سے گذارش ہے کہ ہمیں ان سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ تصحیح کی جا سکے۔ نیز اَحقر خاکسار آپ کے تفسیری معارف پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے اِجتہادی تفرّدات، مجالسِ شیخ الاسلام اور حضرت فرید ملّتؒ کے علمی کارناموں پر بھی کام کر رہا ہے۔ قارئین کی مفید تجاویز کا اِنتظار رہے گا تاکہ مذکورہ تحقیقی اُمور میں رہنمائی حاصل کی جا سکے۔

اِن دروس کو مرتب و مدون کرنے میں ڈاکٹر علی اکبر قادری الازہری، ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر رحیق احمد عباسی، علامہ محمد فاروق رانا اور اجمل علی مجددی کی خصوصی معاونت بھی مختلف مراحل میں شامل رہی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بصدقۂ حضور نبی آخر الزماں ﷺ ہمیں قرآنی حقائق کو سمجھنے اور اِن پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین بجاہ سیّد المرسلین ﷺ)

محمد عمر حیات الحسینی

۲ اگست، ۲۰۰۷ء

آیۃ الکرسی

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا
نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِیْ
یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج
وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ج وَهُوَ
الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○(۱)

’’اللہ، کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے (سارے عالم کو اپنی تدبیر سے) قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اِسی کا ہے، کون ایسا شخص ہے جو اِس کے حضور اِس کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے، جو کچھ مخلوقات کے سامنے (ہو رہا ہے یا ہو چکا) ہے اور جو کچھ اِن کے بعد (ہونے والا) ہے (وہ) سب جانتا ہے اور وہ اُس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے اور اُس کی کرسی (سلطنت و حکومت) تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور اِس پر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) کی حفاظت ہرگز دشوار نہیں، وہی سب سے بلند رُتبہ بڑی عظمت والا ہے○‘‘

---

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۵۵

مفردات اور جملوں کی تشریح

اللّٰہ لا الٰہ الا ھو: اللہ ذات واجب الوجود کا اِسم ذاتی ہے۔ لا نفی جنس الٰہ معبود۔ اِلّا کلمہ استثناء ھو ضمیر واحد مذکر غائب یعنی اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر صرف وہ۔

الحيّ: حيّ اصل میں حیوٌ تھا۔ واوی ہو کر ی میں مدغم ہو گیا۔ یہ حیات سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں زندگی، الحيّ زندہ کامل حیات کا مالک جس پر کبھی فنا طاری نہ ہو سکے۔ کمالِ وجود یہ میں سب سے پہلا کمال حیات ہے۔ حيّ لغت میں اس زندہ شے کو کہتے ہیں جو واقف ہو، سنتا ہو، دیکھتا ہو اور قادر ہو۔ پس صفتِ حیات تمام صفاتِ کمال کا مبداء ہے۔

القیوم: قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے، القائم بذاتہٖ والمقوم لغیرہ، قیوم وہ جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہو بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب ہو۔

حيّ سے اللہ تعالیٰ کا واجب الوجود ہونا بیان کیا اور قیّوم سے اللہ تعالیٰ کا واہب الوجود ہونا بیان کیا۔ یقیناً وہ بذاتہ اور بنفسہٖ واجب الوجود ہے اور دوسروں کو حیات ہبہ اور عطا کرنے والا ہے۔ ممکن میں جو وجود بھی ہے وہ اُسی واجب الوجود کا ہبہ اور عطیہ ہے۔ پس صفتِ حیات کو ذکر کر کے کمالِ وجود کو بیان کیا اور صفتِ قیومت کو ذکر کر کے کمالِ ایجاد کو بیان فرمایا۔

لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم: لا تاخذہ، أخذ یأخذ أخذًا سے فعل نہی واحد مؤنث غائب۔ سنۃ اُونگھ اس کا مادہ ''وسن'' ہے یعنی غفلت اور خواب، نوم، نام ینام نوما سے ہے۔ نہ اُس پر اونگھ طاری ہوتی ہے اور نہ نیند وہ ہر وقت باخبر اور مستعد ہے۔ نیند کی ابتداء اور انتہاء دونوں کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ غفلت اور لاپرواہی کے اثرات سے پاک ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا تغیرات، حوادث اور

ممکنات کے خصائص سے پاک اور بری ہونا بیان کیا گیا ہے۔ یہ جملہ ’’الحي القیوم‘‘ کی تاکید ہے۔

له ما فی السموت وما فی الارض: لہٗ میں لامِ تملیک کے لئے ہے۔ لہٗ کے مقدم لانے سے حصر کے معنی پیدا ہوئے ہیں یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ ہے صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے کسی اور کا کوئی حق نہیں۔

من ذا الّذی یشفع عنده الّا باذنهٖ: من استفھامیه ذا اِسم اشارہ۔ الذی موصول، یشفع، شفع یشفع شفعا. صیغہ واحد مذکر غائب۔ ایک شے کو اُس جیسی دوسری چیز سے ملانا۔ شفاعت کے لئے اذنِ الٰہی کی قید ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کا حق حاصل نہیں۔ یہ بات اُس کے مختارِ مطلق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

یعلم ما بین أیدیهم وما خلفهم: علم، یعلم مضارع واحد مذکر غائب، ما موصولہ. بین ایدیهم. اُن کے ہاتھوں کے درمیان اُن کے سامنے وما خلفهم۔ خلفت پیچھے اور جو اُن کے پیچھے ہے۔ أیدیهم وخلفهم میں ضمیر جمع یا من ذا کے مدلول کی طرف ہے جس میں ملائکہ اور رُسل داخل ہیں یا فی السموات والارض کی جانب ہے اور ضمیر مذکر اِس لئے کہ اِس سے زمین و آسمان میں اہلِ عقول مراد ہیں یعنی جو کچھ اُن کے سامنے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے یعنی وہ تمام کائنات کے اوّل و آخر کا کامل علم رکھتا ہے۔

ولا یحیطون بشیءٍ من علمهٖ اِلّا بما شآء: لا یحیطون. اَحاطَ یحیط اِحاطةً فعل نہی جمع مذکر غائب۔ اِلّا کلمہ استثناء ہے۔ بما شآء جو کچھ وہ چاہے ما موصول ہے۔ شاءَ ماضی واحد مذکر غائب۔

وسع کرسیه السموت والارض: وسع (وسع یسع وسعاً) ماضی واحد

مذکر غائب۔ سماء کی جمع سَمٰوٰت، آسمانوں۔ والارض زمین مؤنث سماعی۔

و لا یودہٗ حفظھما: ولا یودہٗ (اٰد، یود اَوْدًا) واحد مذکر غائب اِس کا مادہ اَوْدٌ ہے۔ جس کے لغوی معنی جہد و مشقت کے ہیں۔ حِفظھما سے مراد اُن دونوں کی حفاظت یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر آسمانوں اور زمین کی دیکھ بھال گراں نہیں ہے۔ اس کو کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَھُوالعِلیُّ العَظِیم: یہ دونوں اِسمِ صفت ہیں۔ العلی کا مادہ عُلوُ ہے اور عظیم کا مادہ ع. ظ. م ہے۔

www.MinhajBooks.com

آیت الکرسی کے فضائل

مفسرین نے احادیث و روایات کی روشنی میں قرآنِ حکیم کی بعض آیات کے فضائل بیان کئے ہیں۔ قرآنی آیات میں آیت الکرسی کے فضائل جس کثرت سے منقول ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم کی کوئی اور آیت اِس معاملہ میں اِس کی مثل نہیں ہے۔

سورتوں کے فضائل کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

ایک آیت کا دوسری سورت یا آیت سے افضل و اعلیٰ ہونا اور عظیم تر ہونا کثرتِ اجر وثواب کی بناء پر ہوتا ہے۔ یہ علمی اُصول ذہن نشین کرلیا جائے کہ جب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سورۂ یٰسین قرآنِ حکیم کا دل ہے اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کا اجر وثواب قرآنِ حکیم کی دوتہائی تلاوت کے برابر ہے۔ سورۂ اخلاص کا ایک بار پڑھنا قرآنِ حکیم کے ایک تہائی حصہ کے اجر وثواب کے برابر ہے۔ یا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں سورت پورے قرآن حکیم میں افضل ہے یا فلاں آیت پورے قرآن حکیم کی آیتوں میں افضل و اعلیٰ ہے۔ اِن باہمی فضیلتوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) دوسری آیات یا سورتیں کم تر ہیں بلکہ اُس آیت یا سورہ کے خصوصی اجر وثواب کے لحاظ سے نمایاں فضیلت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت یا سورہ کثرتِ ثواب و اجر میں بہت بلند و بالا ہے۔ چنانچہ اب آیت الکرسی کے چند فضائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ امام ابن حبان اور امام نسائی حضرت ابی امامہؓ سے روایت کرتے ہیں:

مَن قرأ آية الكرسى دبر كل صلوٰة مكتوبة لم يمنعه من دخول الجنّة اِلاَّ أن يموت.(۱)

---

(۱) ۱۔ نسائي، السنن الكبرىٰ، ۶: ۳۰، رقم: ۹۹۲۸

۲۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۸: ۹۳، رقم: ۸۰۶۸

۳۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۲: ۴۵۸، رقم: ۲۳۹۵

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

’’جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اِسے جنت میں جانے سے موت کے سواء کوئی اور چیز روکنے والی نہیں۔‘‘

۲۔حضور نبی اکرم ﷺ کے فیض یافتہ عظیم صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَن اُبی بن کعبٍ قال: قال رسول الله ﷺ: یا أبا المنذرأَتدری أَیُّ ایةٍ من کتاب الله معک أعظم؟ قال: قلتُ: الله ورسوله أعلمُ. قال: یا أبا المنذِر، أتدری أَيُّ آیة من کتاب الله معک أعظمُ، قلتُ: الله لا إله إلّا هو الحيّ القیوم. قال: فضرب فی صدری وقال: والله لیهنک العلمُ یا أبا المنذر. (۱)

’’حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابو منذر! تم جانتے ہو کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ پھر حضور نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: تمہارے ساتھ کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے اُنہوں نے کہا۔ ’’الله لا إله إلّا هو الحیّ القیوم۔‘‘ حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں: اس کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: تمہیں یہ علم مبارک ہو۔‘‘

ابو منذر حضرت ابی بن کعب کی کنیت ہے۔ حضرت اُبی حضور نبی اکرم ﷺ کے اُن اُولو العزم صحابہ میں سے تھے جو قرآن حکیم کے سب سے زیادہ جاننے والے اور قرآن

(۱) ا۔ مسلم، الصحیح، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب فضل سورة الکهف وآیة الکرسی، ۱: ۵۵۶، رقم: ۸۱۰

۲۔ أبو داؤد، السنن، کتاب الصلاة، باب ما جاء في آیة الکرسی، ۲: ۷۲، رقم: ۱۴۶۰

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۱۴۱، رقم: ۲۱۳۱۵

حکیم کے بہت بڑے عالم تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں عظیم مفسر قرآن مشہور تھے۔

تعلیمِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منہاج

یہ سوال کرنا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقِ تعلیم میں سے ایک طریقہ ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو اور قرآن حکیم کو کتنا کچھ سمجھا ہے۔ بعض اوقات خاص خاص سوالات کیا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ طریقہ تھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوال پر اس اُمید میں کہ کچھ مزید معلومات حاصل ہوں، وہ اپنے علم کے مطابق جواب دینے کے بجائے یہ عرض کیا کرتے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زیادہ معلوم ہے۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ بات خود بتائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوال کرنے سے یہ ارادہ بھی ہوتا تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو مزید علم سکھائیں۔ پس صحابہ رضی اللہ عنہم کے یہ عرض کرنے پر کہ اللہ ورسولهٗ اعلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سوال کا خود جواب دے دیا کرتے تھے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ اُن کی معلومات کو ہی جاننے کا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سوال کو پھر دہراتے تھے تاکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی طرف سے جواب دیں۔ یہاں پر بھی یہی صورت پیش آئی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُبی رضی اللہ عنہ بن کعب سے پہلی دفعہ سوال کیا تو اُنھوں نے جواب میں عرض کیا کہ اللہ اور اُس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ مگر چونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش نظر یہ معلوم کرنا تھا کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے فہم میں قرآن حکیم کی سب سے زیادہ وزنی آیت کون سی ہے؟ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ وہی سوال کیا۔ اس پر اُنھوں نے عرض کیا کہ سب سے بڑی آیت آیت الکرسی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس جواب کی تائید فرمائی۔

آیت الکرسی کی یہ عظمت و اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ قرآن حکیم کی ان چند آیتوں میں سے ہے جن میں توحید کی مفصل تعلیمات بیان ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا جامع بیان ہوا ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ذہن نشین کرنے کے لیے آیا ہے۔ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور حاصل نہ ہو تو باقی ساری تعلیم بے معنی ہو جاتی

ہے۔ عقیدہ توحید آدمی کی سمجھ میں آجانے کا مطلب یہ ہے کہ دین کی بنیاد قائم ہوگئی۔ اس بناء پر قرآن حکیم کی سب سے بڑی آیت وہ ہے جس میں توحید کے مضمون کو بہترین طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: من قرأ فی دبر کل صلوۃ مکتوبہ آیۃ الکرسی حفظ الی الصلوۃ الاخر ولا یحافظ علیھا الا نبی أو صدیق أو شھید.(۱)

’’حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی کو پڑھا، اللہ تعالیٰ اس کو دوسری نماز تک اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور آیت الکرسی کی حفاظت صرف نبی، صدیق یا شہید ہی کرتا ہے۔‘‘

اس سے ثابت ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد آیت الکرسی کا پڑھنا نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کی سنت پر عمل کرنا ہے۔

شیطان اور جن کا چوری کرنا

۴. **عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: وَكَّلَنِي رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ فَأَتَانِي آتٍ فَجَعَلَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ وَقُلْتُ وَاللهِ لَأَرْفَعَنَّکَ إِلَى رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنِّي مُحْتَاجٌ وَعَلَيَّ عِيَالٌ وَلِي حَاجَةٌ شَدِيدَةٌ قَالَ فَخَلَّيْتُ عَنْهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ أَسِيرُکَ الْبَارِحَةَ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ شَكَا حَاجَةً**

(۱) بیهقي، شعب الایمان، ۲: ۴۵۹، رقم: ۲۳۹۲

شَدِيدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ أَمَا إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُودُ فَعَرَفْتُ أَنَّهُ سَيَعُودُ لِقَوْلِ رَسُولِ اللهِ ﷺ إِنَّهُ سَيَعُودُ فَرَصَدْتُهُ فَجَاءَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ فَقُلْتُ لَأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: دَعْنِي فَإِنِّي مُحْتَاجٌ وَعَلَيَّ عِيَالٌ لَا أَعُودُ فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ شَكَا حَاجَةً شَدِيدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ أَمَا إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُودُ فَرَصَدْتُهُ الثَّالِثَةَ فَجَاءَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ فَقُلْتُ لَأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رَسُولِ اللهِ وَهَذَا آخِرُ ثَلَاثِ مَرَّاتٍ أَنَّكَ تَزْعُمُ لَا تَعُودُ ثُمَّ تَعُودُ قَالَ دَعْنِي أُعَلِّمْكَ كَلِمَاتٍ يَنْفَعُكَ اللهُ بِهَا قُلْتُ مَا هُوَ قَالَ إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَهْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ ﴿اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ حَتَّى تَخْتِمَ الْآيَةَ فَإِنَّكَ لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرَبَنَّكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ الْبَارِحَةَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ زَعَمَ أَنَّهُ يُعَلِّمُنِي كَلِمَاتٍ يَنْفَعُنِي اللهُ بِهَا فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ مَا هِيَ قُلْتُ قَالَ لِي إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَهْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ مِنْ أَوَّلِهَا حَتَّى تَخْتِمَ الْآيَةَ ﴿اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ وَقَالَ لِي لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرَبَكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ وَكَانُوا أَحْرَصَ شَيْءٍ عَلَى الْخَيْرِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوبٌ تَعْلَمُ مَنْ تُخَاطِبُ مُنْذُ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَا أَبَا

هُرَيْرَةَ قَالَ لَا قَالَ ذَاكَ شَيْطَانٌ.(۱)

’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں رمضان المبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے صدقۂ فطر کی نگرانی کے لئے مجھے مقرر کیا۔ میرے پاس ایک آنے والا آیا اور غلہ کو سمیٹنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ کر کہا: میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا میں ایک غریب آدمی ہوں اور میرے ذمہ اہل و عیال ہیں اور میں بڑا ضرورتمند ہوں۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ترس کھا کر اسے چھوڑ دیا۔ صبح کے وقت حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میرے کچھ عرض کرنے سے پہلے حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ابو ہریرہ گذشتہ رات تمہارے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا: حضور اہل و عیال اور اپنی سخت محتاجی کی اس نے شکایت کی تو مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: سنو! اس نے تم سے غلط کہا ہے۔ پھر وہ جلد ہی آئے گا۔ یہ کہتے ہیں مجھے تو یقین ہو گیا کہ آپ ﷺ کے فرمانے کے باعث وہ ضرور آئے گا چنانچہ میں اِس کے انتظار میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ آیا اور غلہ اُٹھانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ کر کہا اب تو میں تمہیں حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔اس نے کہا: مجھے چھوڑ دیجئے میں ایک محتاج آدمی ہوں اور میرے ذمے اہل و عیال ہیں اب پھر میں نہیں آؤں گا۔ مجھے ترس آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا اور صبح کے وقت حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔حضور نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ابو ہریرہ! رات تمہارے قیدی نے کیا کیا۔ میں

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الوکالۃ، باب وکالۃ المرأۃ الإمام في النکاح، ۲: ۸۱۲، رقم: ۲۱۸۷

۲۔ ابن خزیمۃ، الصحیح، ۴: ۹۱، رقم: ۲۴۲۴

۳۔ نسائی، السنن الکبریٰ، ۶: ۲۳۸، رقم: ۱۰۷۹۵

نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس نے اہل و عیال اور شدید احتیاج کی شکایت کی پھر میں نے ترس کھا کر اِسے چھوڑ دیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: سنو! اِس نے تم سے غلط کہا ہے پھر وہ جلد ہی آ ئے گا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمانے کے باعث وہ ضرور آئے گا چنانچہ میں اِس کے انتظار ہی میں بیٹھا تھا کہ وہ آیا اور غلہ اُٹھانے لگا۔ میں نے اسے گرفتار کر کے کہا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔ یہ تیسری بار ہے کہ تم کہتے ہو کہ نہیں آؤ گے پھر آتے ہو۔ اس (شیطان) نے کہا میں آپ کو چند کلمے بتا دیتا ہوں جس کے ذریعہ آپ کو اللہ تعالیٰ فائدہ پہنچائے گا۔ جب آپ سونے کے لئے بستر پر جائیں تو آیت الکرسی ’’اللّٰہ لا الٰہ الّا ھو الحي القیوم‘‘ آخر آیت تک پڑھ لیں۔ ایسا کریں گے تو اللہ کی طرف سے مستقل آپ کے اوپر ایک محافظ رہے گا اور شیطان آپ کے قریب نہیں آئے گا اسی حال میں آپ کی صبح ہوگی۔ جب اس نے یہ وظیفہ بتایا تو میں نے پھر اسے چھوڑ دیا۔ صبح کو حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا: اس نے مجھے چند ایسے کلمات بتانے کو کہا جن سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع دے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: سنو! اس نے تم سے سچ کہا حالانکہ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ ابوہریرہ! تین راتوں سے جس سے تم ہم کلام ہو رہے ہو تم جانتے بھی ہو وہ کون ہے، میں نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا وہ شیطان ہے۔

www.MinhajBooks.com

فوائد حدیث

اس حدیث مبارکہ سے حسب ذیل نکات اور فوائد محدثین نے مستنبط کئے ہیں۔

زکوٰۃ رمضان سے مراد کھانے پینے کا وہ سامان، غلہ اور ایسی چیزیں ہیں جو حضور

نبی اکرم ﷺ رمضان کے زمانے میں تقسیم کی خاطر رکھتے تھے۔ دن کے وقت تقسیم سے جو بچ جاتا رات کو اس کی حفاظت کی ضرورت پیش آتی۔ ایک دفعہ جب ابو ہریرہؓ اس سامان کی حفاظت پر مقرر تھے تو یہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس طرح کے واقعات میں سے ہے جن کے بارے میں انسان کوئی توجیہ نہیں کرسکتا کہ ایسا کیونکر ہوا۔ بہرحال اس طرح کی صورتیں بعض اوقات انسانوں کے ساتھ پیش ضرور آتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہ مشکل پیش آئی۔ یہ حدیث فضائل القرآن کے باب میں اس وجہ سے نقل کی گئی ہے کہ شیطان خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اُس شخص پر اِس کا کوئی بس نہیں چلتا جو رات کو آیت الکرسی پڑھ کر سوتا ہے۔ قرآن حکیم میں چند مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی توحید کا مضمون جامع انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک مقام یہ آیت الکرسی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس آدمی کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا تصور رچ بس گیا ہو اس پر شیطان کا بس کہاں چل سکتا ہے۔ شیطان تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ آیت الکرسی کے کلمات بذاتِ خود بابرکت ہیں، لیکن اگر پڑھنے والا سمجھ بھی رہا ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ یہ نور علی نور والی بات ہے۔

۱۔ انسان شیطان کو دیکھ سکتا ہے ہاں اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ.(۱)

”بیشک وہ (خود) اور اس کا قبیلہ تمہیں (ایسی ایسی جگہوں سے) دیکھتا (رہتا) ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔“

۲۔ علامہ طیبی لکھتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے غیب کی خبر دی ہے اس لئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے کچھ بیان کرنے سے پہلے حضور نبی اکرم ﷺ نے پوچھا تمہارے قیدی نے کیا کیا اور یہ بھی فرمایا کہ وہ دوبارہ سہ بارہ آئے گا اور وہ دوسری، تیسری شب

(۱) الاعراف، ۷: ۲۷

بھی آیا۔[۱]

۳۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس سے کرامت وعظمت بھی ثابت ہوئی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور اطاعت کی برکت سے شیطان کو پکڑا اور اسے نامراد واپس کیا۔

۴۔ فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص سے بھی علم حاصل کرنا درست ہے جو اپنے کہے پر خود عمل نہ کرے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ علم حاصل کرنے والا حاصل کئے جانے والے علم کی بہتری سے واقف ہو۔ ایسا نہ ہو کہ علم کی اچھائی اور خرابی کا اعتبار نہ رکھتا ہو ورنہ اس صورت میں جائز نہ ہوگا۔[۲]

۵۔ سوتے وقت اگر کوئی آیت الکرسی پڑھ لے تو رات بھر اللہ تعالیٰ کا ایک نگہبان اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس سے شیطان قریب نہیں آسکتا۔ امام بیہقی کی روایت ہے کہ جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کے گھر اور اس کے پڑوسی کے گھر اور اس کے آس پاس کے اہل خانہ سب کو امن و عافیت دیتا ہے۔

عن أیوب الأنصاری رضی اللہ عنہ قال: کان لي نخل في سهوةٍ لی فجلعت أراه ینقص منه فذکرت ذلک للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: إنّک ستجد فیه غداً هرة فقل: أجیبی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلمّا کان الغد وجدت فیه هرة فقلت: أجیبی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتحولت عجوزاً وقالت: أذکرک الله لما ترکتنی فإنّي غیر عائدة فترکتها، فأتیت النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: ما فعل الرجل وأسیره؟ فأخبرته خبرها فقال کذبت هی عائدة فقل لها أجیبی رسول الله فتحولت عجوزاً فقالت: أذکرک الله یا أبا أیوب لما ترکتنی هذه المرة فإنّی غیر

(۱) ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۲: ۵۸۲
(۲) ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۲:۵۸۳

عائدة فترکتها، ثم أتيت رسول الله ﷺ فقال لی کما قال لی، فقلت ذلک ثلاث مرات فقالت لي في الثالثة: أذکرک الله يا أبا أيوب لما ترکتنی حتّی أعلمک شيئا لا يسمعه شيطان فيدخل ذلک البيت، فقلت: ما هو؟ فقالت: آية الکرسی، لا يسمعها شيطان إلّا ذهب، فذکرت ذلک للنبي ﷺ فقال: صدقت إن کانت کذوبا.(۱)

’’حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ان کی ایک پوٹلی تھی اس میں کھجوریں رکھی ہوئی تھیں جن آتے تھے اور اس سے کھجور لے جاتے تھے۔ انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے اس کی شکایت کی حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جاؤ جب تمہیں وہ نظر آئیں تو یہ کہنا۔ أجيبی رسول الله ’’تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔‘‘ چنانچہ انہوں نے جب یہ کلمات کہے ان کی برکت سے جن کو پکڑ لیا تو اس جن نے قسم کھائی کہ پھر وہ نہیں آئے گا۔ اُنہوں نے اسے چھوڑ دیا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: تمہارے قیدی کا کیا معاملہ رہا۔ اُنہوں نے کہا اس نے قسم کھائی کہ پھر نہیں آئے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس نے جھوٹ کہا وہ جھوٹ کا عادی ہے پھر اُنہوں نے دوبارہ گرفتار کیا، اس نے باز آنے کی قسم کھائی پھر اُنہوں نے چھوڑ دیا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے قیدی کا کیا ہوا انہوں نے کہا اس نے اس حرکت سے باز آنے کی قسم کھائی (اس لئے اسے چھوڑ دیا) حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس نے جھوٹ کہا، جھوٹ کا یہ عادی ہے پھر اُنہوں نے اسے گرفتار کر کے کہا اب میں تمہیں نہ چھوڑوں گا اور تمہیں

(۱) طبرانی، المعجم الکبير، ۴: ۱۶۲، رقم: ۴۰۱۲

حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لے کر جاؤں گا اس جن نے کہا میں تمہیں ایک چیز بتاتا ہوں یعنی آیت الکرسی تم اس کو اپنے گھر میں پڑھو شیطان و جن تمہارے قریب نہیں آئیں گے۔ یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی جناب میں حاضر ہوئے حضور نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا، تمہارے قیدی نے کیا کیا اُنہوں نے اس جن کی کہی ہوئی بات بتائی حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس نے سچ کہا حالانکہ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔''

یہ حدیث بھی گزشتہ حدیث کے مضمون پر واضح دال ہے اور اس سے یہ امر واضح ہوا کہ جنات ایک الگ مخلوق ہے اور ان کے شر سے بچنے کی انسان کو طاقت ودیعت ہوئی ہے۔ آیت الکرسی ہر طرح کے شر و فتنہ وفساد کے تدارک کے لئے اکسیرِ عظیم کا درجہ رکھتی ہے۔

۶۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے یہ قرآن کی آیتوں کی سردار ہے جس گھر میں یہ پڑھی جائے گی اگر اس میں شیطان ہے تو وہ یقیناً نکل بھاگے گا یہ آیت، آیت الکرسی ہے۔(۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کمزور نہیں بلکہ اسے شیطانی اور ابلیسی قوتوں پر غالب ہونے کی طاقت ودیعت ہوئی ہے۔ نفس اور شیطان کے سامنے ہتھیار ڈال کر یہ کہنا کہ میں کمزور ہوں یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی کمزوریوں اور باطنی بیماریوں کے تدارک کے لئے قرآن حکیم نازل فرمایا۔

۷۔ حضرت امام ابن ضریر نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

عن قتادة رضی اللہ عنہ قال: من قرأ آية الكرسى إذا أوى إلى فراشه و كّل به ملكين يحفظانه حتّى يصبح.(۲)

(۱) دارمی، السنن، کتاب فضائل القرآن، رقم: ۳۳۸۱

(۲) سیوطی، الدر المنثور، ۲: ۱۵

”حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص بستر پر لیٹ کر آیۃ الکرسی پڑھتا ہے صبح تک دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔“

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص رات کو آیت الکرسی پڑھ کر سوتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے صبح کی نماز کی ادائیگی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور وہ شیطانی حملوں سے محفوظ رہتا ہے۔

۸۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے:

عن أبی بن کعب رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: والّذي نفسي بيده إنّ لها لسانا وشفتين تقدس الملك عند ساق العرش.(۱)

”حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے آیت الکرسی کی ایک زبان اور دو ہونٹ ہیں وہ ساقِ عرش کے پاس مالکِ کائنات کی تسبیح و تقدیس کرتی ہے۔“

آیت الکرسی کی یہ حقیقت اور عظمت ہے کہ اس کا تلاوت کرنے والا مسلسل ذکر کی لذتوں سے سرشار رہتا ہے اور وہ شخص حفاظتِ خداوندی میں رہتا ہے۔

۹۔ حاکم کی روایت ہے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز، روزے اور صدقہ کے فضائل بیان کئے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے اوپر سب سے عظیم آیت کون سی نازل ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اللّٰہ لا الٰہ الّا ہو الحي القيوم“ اخیر تک پڑھی۔(۲)

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۱۴۲، رقم: ۲۱۳۱۵
۲۔ بیهقی، شعب الایمان، ۲: ۴۵۵، رقم: ۲۳۸۶

(۲) ۱۔ حاکم، المستدرك علی الصحیحین، ۱: ۵۶۱
۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱: ۲۱، رقم: ۵۴۱

۱۰۔ خطیب نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے جو شخص آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اس کی روح قبض فرماتا ہے۔(۱)

گویا آیت الکرسی کی کثرتِ تلاوت کے نتیجے میں وہ شخص اعزازاً یہ کمال و عزّت حاصل کرتا ہے۔

۱۱۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اس کی روح قبض فرماتا ہے اور وہ اس مجاہد کا درجہ پاتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کی جانب سے جہاد کیا ہو اور وہ اس میں شہید کیا گیا ہو۔(۲)

۱۲۔ **عن علي رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم على أعواد المنبر يقول: من قرأ آية الكرسى دبر كلّ صلاة لم يمنعه من دخول الجنّة إلّا الموت ومن قرأها حين يأخذ مضجعه أمنه الله على داره ودار جاره ودويرات حوله.**(۳)

”حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اسے جنت میں داخل ہونے سے صرف موت روکے رکھتی ہے اس کا انتقال ہوا نہیں کہ جنت میں داخل ہوا اور جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گھر اور اس کے پڑوسی کے گھر اور اس کے آس پاس کے گھروں کو امان دے دیتا ہے۔“

---

(۱) ۱۔ سعید بن منصور، السنن، رقم: ۴۲۱
۲۔ بیهقی، شعب الایمان، ۲: ۴۵۵
۳۔ سیوطی، الدر المنثور، ۱: ۳۲۳

(۲) ایضاً

(۳) ۱۔ بیهقی، شعب الایمان، ۲: ۴۵۸، رقم: ۲۳۹۵
۲۔ سیوطي، الدر المنثور، ۲: ۸

آیت الکرسی رحمانی حصار ہے۔ اہل اللہ قرآنی آیات کے دم سے اور ذکر سے جو بیماروں کے گرد حصار بناتے ہیں وہ اصلاً اس حدیث سے ثابت ہے۔ لہٰذا آیات و احادیث کے نورانی کلمات سے روحانی علاج کرنا شرعاً درست ہے۔ اسے ناجائز کہنا شرعا غلط ہے۔

۱۳۔عن علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ قال: ما أرى رجلا أدرك عقله في الإسلام يبيت حتّى يقرأ هذه الآية. ﴿الله لا إله إلّا هو الحيّ القيوم﴾ ولو تعلمون ما فيها لما تركتموها على حال أنّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: أعطيت آية الكرسي من كنز تحت العرش ولم يؤتها نبي قبلي قال علي: فما بت ليلة قط منذ سمعت هذا من رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حتّى أقرأها.(۱)

”حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: میں کسی پختہ عقل مسلمان شخص کو نہ دیکھوں گا کہ یہ آیت ”اللہ لا إله إلّا هو الحی القیوم“ پڑھے بغیر وہ سوئے اگر تم جان لو کہ اس میں کیا ہے تو اسے کسی حال میں نہ چھوڑو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آیت الکرسی عرش کے نیچے سے مجھے دی گئی اور مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو یہ نہ دی گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں جب سے میں نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کبھی کوئی ایسی شب نہ گذری جس میں میں نے آیت الکرسی نہ پڑھی ہو۔“

اس حدیث کے ہر راوی کا بیان ہے کہ جب سے یہ حدیث ہمیں پہنچی اس وقت سے اب تک ہم نے کسی بھی رات اس کا پڑھنا ترک نہ کیا۔

۱۴۔عن حسن بن علي رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: من قرأ آية

(۱) سیوطي، الدر المنثور، ۲: ۱۲

الكرسي في دبر الصلاة المكتوبة كان في ذمة الله إلى الصلاة الأخرى.(۱)

''حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا وہ دوسری نماز تک اللہ کے ذمہ اور حفاظت میں رہے گا۔''

۱۵۔ عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا أنّ رجلا أتى النّبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فشكا إليه أن ما في بيته ممحوق من البركة فقال: أين أنت من آية الكرسي ما تليت على طعام ولا أدامٍ إلّا أنمى الله بركة ذلك الطعام والأدام.(۲)

''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے ایک شخص حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے شکایت کی کہ اس کے گھر کی چیزوں میں کوئی برکت نہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم آیت الکرسی نہیں پڑھتے؟ جس کھانے اور سالن پر تم آیت الکرسی پڑھو گے اللہ تعالیٰ اس کھانے اور سالن میں برکت دے گا۔''

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ برکت ایک روحانی چیز ہے اور اس کا حصول قرآنی آیات و احادیث سے ثابت کلماتِ ادعیہ سے ہوتا ہے۔ اس کا انکار کرنا شرعاً غلط ہے۔

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۳: ۸۳، رقم: ۲۷۳۳
۲۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۲: ۲۹۹، رقم: ۲۴۶۹
۳۔ هيثمی، مجمع الزوائد، ۲: ۱۴۸
۴۔ سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۶
(۲) سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۶

۱۶۔ علامہ خازن لکھتے ہیں: آیت الکرسی کو قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہونے کا امتیاز اس لئے حاصل ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بنیادی اسماء و صفات کو حاوی ہے۔ مثلاً معبودیت، وحدانیت، حیات، علم، قیومیت، مالکیت، قدرت، ارادہ وغیرہ صفات اس میں پائی جاتی ہیں اور یہی اسماء وصفات میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ذکر کی جانے والی چیزوں میں اللہ تعالیٰ سب سے عظیم ہے اس لئے اس کی توحید کا ذکر بھی تمام ذکروں میں عظیم ترین ہوگا۔

۱۷۔ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: ما من سماء ولا أرض ولا سهل ولا جبل أعظم من آية الكرسي. (۱)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مخلوقات جنت و دوزخ، آسمان و زمین میں سے کوئی بھی سورۂ بقرہ کی آیت آیت الکرسی سے زیادہ عظمت کی حامل نہیں۔''

اسی طرح امام بیہقی نے ''الاسماء والصفات'' میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ان کا ارشاد ہے آسمان و زمین اور پہاڑ کوئی بھی آیت الکرسی سے عظمت میں بڑھا ہوا نہیں۔ (۲)

۱۸۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: من قرأ آية الكرسي في دبر كل صلاة مكتوبة أعطاه الله قلوب الشاكرين وأعمال الصديقين وثواب النبيّين وبسط عليه يمينه بالرّحمة ولم يمنعه من دخولِ الجنّةِ إلّا أن يموت فيدخلها. (۳)

(۱) سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۷
(۲) بيهقي، الأسماء والصفات، ۲: ۴
(۳) سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۶

’’حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ شکر گذار بندے کا دل، صدیقین کا عمل اور انبیاء کا ثواب عطا فرماتا ہے اور اس کے اوپر اپنا دست رحمت پھیلاتا ہے اور وہ انتقال کرتے ہی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔‘‘

۱۹۔ ابن اسحاق سے منقول ہے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں گئے تو اس میں شور سنا انہوں نے کہا یہ کیا، ایک جن نے جواب دیا: ہم قحط کا شکار ہو گئے ہیں اس لئے میں نے آپ کے پھل سے کچھ لینے کا ارادہ کیا ہے آپ اسے ہمارے لئے جائز کر دیجئے۔ انہوں نے کہا: ہاں میں نے تمہارے لئے جائز کر دیا۔ پھر زید بن ثابت نے فرمایا کیا تم ہمیں وہ نہ بتاؤ گے جس کے ذریعہ ہم تم سے بچ سکیں، اس نے کہا آیت الکرسی ہے اسے پڑھو تو کوئی جن و شیطان قریب نہیں آئے گا۔ (۱)

۲۰۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص کرب و اضطراب کے وقت آیت الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کی فریاد رسی فرمائے گا۔ (۲)

۲۱۔ أنّ رسول اللہ ﷺ قال: من قرأ آیة الکرسي في دبر کل صلاة لم یکن بینه وبین أن یدخل الجنّة إلّا أن یموت فإن مات دخل الجنّة. (۳)

’’امام بیہقی نے حضرت صلصال رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ

(۱) خازن، لباب التأویل في معاني التنزیل، ۱: ۳۹۴
(۲) خازن، لباب التأویل في معاني التنزیل، ۱: ۳۹۳
(۳) ۱۔ بیهقی، شعب الایمان، ۲: ۴۵۶، رقم: ۲۳۵
۲۔ سیوطی، الدر النثور، ۲: ۶

نے فرمایا: جو شخص ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اس کے اور جنت میں داخل ہونے کے درمیان موت کا فاصلہ ہوتا ہے جوں ہی وہ مرتا ہے جنت میں داخل ہوتا ہے۔‘‘

۲۲۔ عن ابن عمر عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه أنّه خرج ذات يوم إلی النّاس وهم سماطات فقال: أيّكم يخبرني بأعظم آية في القرآن فقال ابن مسعود رضی الله عنه: علی الخبير سقطت، سمعت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم يقول: أعظم آية في القرآن ﴿الله لا إله إلّا هو الحي القيوم﴾.(۱)

’’حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن لوگوں کے پاس آئے لوگ قطار میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: تم میں سے کوئی قرآن کی سب سے عظیم آیت مجھے بتائے گا؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ حقیقت کے جاننے والے کے پاس تشریف لائے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: قرآن کی سب سے عظیم آیت ’’الله لا إله إلّا هو الحي القيوم‘‘ ہے۔‘‘

حاکم کی ایک اور روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قرآن کی آیتوں کی سردار آیۃ الکرسی ہے۔

آیۃ الکرسی کے فضائل کا خلاصہ

ان روایات میں آیۃ الکرسی کو عظیم ترین آیت اور آیتوں کی سردار فرمایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کئی ایک ثبوتی اور سلبی صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس

(۱) ۱۔ ابن كثير، تفسير القرآن العظيم، ۱: ۳۰۸
۲۔ سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۷

کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے متعلق بتایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور اس کی ایسی زندگی ہے جس کے لئے موت وقضا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور وہ ایسا مستقل بالذات ہے کہ وہ سب سے بالکل بے نیاز ہے نہ اسے نیند آسکتی ہے نہ ہلکی سی اونگھ، پھر اس نے اپنی مطلق بادشاہی کی خبر دی کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور اسی کے زیر نگیں ہے اور کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس سفارش نہیں کرسکتا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کے علم نے گذشتہ اور آئندہ کے تمام امور کا احاطہ کر رکھا ہے اور مخلوق میں صرف وہی جان سکتے ہیں جن کے جاننے کی اس نے اجازت دے رکھی ہے اور یہ بھی بتایا کہ اس کی کرسی آسمان و زمین سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے۔ آسمان و زمین اس کی کرسی میں ایسے ہی ہیں جیسے کہ چھوٹی سی انگوٹھی وسیع صحرا میں ڈال دی گئی ہو اور یہ بھی بتایا کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر کی چیزوں کی حفاظت اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اور وہ ایسا بلند ہے جس کے لئے ساری بلندیاں ہیں۔ ذات کی بلندی ایسی کہ کسی مخلوق میں اس بلندی کے ایک ذرہ کا بھی تصور نہ کیا جا سکے اور صفات کی بلندی ایسی کہ کسی مخلوق میں ویسی صفت کے ادنیٰ سے ادنیٰ حصہ کا تخیل نہ کیا جا سکے اور قہر کی بلندی ایسی کہ وہ اپنے بندوں کے اوپر قاہر مطلق حقیقی اور قدر و شرف کی بلندی ایسی کہ وہ اپنے مجد و شرف میں کامل و اکمل اور اس سے بھی باخبر کیا کہ وہ ایسی عظمت والا جس کی عظمت کی کوئی حد نہیں۔

لطائف

آیت الکرسی سے چند فوائد مستنبط کیے گئے ہیں:

۱۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ سارا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ مگر اس کی آیات کی تاثیرات جُداگانہ ہیں۔ جیسے تمام انبیاء و اولیاء اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں مگر اُن کے مراتب مختلف ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے اُصولی اسماء و صفات یہ ہیں: وحدانیت، حیات، قیومیت، علم، ملک، قدرت اور ارادہ چونکہ آیت الکرسی میں ان سب کا ذکر موجود ہے اس لئے یہ آیت عظم اذکار ہے۔

۳۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے، بے چین دل کو چین آتا ہے۔ اس سے غصہ، شر اور حرام شہوات دور ہوتی ہیں اور دین و دنیا کی حفاظت ہوتی ہے۔ لہٰذا آیت الکرسی کو اخلاص کے ساتھ پڑھنے سے دین و دنیا کے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

آیت الکرسی کے جملوں میں منطقی ربط

آیت الکرسی کی یہ عظمت اظہر من الشّمس ہے کہ توحیدِ باری تعالیٰ کا بیان نہایت پُرشکوہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ توحید ہی دینِ اسلام کا اصل الاصول ہے۔

آیت الکرسی سے اللہ تعالیٰ کی شانِ احدیت وصمدیت کے پُرشکوہ اِثبات اور کسی کے کسی بھی اعتبار سے اِس کے ہم پلہ، ہم جنس اور ہم کفو ہونے کی ہمہ جہتی نفی سے شرک فی الذات کا کامل سدّ باب کر دیتی ہے۔ ذاتِ واجب الوجوب کی صفاتِ کاملہ کا بیان ایسے پُرجلال اور پُر ہیبت انداز میں ہوا ہے کہ ہر طرح کے شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ توحید فی الالوھیت اور شرک فی الالوھیت، توحید فی الربوبیت اور شرک فی الربوبیت، توحید فی الذات اور شرک فی الذات، توحید فی الخلق و الایجاد اور شرک فی الخلق و الایجاد، توحید فی العبادت اور شرک فی العبادت، توحید فی القدرت اور شرک فی القدرت، توحید فی الدعاء اور شرک فی الدعا، توحید فی العلم اور شرک فی العلم، توحید فی الاسماء والصفات اور شرک فی الاسماء والصفات، توحید فی الافعال اور شرک فی الافعال، توحید فی التحریم اور شرک فی التحریم، توحید فی النذور اور شرک فی النذور، توحید فی الحلف اور شرک فی الحلف، توحید فی

الاحکام اور شرک فی الاحکام جیسی اہم اور نازک مباحث کو آیت الکرسی کی روشنی میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

توحید اور شرک کے تعین کا واضح منہاج سمجھ میں آ جائے تو ہر طرح کے اعتقادی خلفشار کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہماری مطبوعہ کتاب ’’کتاب التوحید‘‘ کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ آیت مبارکہ دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے:

پہلا جملہ

’’اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ‘‘ غیر اللہ سے صفتِ اُلوہیت کی کامل نفی کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت باور کرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا معبودِ برحق، مطلوبِ اصلی اور محبوبِ حقیقی ہے۔ گویا یہ دعویٰ ہے اور آئندہ اس کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔

دوسرا جملہ

’’اَلْحَیُّ الْقَيُّوْمُ‘‘ اللہ تعالیٰ کے اُن دو عظیم اسماء پر مشتمل ہے کہ جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ’’اسمِ اعظم‘‘ کی حیثیت حاصل ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں زندہ جاوید اور از خود قائم و دائم ہے اور ما سوی اللہ کے لئے القیوم ہے۔ اس کا وجود ذاتی اور حیات بھی ذاتی ہے اور ما سوٰی اللہ کی ہر صفت خالص عطائی اور نری مستعار ہے۔ لہٰذا حقیقی اور مجازی کی تقسیم کے بغیر شرک کا صحیح تصور سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

تیسرا جملہ

’’لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ‘‘ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ حیات کے کامل کی وضاحت و تصریح کی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حیات ہر ضعف و احتیاج سے مستغنی ہے۔ لہٰذا اس طرف بلیغ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہونے کے علاوہ کامل بھی ہیں اور

مطلق بھی، اِس کے برعکس مخلوقات کی صفات وہبی، عطائی ہونے کے ساتھ ساتھ مقید اور حادث ہیں۔

چوتھا جملہ

''لَـهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ'' اللہ تعالیٰ کی شانِ قیومی کے لازمی منطقی نتیجے کی وضاحت وصراحت پر مشتمل ہے۔ یعنی جب جُملہ موجودات کا وُجود ہی اللہ تعالیٰ کی توجہ اور کرم کا مرہونِ منت ہے اور موجوداتِ عالم کے بقاء ومنہاج کا پورا دار و مدار ہی اس کی نگاہِ عنایت پر ہے تو لازمًا یہ سلسلہ کون و مکان کل کا کل اُسی خالق و مالک معبودِ حقیقی کی ملکیت ہے اور اُسے ہی اس میں کامل تصرف کا اختیار حاصل ہے۔

لہٰذا اس میں مالک الملک ہونے کا بیان بھی ہے اور ''الملک الحق'' ہونے کا اعلان بھی۔ علامہ اقبالؒ نے اِس کی تفسیر یوں بیان کی ہے۔

سروری زیبا فقط اِس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری

پانچواں جملہ

''مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ'' میں شفاعتِ باطلہ کا ردّ اور شفاعتِ صحیحہ کا اثبات کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ شفاعت ایک خالص عطائی اعزاز ہے یہ کسی کا استحقاقِ ذاتی نہیں ہے۔ لہٰذا باذنہ سے ثابت ہوا کہ ذاتی اور عطائی کی تقسیم منزل من اللہ ہے۔ یہ تقسیم خود تراشیدہ نہیں ہے بلکہ قرآن وسنت سے متحقق ہے، کیونکہ اس تقسیم کے بغیر شرک اور توحید کا واضح تصور سامنے نہیں آ سکتا اور اگر یہ تقسیم سمجھ میں آ جائے تو اعتقادی خلفشار کا سدّ باب بآسانی ہو جاتا ہے۔

چھٹا اور ساتواں جملہ

''يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ج وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ'' یہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کی شانِ اُلوہیت و قیومیت کے بیان اور اُس کی صفاتِ کاملہ میں سے وجودِ واجب، حیاتِ کاملہ، قُدرتِ مطلقہ، ملکیتِ تام اور اختیارِ کلی کی بالواسطہ تصریح کے بعد ان جملوں میں خالق اور مخلوق کے علم کے تقابل سے واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی بھی ہے اور کامل بھی، ما بين أيديهم کو بھی محیط ہے اور ما خلفهم کو بھی۔ اس کے برعکس ما سوٰی اللہ کا علم مقید، محدود اور خالص عطائی اور وہبی ہے۔

چنانچہ اولیاء و انبیاء، ملائکہ ارواح اور جنات غرض کسی کے پاس اپنا ذاتی علم کوئی نہیں۔ ذاتی کی نفی ہے اور عطائی و وہبی کا اثبات ہے۔ پس ما سویٰ اللہ سے ذاتی کی نفی اور عطائی کا اثبات ہی اصلِ توحید ہے۔

آٹھواں اور نواں جملہ

''وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا يَؤُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا'' میں اللہ تعالیٰ کے غلبہ و اقتدار کی وسعت اور اُس کے قبضہ و اختیار کی ہمہ گیری کی ایک جھلک نہایت پُر جلال و پر ہیبت الفاظ میں دکھائی گئی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمینوں کی تمام وسعتیں اللہ تعالیٰ کے حیطۂ اقتدار میں ہیں اور پوری کائنات اُسی کے زیرِ نگیں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی ملک بے کراں کے حفظ و امان اور اِس سلطنت بے پایاں کے انتظام و انصرام سے ہرگز کسی درجے میں بھی عاجز وقاصر اور لاچار نہیں۔

www.MinhajBooks.com

دسواں جملہ

''وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ'' دو اسمائے حسنٰی پر مشتمل ہے یعنی وہ بلند و بالا بھی ہے اور بزرگ و برتر بھی اور صاحبِ عظمت وسطوت بھی ہے اور حاملِ شان وشوکت و بلندی بھی۔

آیت الکرسی میں ذاتِ واجب الوجود کی صفاتِ کاملہ میں سے قدرتِ مطلقہ اور اختیارِ کاملہ پر حد درجہ زور دینے کے ساتھ اہم صفات یعنی حیات اور علم کے حوالے سے یہ بنیادی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے وجود ہی کی طرح ذاتی بھی ہیں اور غیر محدود و لامتناہی بھی۔ جبکہ اس کے برعکس مخلوقات کی صفات ان کے عین وجود کی مانند خالص عطائی و وہبی بھی ہیں اور مقید و حادث بھی۔ گویا اللہ تعالیٰ کا وجود بھی حق اور صفات بھی حقیقی اور ہم سب کا وجود بھی محض وہمی اور صفات بھی نری اعتباری۔

الغرض آیت الکرسی اللہ تعالیٰ کے وجود، حیات، قدرت اور علم ایسی بنیادی صفات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی شانِ یکتائی کے بیان میں منفرد مقام کی حامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اسے قرآن کریم کی عظیم ترین آیت بھی قرار دیا اور تمام آیاتِ قرآنی کی سردار بھی۔

آیت الکرسی اور اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ

امام جلال الدین سیوطیؒ کے نزدیک جس قدر آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی مذکور ہیں، اِس قدر کسی دوسری آیت میں مذکور نہیں۔ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے سترہ اسماء گرامی مذکور ہوئے ہیں، بعض ظاہراً اور بعض اشارۃً و کنایۃً۔ جن کا بیان اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آیت الکرسی کے مضامین اللہ تعالیٰ کی معرفتِ علمی کے حصول کے لئے مینارۂ نور کا درجہ رکھتے ہیں۔

وہ سترہ اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ	۲۔ ھو	۳۔ الحيّ	۴۔ القیّوم
۵۔ لا تاخذوہ کی ضمیر	۶۔ لہٗ کی ضمیر	۷۔ عندہ کی ضمیر	۸۔ باذنہ کی ضمیر
۹۔ یعلم کی ضمیر	۱۰۔ علمہ کی ضمیر	۱۱۔ شاء کی ضمیر	۱۲۔ کرسیّہ کی ضمیر

۱۳۔ یوٗدہ کی ضمیر

۱۴۔ حفظھما کی ضمیر مستتر جو مصدر ''الحفظ'' کی فاعل ہے۔

۱۵۔ھو ۱۶۔ العليّ ۱۷۔ العظیم

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا اسماء اور صفات میں سے ہر اسم اور ہر صفت اِس امر پر دلالت کرتی ہے کہ تمام تعریفوں کی مستحق ذاتِ واجب الوجود ہے۔ وہی حق دارِ اُلوھیت ہے۔ وہی خالق و مالک ہے اور صرف وہی ''الٰہ'' کہلانے کا حق رکھتی ہے۔

وہ خود ہر کمال کی مالک ہے اور ہر کمال کا منبع و سرچشمہ بھی۔ ہر کمال اُسی سے شروع ہوتا ہے اور اُسی پر ختم ہوتا ہے۔ اِن صفات کے بیان کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اِنسان یہ جان سکے کہ باری تعالیٰ صرف خود ہی ''العلي، علیم اور عظیم نہیں بلکہ اپنی مخلوق کو بھی ہر ایک کے حسبِ حال اِن صفات کی خیرات سے نوازتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جن سے اُس کی علمی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے۔ اِس لحاظ سے آیت الکرسی معرفتِ الٰہی کا خزانہ بھی ہے اور اِس کے وصال و قرب کا راستہ بھی۔ نیز جس طرح آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے سترہ اسماء و صفات مذکور ہوئے ہیں اسی طرح ہر ایک صفتِ اُلوھیت کے مقابلے میں ایک صفتِ عبدیت ہے۔ اِس اعتبار سے صفاتِ عبدیت بھی تعداد میں سترہ بیان کی جا سکتی ہیں۔

آیت الکرسی ربط بین الآیات کی روشنی میں

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں کہ آیت الکرسی سورۂ بقرہ کا قلب ہے اور ''الحيّ القيوم'' بمنزلہ روح اور جان کے ہے اور باقی تمام آیات اعضاء اور جوارح کی مانند ہیں۔ لہٰذا سورۂ بقرہ کے تمام مطالب و مضامین اسی آیت کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ جس طرح اعضاء و جوارح جان کے شیون اور مظاہر ہوتے ہیں اسی طرح سورۂ بقرہ کی تمام آیات ''الحيّ القيوم'' کے شیون اور مظاہر ہیں۔ سورۂ بقرہ

دو سو چھیاسی آیات اور چالیس رکوع پر مشتمل ہے۔ کوئی ایسا رکوع نہیں کہ جس میں حیات اور قیومیت اور ہمیشہ کی زندگانی کا مضمون مذکور نہ ہو۔ گویا سورۂ بقرہ ''الحيّ القيوم'' ہی کی شرح اور حیات و قیومیت ہی کی وضاحت و توضیح ہے۔ ''ذالک الکتاب لا ریب فيه'' سے قرآن حکیم کا آبِ حیات ہونا بیان کیا گیا اور یہ حقیقت واضح کی گئی کہ ایمان اور تقویٰ ہی سے حیاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے اور کفر و نفاق سے دائمی ہلاکت و بربادی۔ پھر تیسرے رکوع میں افراد اِنسانی کی حیات کا ذکر کیا ''وکنتم امواتا فاحياکم'' اور زمین و آسمان کی پیدائش اور دنیا کی نعمتوں کی تخلیق کا ذکر کیا جو حیاتِ دُنیوی کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا جو انسان کی حیاتِ اُخروی اور قیامِ ابدی کا ذریعہ ہے۔ اس کے بعد حضرت آدم ل کی حیات،، منصبِ خلافت اور ملائکہ پر اُن کی فضیلت کا راز آشکار فرمایا۔ بعد ازاں بنی اسرائیل کی حیات اور اُن پر قدرتِ خداوندی کے ظاہری اور باطنی انعامات کا بیان ہوا، جو تقریباً اخیر پارے تک محیط ہے۔ بنی اسرائیل کی جہانوں پر فضیلت، من وسلویٰ کا نازل ہونا اور اُن کی ہدایت کے لئے تورات کا نازل ہونا اور اس قوم میں ہزاروں پیغمبروں کو ہدایت کے لئے مبعوث کیا جانا بیان کیا گیا۔ جب بنی اسرائیل کا قصہ تمام ہوا تو ایک دوسرے خاندان کی حیات کا ذکر کیا گیا یعنی حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام اور اُن کی اقامت اور بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر ہوا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کی جگہ اور کعبۃ اللہ کو آخری قبلہ بیان کیا۔ تحویلِ قبلہ کی تفصیلات بیان کر کے حقیقی حیات پر روشنی ڈالی گئی۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی حیات کے سربستہ رازوں کو منکشف کرنے کے بعد چند اقسامِ حیات کا ذکر کیا۔ شہادت فی سبیل اللہ، مصائب پر صبر کرنا، قصاص کو جاری کرنا، وصیت کو بغیر تغیر و تبدُّل کے جاری کرنا، روح کو زندہ رکھنے کے لئے روزہ رکھنا، دین کی بقاء کے لئے جہاد کرنا، شعائرِ ملتِ ابراہیمی کو زندہ اور قائم رکھنے کے لئے حج و عمرہ کرنا، مال و آبرو کی حیاتِ حقیقی قائم رکھنے کے لئے شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا، حقوقِ نکاح اور زوجیت کے زندہ اور قائم رکھنے کے لئے ایلاء، خلع، طلاق، عدّت، آدابِ مباشرت اور اُجرتِ رضاعت وغیرہ کی حدود کی پوری پوری رعایت رکھنا

تا کہ خاندانی نظام اور معاشرتی حیات سلامت رہے اور اس کی وحدت منتشر نہ ہو۔ اِن اقسامِ حیات کی تفصیلات کے ذکر کے بعد چند عجیب و غریب قصص بیان کئے گئے، جن میں اللہ ''الحيّ القيوم'' کی طرف سے بغیر ظاہری اسباب کے حیاتِ غیبیہ عطا ہونا بیان کیا گیا تا کہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی ''الحيّ القيوم'' نہیں، جو زندہ اور موجود ہے۔ وہ ربِ ذوالجلال کی دی ہوئی حیات سے قائم اور زندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو قصے اس کلمہ ''الحيّ القيوم'' سے پہلے ذکر کیے اور تین واقعات اِس مدعا کے اثبات کے لئے آیت الکرسی کے بعد ذکر فرمائے۔

پہلا واقعہ حیاتِ بنی اسرائیل کے اُس گروہ کا ذکر فرمایا جو وبا سے ڈر کر بھاگا اور پھر ایک اولوالعزم نبی کی دعا سے زندہ ہوا۔

دوسرا واقعہ طالوت اور جالوت اور تابوتِ سکینہ کا ذکر کیا جس سے اس خاندان کی گم شدہ حیاتِ جاوداں پھر واپس آ گئی۔ اس کے بعد آیت الکرسی کا ذکر کیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے مثل حیات، قیومیت، مالکیت، عظمت، ہیبت، قدرتِ کاملہ اور علمِ محیط کا ذکر فرمایا اور یہ واضح کر دیا کہ اِسلام سیدھا راستہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک مانا جائے، حق واضح ہے جس کا جی چاہے قبول کرے کسی پر زبردستی نہیں۔ اِس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حیات اور قیومیت کے اِثبات کے لئے تین واقعات کا ذکر فرمایا ہے کہ جس سے حیاتِ اُخروی کا نمونہ معلوم ہو اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ ''الحيّ القيوم'' ربِ ذوالجلال مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تا کہ لوگ قیامت کے دن پر شک نہ کریں۔ پھر اس کے بعد صدقات و خیرات کے احکام بیان کیے جو انسان کی دینی و دُنیوی زندگی کے قیام کا سبب ہیں اور سُود سے پاک معیشت کا بیان کیا اور واضح لفظوں میں سود کی ممانعت فرمائی کہ جو اِنسان کی دینی و دُنیوی حیات کی تباہی اور بربادی و ہلاکت کا باعث ہے۔ پھر اِس سورت کو ایمانیات، اعتقادیات اور دُعا و استغفار کے مضمون پر مکمل فرمایا۔ اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ ایمان، توبہ اور اِستغفار ہی سے بنجر و ویران اور مُردہ دلوں کو حیاتِ جاودانی

نصیب ہوتی ہے۔

الغرض سورۂ بقرہ اللہ تعالیٰ کے اِسم ''الحيّ القيوم'' کی شرح و تفصیل ہے اور آیت الکرسی سورۂ بقرہ کے لئے دل کی مانند ہے اور یہ اسم ''الحيّ القيوم'' بمنزلہ جان ہے اور باقی تمام آیات اعضاء و جوارح کی طرح ہیں۔

آیت الکرسی کے عارفانہ نکات

اسمِ جلالت ''اللہ'' اسمِ اعظم ہے اور دلوں کا چین ہے، ہر طرح کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج اس کے ورد کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اسی طرح ''الحيّ القيوم'' کو بھی اسمِ اعظم کہا گیا ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انہی دو اسموں سے تجلی فرماتا ہے تو بندہ پر ''الحي'' کی صفت کی تجلی سے اللہ رب العزت کے جمیع اسماء و صفات منکشف ہو جاتے ہیں اور بندہ اللہ تعالیٰ کی صفت ''القيوم'' کی تجلی سے جمیع مخلوقات کی فناء کا مشاہدہ کرتا ہے، کیونکہ تمام مخلوقات کا قیام ذاتی نہیں ہے۔ جملہ مخلوقات کا وجود وہمی اور اعتباری ہے۔ جب بندہ صرف ''الحي القيوم'' کو ہی دیکھتا ہے تو پھر ''الحي'' کے جلوہ سے جمیع اسماء کا حصول اور ''القيوم'' سے تمام مخلوقات کی نفی نصیب ہوتی ہے تو دوئی اٹھ جاتی ہے اور کثرت اور دوئی کے اٹھنے سے وحدت نصیب ہوتی ہے۔ اس طرح ''ياحي يا قيوم'' کا ورد کرنے سے بندہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔ حالتِ حضوری میں ہر اسم جس کا بھی ورد کیا جائے گا وہی اُس کے لئے اسمِ اعظم بن جائے گا۔

قلب پاک ہو تو ہر اسم، اسمِ اعظم ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ سے اسمِ اعظم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؒ نے فرمایا: اس کی کوئی حدود نہیں، ہاں یوں ہوسکتا ہے کہ اپنے دل کو وحدانیت کے لئے فارغ کر لیا جائے۔ پھر جس اسم کو یاد کرو گے وہی اسمِ اعظم ہو گا۔

دراصل حقیقتِ محمد یہ ہی اسمِ اعظم ہے، جسے حقیقتِ محمد یہ کی معرفت نصیب ہوگی اُسے علمِ اسمِ اعظم حاصل ہوگیا اور یہی اسم جامع الٰہی کی صورت ہے۔ کیونکہ اسی سے ہی تمام مخلوق کو فیض نصیب ہوتا ہے۔

''سنة ولا نوم'' کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر لازم ہے کہ وہ کثرتِ نیند کی عادت ترک کرے، اگرچہ اللہ رب العزت نے بندوں کو نیند کی اجازت بخشی ہے لیکن کثرت سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور غافل کو اللہ تعالیٰ محبوب نہیں بناتا۔

اہل اللہ پر وارداتِ ولایت کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب وہ رات کو دن بنا دیتے ہیں یعنی بکثرت بیداری کے باعث۔ اس لئے حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا:

اُٹھ فریدا سُتیا تو جھاڑو دے مسیت
تو سُتا رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات مقصود و مطلوب ہے۔ اس کی طرف سے آنا ہوا اور سب نے اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ہر ایک نے اپنے کیے کی جزا پانی ہے۔ وہ زندہ ہے، اس کی زندگی کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء۔ تمام مخلوقات کو صفات ربِ کائنات کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ ساری کائنات میں معطی مطلق ایک ہی ہے۔ اسی لیے نظامِ ربوبیت میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ خالقِ کائنات کا کام جاری تھا، جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس کا لازوال و بے مثل ہونا کائنات کے توازن و اعتدال سے اظہر من الشّمس ہے۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، اِسی کے لئے نہیں ہے کیونکہ اُسے کسی بھی چیز کی حاجت نہیں۔ جب سب کچھ اُسی مالک الملک کا ہے تو پھر سب کچھ مالکِ حقیقی اور معطی مطلق کی رضا کے مطابق ہی استعمال ہونا چاہیے، ورنہ ناشکری بھی ہو گی اور مالک الملک سے دوری بھی۔ شفاعت کی توفیق ربِ ذوالجلال کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور محبوبانِ بارگاہِ الٰہی ہی اس مقام اور شان کو پاتے ہیں۔ ان کا بولنا خواہشِ نفس

کے تابع نہیں ہوتا ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى○'' کے نُطق سے جو فیض یاب ہوتے ہیں وہی اس کے اذن سے سرفراز ہوتے ہیں کیونکہ شفاعتِ الٰہی اذنِ الٰہی سے تعلق رکھتی ہے، مخلوق کی ابتداء بھی اُس کے سامنے ہے اور انتہاء بھی۔ اس سے کچھ بھی پنہاں و مخفی نہیں ہے۔ اللہ رب العزّت کا علم کلی ہے جس قدر وہ عطا کرنا چاہے اُسی قدر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں بھی تکبر، غرور اور بڑائی کا دعویٰ ہوگا علمِ نافع نہیں ہوگا۔ علمِ نافع کی علامت یہ ہے کہ وہ علمِ الٰہی کے تابع ہو اور الٰہی نظام کے تابع علم وہی ہوتا ہے جو اپنی بھی حفاظت کرے اور دوسروں کی بھی حفاظت و نگرانی کرے، کیونکہ علم کی حقیقت حفاظت ہے، بندگی کے دائرے میں حفاظت کا حق ادا کرنے کی ایک صورت ہے کہ ''**العلي العظيم**'' کی معیت حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ نے عالمین میں جو کچھ پیدا فرمایا ہے اس کی مثال اور نمونہ انسان میں ضرور بنایا ہے، لہٰذا عرش کی مثال عالمِ انسان میں اس کا قلب ہے، کیونکہ یہ محلِ استواء الروح ہے اور کرسی کی مثال سر الانسان ہے، لہٰذا ''**قلب المؤمن عرش الله**'' کہ مومن کا قلب عرشِ الٰہی ہے۔ اس لذت سے فیضیابی کے لئے ضروری ہے کہ آیت الکرسی کو وردِ زبان رکھا جائے۔ ظاہر و باطن کی حفاظت کے لئے آیت الکرسی کی تلاوت اکسیر ہے، وساوس، اوہام اور دل سے کدورتوں، نفرتوں، عداوتوں اور بُغض و کینہ کو نکالنے کے لئے اور باطل افکار کے سدّ باب کے لئے آیت الکرسی کی تلاوت نسخۂ شفاء ہے۔ اس لئے ظاہر و باطن کی پاکیزگی اور رعنائی خیال کے لئے اہل اللہ نے آیت الکرسی کو کثرت سے پڑھنا محبوب قرار دیا ہے۔

www.MinhajBooks.com

اَللّٰہُ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ کا معنٰی

"اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔"

لفظ اللہ کے تفسیری معارف

لفظ اللہ اِسم ذات کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد ذات واجب الوجود ہے ۔ لفظ اللہ کے علاوہ باقی جتنے بھی اسماء الحسنٰی ہیں اس ذات کی صفات ہیں۔ لفظ اللہ کو قرآن و حدیث میں بار بار ذات واجب الوجود کا ادراک کرانے کے لئے اِستعمال کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کے اندر یہ اِسم ذات ستائیس سو ایک (۲۷۰۱) مرتبہ آیا ہے۔ اِتنی کثرت سے کوئی دوسرا لفظ قرآن حکیم میں اِستعمال نہیں ہوا۔ کہیں یہ الف لام کے ساتھ بصورتِ معرفہ اور کہیں بغیر الف لام کے بصورتِ نکرہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام اُس کی مختلف صفات کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ اِن میں سے کوئی بھی ایسا اِسم نہیں ہے جو جمیع صفاتِ الوہیت کا احاطہ کر سکے ۔لفظ اللہ ایک ایسا نام ہے جس کی دلالت اُس واجب الوجود پر ہے جو جامع صفات و کمالات ہے۔ یہ ذاتِ حق کی کسی ایک یا چند صفات کی نہیں بلکہ بیک وقت ذات اور اُس کی تمام صفات کی نشاندہی کرتا ہے۔ صفات ایک اعتبار سے گویا ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔ جبکہ ذات اپنی کسی بھی صفت کا حصہ نہیں ہوتی ۔ ذات کے دامن میں اُس کی تمام صفات از خود موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے اسمِ ذات ہی جملہ صفات و کمالات کو پورے طور پر محیط ہوتا ہے۔ آیۃ الکرسی میں بھی صفات و افعال الٰہی کے بیان کا آغاز اِسم ذات سے ہوا ہے۔ قرآن حکیم نے ذاتِ باری تعالیٰ کا تعارف اِسی مقدس نام کے ذریعے کرایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ اپنی صفات و کمالات کا ذکر بھی اِسی نام سے شروع کیا ہے۔ آیۃ الکرسی کا یہ اندازِ بیان نہ صرف اس کے اِسم ذات ہونے پر بلکہ اِس کی اہمیت ،

جامعیت اور ہمہ گیریت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے نام کے طور پر وضع کیا گیا ہے اور بلاشرکت غیرے اِسی پر ہی دلالت کرتا ہے۔ جب ہم اِس لفظ کی شانِ علمیت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس ذات والا صفات کے بیان کے لئے واقعی اِس سے زیادہ موضوع لفظ کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔لفظ اللہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے امام خازنؒ لکھتے ہیں:

هو اِسم علم خاص لله تعالیٰ تفرد به الباری سبحانه وتعالیٰ ليس بمشتق ولا يشركه فيه أحد. (۱)

’’یہ اسم علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور باری تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتا ہے نہ یہ کسی سے مشتق ہے اور نہ اس میں کوئی اور شریک ہے۔‘‘

اس لفظ کا باری تعالیٰ کے اسم ذات کی حیثیت سے مستعمل ہونا کئی حکمتوں کی بناء پر ہے۔ ان میں سے ایک اس کی ترکیب لفظی میں پنہاں ہے۔ اگر اس لفظ سے کوئی حرف حذف بھی کر دیا جائے تب بھی بقیہ حروف ذاتِ باری تعالیٰ کی نشاندہی کے لئے اپنا معنی برقرار رکھتے ہیں۔ مثلاً اللہ کا پہلا حرف ’الف‘ حذف کر لیں تو ’للہ‘ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے ’اللہ کے لئے‘۔اگر دوسرا حرف ’لام‘ حذف کر لیں اور پہلا ’الف‘ بحال رکھیں تو ’الہٰ‘ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے ’معبود‘۔ اگر پہلے دونوں حروف ’الف‘ اور لام‘ حذف کر لیں تو ’لہٗ‘ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے ’اُس کے لئے‘ اور اگر پہلے تینوں حروف حذف کر لئے جائیں تو ’ہ‘ باقی رہ جائے گا جو پھر اس کی ذات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ’ہ‘ ’ہ‘ کے معنی میں بطور ضمیر اِستعمال ہوتا ہے اور صوفیاء بالعموم اس کا ذکر کرواتے ہیں گویا ’’اللہ‘‘ ایک ایسا لفظ ہے جو من حیث الکل بھی اور اپنے ہر حرف اور جزو کے اعتبار سے بھی ذات حق پر معنوی دلالت کرتا ہے۔ اس نام کی ترکیب لفظی کے حسن کا یہ عالم ہے کہ اس کا کوئی حرف یا کوئی حصہ بھی بے معنی نظر نہیں آتا۔ گویا یہ لفظ بھی ذاتِ باری تعالیٰ کی طرح ہر ہر

(۱) خازن، لباب التأويل في معاني التنزيل، ۱: ۱۳

اعتبار سے کامل ہے۔ کسی اسم کی اپنے مسمّیٰ پر اس سے زیادہ دلالت کا اور کیا تصور ہوسکتا ہے۔

لفظ اللہ جامع اور مانع شان کا حامل ہے

بعض محققین کے نزدیک لفظ ''اللہ'' اِسم علم غیر مشتق ہے جبکہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ اِسم مشتق ہے۔ اس لحاظ سے اِس کے متعدد مادے بیان کئے گئے ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک مشتق منہ معنوی طور پر ذات باری تعالیٰ کی مختلف شانوں اور حیثیتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ عام طور پر اہل علم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس لفظ کی اصل ''الٰہ'' ہے جس کا معنی ''معبود'' ہے۔ جو ''ال'' کے اضافے سے معرفہ ہوکر ''اللہ'' قرار پا گیا۔ ''لام تعریف'' کے بارے میں عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی اسم کو معرف باللام کر دیا جائے (یعنی اس کے آغاز میں ''ال'' کا اضافہ کر دیا جائے) تو وہ اِسم اپنے اِستعمال اور اطلاق میں خاص ہو جاتا ہے۔ مثلاً کتاب کا لفظ عام ہے۔ کسی بھی کتاب پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اگر اسے الکتاب کر دیا جائے تو اِس کا اطلاق صرف کسی مخصوص کتاب پر ہوگا۔ ہر ایک پر نہیں۔ اسی طرح الٰہ کو معروف کر کے اللہ بنانے میں یہی مصلحت تھی کہ الوہیت صرف ذات حق سے مختص تصور کی جائے اور پوری کائنات میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور ہستی الٰہ کہلانے کی مستحق نہ رہے۔ یہی مفہوم کلمہ توحید کے پہلے حصے کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔ اگر باری تعالیٰ کو صرف الٰہ کہہ کر ہی پکارا جاتا تو اس سے اس کی شان الوہیت اور شان معبودیت تو آشکار ہوتی لیکن معبودانِ باطلہ کی نفی نہ ہوسکتی۔ گویا صرف ''اثبات'' ہوتا، نفی کا بیان نہ ہوتا۔ اس طرح یہ اِسم جامع ضرور تصور کیا جاتا لیکن مانع نہ ہوتا اور اِسم باری تعالیٰ کی انفرادیت وموزونیت کے لئے ضروری تھا کہ وہ جامع بھی ہو اور مانع بھی۔

نفی و اثبات کی حکمت

چنانچہ اس حکیم وخبیر نے اپنی ذات کی دلالت کے لئے ایسے لفظ کو منتخب فرمایا جو

بیک وقت اِس کے لئے الوہیت کا اثبات اور اس کے ماسویٰ کے لئے الوہیت کی نفی کر رہا ہے، یہاں نفی و اثبات کا اجتماع اس پہلو کو بھی اُجاگر کر دیتا ہے کہ اِسلام صرف حق کے اثبات کا ہی نہیں بلکہ ہر باطل کی نفی کا بھی نام ہے اور یہی تصور دراصل اِسلام کے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے۔ لفظ اللہ کی اصل کے بارے میں امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

أصله اِئله فحذفت همزته وادخل عليها الالف واللام فخص بالباری تعالیٰ.(۱)

''اس کی اصل اِلٰہ ہے۔ جس کے ہمزہ 'ء' کو حذف کر دیا گیا اور اِس پر ال داخل کر کے اِسے ذاتِ باری کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔''

اِشتقاقی مادہ کے لحاظ سے لفظ اللہ کے معانی

لفظ اللہ کے بارے میں یہاں مختصراً ضروری اُمور بیان کئے جاتے ہیں۔

لفظ اللہ کا مادہ 'الہ' ہے یعنی ال ہ لہٰذا اس مادہ کے بنیادی معنی درج ذیل ہیں:

گھبرا کر اور پریشان ہو کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا پناہ دینا۔ متحیر ہونا اور ہر حوالے سے حیرت میں پڑ جانا۔ بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا۔ کسی کی غلامی اور محکومیت اختیار کرنا۔ اِن معانی کی رُو سے اللہ تعالیٰ سے مراد وہ بلند و بالا ہستی ہے جو اِنسانی نگاہوں سے پنہاں ہے۔ جس کی عظمتوں کے شعور و ادراک سے اِنسانی عقول متحیر رہ جاتے ہیں اور جس کا غلبہ و اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ اِس کو الٰہ تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اِس کی اطاعت اور بندگی اختیار کی جائے۔

لفظ اللہ اُس کا اِسم ذات ہے اور یہی اسم اعظم ہے اور تمام اسمائے ربانی کے لئے یہ اِسم جامع ہے۔ بعض کے نزدیک یہ 'الٰہ' سے مشتق نہیں ہے۔ اس حوالے سے دلیل

(۱) راغب اصفہانی، المفردات: ۸۲

www.MinhajBooks.com

یہ دی جاتی ہے کہ الہ تو غیر اللہ معبود پر بولا جاتا تھا۔ اِسلام اور اِس سے پہلے کبھی بھی یہ معبودانِ باطلہ پر نہیں بولا گیا اور نہ ''الالہ'' کا مخفف ہے۔ عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اللہ کا اسم موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق اس کی کتاب قرآن حکیم اور اُس کے رسول ﷺ کے ذریعے سے ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی کوئی اور صورت موجود نہیں ہے۔ اللہ کی اطاعت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ قرآن حکیم کے قوانین و احکام اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر اس کی دی ہوئی راہنمائی یعنی قرآن حکیم اور اُس کے رسول ﷺ ہی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستے پر چل کر فوز وفلاح حاصل کر سکتے ہیں۔ اس اللہ ہی کے حوالے سے الہ بھی ہے اور یہ ''لا الہ الا اللہ'' میں یہی معنی دیتا ہے کہ دنیا میں اُس کے رسول کے بغیر کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے، جس کی محکومیت اختیار کی جائے، یہ اختیار اور حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اطاعت و محکومیت صرف اُس کے قوانین ہی کی اختیار کی جائے گی اور یہی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے اور یہی دین کا اصل الاصول اور اِسلام کی اساس و بنیاد ہے۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر یوں بھی آیا ہے کہ 'اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے' اور پھر 'اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی الہ نہیں ہے' اس کے علاوہ یوں بھی ہے کہ 'اللہ کے سوا کسی کو الہ مت پکارو۔''

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بابرکات کو بڑی وضاحت کے ساتھ اور کئی حوالوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کے بارے میں میں بتایا گیا ہے کہ:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ.(۱)

''اُس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔''

دوسرے مقام پر بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو

(۱) الشوریٰ، ۴۲: ۱۱

انسانی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ارشادِ ربّانی ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُo[1]

’’نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور وہ بڑا باریک بین بڑا باخبر ہےo‘‘

انسانی آنکھ اُس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس کی مثل بھی کوئی نہیں، اس لئے ذات الٰہی کو کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اللہ احد ہے، صمد ہے، نہ وہ بذریعہ تولید وجود میں آیا ہے نہ کوئی اس سے بذریعہ تولید وجود میں آتا ہے، اس کی مثیل و نظیر کوئی نہیں۔ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وہ اپنی مخلوق کا ہر وقت علم رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو اکیلا ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَo[2]

’’فرما دیجئے: بس معبود تو وہی ایک ہی ہے اور میں ان (سب) چیزوں سے بیزار ہوں جنہیں تم (اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہوo‘‘

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ.[3]

’’جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے۔‘‘

(۱) الانعام، ۶: ۱۰۳
(۲) الأنعام، ۶: ۱۹
(۳) النساء، ۴: ۱۳۱

صفاتِ خداوندی اور کائناتی نظام

اللہ تعالیٰ وہ ہے جو زندہ ہے جسے موت نہیں۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ کی عبادت کو خالص کر کے اسی کو پکارو۔ ہر طرح کی تعریف اسی کو سزاوار ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ مزید ارشاد باری تعالیٰ یوں ہے کہ ”وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے، وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“ اللہ تعالیٰ وہ ذات پاک ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے جس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ یہ لاشریک نہ ہو تو شاید اس کی طاقت پر دشمن کی کوئی طاقت غالب آجائے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی خدائی معرضِ خطرہ میں رہے گی، اسی حوالے سے یہ فرمایا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وحدہٗ لاشریک ہونے کا بڑا ہی واضح مطلب ہے کہ وہ ایسا اللہ کامل ہے جس کی صفات اور خوبیاں اور کمالات ایسے اعلیٰ اور بلند ہیں کہ اگر موجودات میں سے بوجہ صفات کاملہ کے ایک خدا انتخاب کرنا چاہیں یا دل میں عمدہ سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ اللہ کی صفات فرض کریں تو وہ سب سے اعلیٰ جس سے بڑھ کر کوئی اور اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔ وہی اللہ ہے سب ادنیٰ و اعلیٰ اسی کی عبادت بلا شرکت غیرے کرتے ہیں بلکہ اس کی عبادت میں بھی کسی کو شریک ٹھہرانا ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ عالم الغیب ہے، یعنی اپنی ذات کو وہ خود آپ ہی جانتا ہے، اس کی ذات پر کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہم گویا آفتاب اور ماہتاب اور ہر ایک مخلوق کا سراپا دیکھ سکتے ہیں، مگر خدا کا سراپا دیکھنے سے قاصر ہیں۔ پھر اسی اللہ تعالیٰ کے بارے میں قرآن حکیم ہی میں فرمایا گیا ہے کہ وہ عالم الشہادۃ ہے، یعنی کوئی چیز اس کی نظر سے پردہ میں نہیں ہے۔ یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ کہلا کر پھر علم اشیاء سے غافل ہو۔ وہ اس عالم کے ذرہ ذرہ پر اپنی نظر رکھتا ہے لیکن انسان اس طرح سے نظر نہیں رکھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ کب اس نظام کو توڑ دے گا اور قیامت برپا کر دے گا اور اس کے سوا کوئی اور اِس کی اجازت کے بغیر نہیں جانتا کہ ایسا کب ہوگا؟ سو وہی اللہ تعالیٰ ہے جو ان تمام وقتوں کو مستقلاً جانتا ہے۔

وہ اللہ تعالیٰ جانداروں کے لئے محض اپنے لطف و کرم سے نہ کسی غرض سے اور نہ کسی کے عمل کی پاداش میں ان کے لیے سامان راحت میسر کرتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب اور زمین اور دوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجود اور ہمارے اعمال کے وجود سے پہلے ہی ہمارے لیے بنا رکھا گیا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نیک عملوں کی نیک تر جزا دیتا ہے اور کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور ہر ایک چیز کی جزا وہ اپنے ہاتھ میں اور اپنے اختیار میں رکھتا ہے، اس کا کوئی ایسا کار پرداز نہیں جس کو اس نے زمین اور آسمان کی حکومت سونپ دی ہو اور وہ خود الگ تھلگ ہو کر بیٹھا ہو اور آپ خود وہ کچھ نہ کرتا ہو وہی کار پرداز سب کچھ جزا سزا دیتا ہو یا آئندہ دینے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ ایک بے عیب بادشاہ ہے۔ اس پر کوئی داغ اور عیب نہیں۔

ذاتِ واجب الوجود کو بادشاہوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی انسانی بادشاہت عیب سے خالی نہیں ہوتی اور نہ عیب سے خالی ہو سکتی ہے۔ اگر تمام رعیت جلاوطن ہو کر دوسرے ملک کی طرف بھاگ جائے تو پھر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی یا اگر تمام رعیت قحط زدہ ہو جائے تو نظام سلطنت کس طرح چل سکے گا اور اگر رعایا کے لوگ اس سے بحث شروع کر دیں کہ تجھ میں اور ہم سے زیادہ کیا ہے، تو وہ کون سی اپنی لیاقت ثابت کرے۔ پس اللہ تعالیٰ کی بادشاہی ایسی نہیں ہے۔ وہ تو ایک دم میں تمام ملک کو فنا کر کے اور نئی مخلوقات پیدا کر سکتا ہے۔ اگر وہ اللہ ایسا خالق اور قادر نہ ہوتا تو پھر بجز ظلم کے اس کی بادشاہت چل نہ سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کو ایک مرتبہ معافی اور نجات دے کر پھر دوسری دنیا کہاں سے لاتا۔ کیا وہ نجات یافتہ لوگوں کو دنیا میں بھیجنے کے لئے پھر پکڑتا اور ظلم کی راہ سے اپنی معافی اور نجات دہی کو واپس لیتا، تو اس صورت میں اس کی خدائی میں فرق آتا اور دنیا کے بادشاہوں کی طرح ایک داغدار بادشاہ ہوتا۔ عام قانون شاہی میں یہ جائز ہے کہ ایک جہاز کو بچانے کے لئے دوسری کشتی کے سواروں کو تباہی میں ڈال دیا جائے اور انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو تو یہ اضطرار پیش نہیں آتا۔ بلکہ اُس کا قانون تو تمام قدرتوں کے ساتھ سچے انصاف پر چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ

معبودِ حقیقی ہے اس کی خدائی میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ یہ ساری خدائی پوری کی پوری بلاشرکت غیرے اس ذات کی ہے جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں بلکہ آپ اپنی حیات سے زندہ ہے۔" اسی اللہ کے بل بوتے پر کائنات کا یہ سارا نظام قائم ہے۔ اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی صفات میں اس کا شریک ہے نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حق میں۔" اللہ تعالیٰ کی حاکمیت غیر محدود ہے اور اسی طرح اللہ کے اختیارات بھی غیر محدود ہی ہیں۔" اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے نہ کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کے کام میں دخل دے سکتا ہے۔ جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ ذاتی علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جن یا فرشتے یا دوسری مخلوقات سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ نظام عالم تو رہا درکنار انسان تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوند عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں، جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔" قانون فطرت کے تحت اس کائنات یا ماورائے کائنات جو کچھ بھی واقع ہو رہا ہے یا ہوتا رہتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے۔ ہر طرح کا "قانون بنانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو نتائج اس قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں وہ سب حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے اذن و ارادہ کے تحت ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نشانیاں ہیں اور اس کی ان تمام نشانیوں سے بھی اظہار حق اور شعور و ادراک حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ساری نشانیاں انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ موجوداتِ عالم میں اللہ تعالیٰ صرف ایک ہے، باقی سب بندے ہیں۔ پھر جو شخص ان تمام

نشانیوں کے مقابلہ میں کسی حقیقی شہادت کسی علم، کسی مشاہدے اور کسی تجربے کے بغیر مجرد قیاس و گمان یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر دوسروں کو الوہیت کی صفات سے متصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔

ایمان باللہ کا صحیح مفہوم

اللہ تعالیٰ پر بندے کے صحیح ایمان کے معنی ہی یہی ہیں کہ ایک ایسی ذات کو مانا جائے کہ جس کے اندر وہ تمام صفات موجود ہوں کہ جن کا ذکر آیۃ الکرسی میں کیا گیا ہے۔ اور اس حوالے سے اگر بغور دیکھا جائے تو شروع سے اخیر تک پورا قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہی مشتمل ہے اور اِس کا بہترین شاہکار آیۃ الکرسی ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام عیبوں اور مصائب اور سختیوں سے محفوظ ہے بلکہ وہ تو سلامتی دینے والا ہے۔ اس کے معنی بھی ظاہر ہیں کہ اگر وہ آپ ہی مصیبتوں میں پڑتا تو وہ لوگوں کے ہاتھوں سے مارا جاتا اور اپنے ارادوں میں ناکام رہتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ باقی باطل معبودوں کے بارے میں بھی قرآن حکیم میں یوں ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ (۱)

”اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے سو اسے غور سے سنو: بیشک جن (بتوں) کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ ہرگز ایک مکھی (بھی) پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ وہ سب اس (کام) کے لئے جمع ہو جائیں، اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین کر لے جائے (تو) وہ اس چیز کو اس (مکھی) سے چھڑا (بھی) نہیں سکتے، کتنا بے بس ہے طالب (عابد) بھی اور مطلوب (معبود) بھی ۝“

(۱) الحج، ۲۲: ۷۳

اللہ تعالیٰ ایک عظیم تر ایک بزرگ تر اور وحدہ لاشریک ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان لاتعداد مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، ان مخلوقات میں انسان تو صرف انہی سے آگاہ ہے جو اس کے حواس خمسہ کے حوالے سے اس کے فہم و ادراک میں آتی ہیں، بہرصورت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی کوئی حد اور کوئی شمار نہیں ہے۔ لیکن واحد ایک اللہ ہی ان سب کا مالک، خالق اور رازق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی تمام مخلوقات پر تصرف کلی ہے اور اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اور سب پر محیط ہے۔ ہر طرح کے تمام اختیارات اور ہر طرح کا اقتدار محض اسی اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اختیارات و اقتدار کی کرسی بڑی وسیع اور ہر شے پر غالب اور محیط ہے کوئی شے اور کوئی مقام اور جگہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت اور اس کی دسترس سے باہر نہیں ہے، پھر اللہ تعالیٰ ہی اپنی مخلوقات میں سے جسے چاہتا ہے جو دے دیتا ہے اور جس سے چاہے جو چھین لیتا ہے، اپنے اس اقتدار و اختیار میں اسے کسی صلاح کار، مشیر یا نائب کی ضرورت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی قضا و قدر کا موجب، باعث اور قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر ایک کا ملجا و ماویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ دوربین سے کوئی بھی شے کہیں بھی مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے بلکہ کوئی بھی شے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خبرگیری کے بغیر نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ انسان کے کسی بھی حواس یا تمام حواس سے حسی طور پر ادراک وشعور میں آنے سے ماورا اور مبرا ہے، اسے دیکھا، چھوا، چکھا، سونگھا نہیں جا سکتا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اللہ بحوالہ قرآن حکیم ''ہم اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

فرمان الٰہی ہے:

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ۝ (۱)

''ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۝''

---

(۱) ق، ۵۰: ۱۶

قُربتِ خداوندی کا معنیٰ

اس قرابت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے دل سے اس کی وریدوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کی روح سے، اس کی حیات سے بھی زیادہ قریب ہے، اس کی نظر اس کی آنکھ سے اتنی قریب نہیں جتنا اللہ تعالیٰ اس کے قریب ہے، اس کا لعاب دہن اتنا قریب نہیں جتنا کہ حق تعالیٰ اس سے قریب ہے۔ خالق کی مخلوق کے ساتھ اس قدر زیادہ قربت کوئی یوں ہی بے معنیٰ نہیں ہے بلکہ اس قرابت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بندے کے اعمال کی حفاظت کی جائے، اس حوالے سے جہاں آسمان اور زمین وغیرہ کی پیدائش کا ذکر ہے تو اس میں انسان کی پیدائش اور اس کے ساتھ ہی اس کے اعمال کی حفاظت کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہے کہ ’’اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہر اِنسان کے لیے بصیرت ہے اور نصیحت ہے۔‘‘ گویا یہ رجوع سوجھانے اور یاد دلانے کے لئے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ہر مخلوق سے بخوبی باخبر اور واقف ہے۔ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ کو نہ صرف انسان کے اعمال کا ہی علم ہے بلکہ ان برے خیالات کا بھی علم ہوتا ہے جو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور برے خیالات کا ذکر بالخصوص اس لیے کیا کہ شریروں کی سزا کا بھی خصوصیت سے ذکر موجود ہے اور پھر یہ بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خالق فطرت انسانی ہے وہی اس کی اندرونی بیماریوں اور وساوس سے بھی باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ سب اسی پر بھروسہ کرتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنا ہی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا ہے اور وہی اپنے بندوں کی دعائیں سنتا اور انہیں قبولیت بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں پر ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ انسان کے شعور و ادراک کو جو یہ بصیرت اور غور و فکر کی روشنی میسر آتی ہے یہ ساری دراصل نورحق ہی سے ملتی ہے اور اسی نورحق ہی کی بدولت انسانی عقل، عقلی دلائل پیدا کرنے میں بہت قوی اور رشوخ ہو جاتی ہے اور نتیجتاً انسان غلطی کرنے سے بچ جاتا ہے۔ اس ظاہری اکتساب نور یا فیض نورحق

کے ساتھ ساتھ انسان روحانی طور پر بھی بدستور مستنیر ہوتا رہتا ہے۔ یوں وہ مادی دنیا کے ساتھ ساتھ روحانی دنیا میں بھی ہمہ وقت ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔اسی مادی اور روحانی ترقی کے حوالے سے ایک دعا کو قرآن حکیم نے یوں بیان کیا ہے

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ○[۱]

’’اور انہی میں سے ایسے بھی ہیں جو عرض کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی سے نواز اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ ○‘‘

الغرض مادی اور روحانی ترقی کا راز معرفتِ خداوندی میں پوشیدہ ہے اور معرفتِ خداوندی کا قرآنی اور ایمانی معیار حضور سرورِ کونین ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی اتباع میں ہے۔

(۱) البقرہ، ۲: ۲۰۱

www.MinhajBooks.com

اِلٰہ کا معنی

اِس کا معنی ہے ہر وہ ذات کہ جس کی پرستش کی جائے، چاہے وہ حق ہو یا باطل۔ اِس لئے قرآن حکیم میں یہ لفظ ''الٰہ'' باطل معبودوں کے لئے بھی اِستعمال ہوا ہے۔

لوگوں کے ہاں الٰہ (معبود) کی نسبت تین قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں:

(۱) الٰہ حقیقی (۲) الٰہ وضعی (۳) الٰہ نفسی

۱۔ الٰہ حقیقی وہی ہے جو معبودِ برحق اللہ تعالیٰ ہے۔

۲۔ الٰہ وضعی تمام باطل الٰہ جن کی پرستش باطل مذاہب میں بطور معبودان باطلہ کی جاتی ہے۔

۳۔ الٰہ نفسی اپنی خواہشِ نفس کو الٰہ بنا لینا۔

ارشادِ ربانی ہے:

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ.(۱)

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔''

حضور سرور کائنات ﷺ جب تشریف لائے تو مشرکین مکہ نے پتھر اور لکڑی کے سینکڑوں چھوٹے بڑے بتوں کو کعبۃ اللہ میں لٹکایا ہوا تھا اور اِن میں ہر بت ایک خاص قبیلے اور قوم کا ''الٰہ'' یعنی معبود تھا۔ مشرکین مکہ اِن بتوں کی عبادت کرتے اور اِن کے

---

(۱) الجاثیۃ، ۴۵: ۲۳

سامنے بندگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اِن جھوٹے اور خود ساختہ معبودانِ باطلہ کو ختم کر دیا جائے۔ اِس ناروا بندگی اور پرستش کو روک دیں اور عبادت وبندگی اُس معبودِ حقیقی سے مختص کر دیں جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ آپ ﷺ نے سعادت بخش اور نجات دینے والی دعوت کا آغاز کلمہ توحید کے اعلان کے ساتھ فرمایا اور برملا لوگوں سے کہا:

قولوا لا اله إلّا الله تفلحوا.(۱)

''کہہ دو اللہ کے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں تم کامیاب ہو جاؤ گے۔''

تمام خود ساختہ اور جھوٹے خداؤں کو دل سے نکال دو اور اپنی زُبان کو لا اِله الا الله محمد رسول الله کی صدائے حق سے آراستہ کرو اور دل سے اِس پر اعتقاد رکھو۔

یہ کلمہ ایمان اور اِسلام کی بنیاد کو درست کرتا ہے۔ اِس کلمہ پر دل سے ایمان لاتے ہی ایک کافر اور مشرک کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جو کافر و مومن اور مشرک و موحد کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے۔

ذاتِ واجب کا تصور انسانی فطرت کی آواز ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اعتراف فطرتِ انسانی کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ تاریخِ انسانی میں ہمیں کوئی ایسا دور نہیں ملتا جب اِنسان اس بالاتر ہستی کے تصور سے نا آشنا رہا ہو۔ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی تمام اِنسانوں میں یہ تصور اپنی فطری سادگی کے ساتھ موجود رہا۔ ہر دور کے انسان نے ہمیشہ اپنی تنہائیاں اسی اعلیٰ و بالا ہستی کے تصور سے آباد کیں۔ اِنسان نے اپنے دُکھوں اور تکلیفوں میں ہمیشہ اُسے پکارا۔

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۴۹۲، رقم: ۱۶۰۲۳

۲۔ طبراني، المعجم الكبير، ۵: ۶۱، رقم: ۴۵۸۲

۳۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۱۴: ۳۰۰، رقم: ۱۸۴۱۴

انسان کی اخلاقی و روحانی زندگی کا محور و مرکز ہمیشہ ذات واجب الوجود رہی۔ ذاتِ واجب الوجود کا تصوّر انسانی فطرت کی آواز ہے۔ انسان کے عقل و خرد کی دریافت نہیں۔ تاریخ اِنسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قدیم ترین اِنسانی بستیوں کے باشندوں کا بنیادی تصور توحیدِ الٰہ کا تصور تھا۔ آسٹریلیا اور جزائر کے وحشی قبائل اور صحرائے گوبی سے نکلنے والے وہ قبائل جو ہندی، یورپی اور آریاؤں کے نام سے پکارے گئے اور صحرائے عرب کے قبائل جنہیں سامی کہا گیا اِن تمام کا بنیادی اور اساسی تصورِ عقیدہ توحید تھا۔ بہرصورت ایک یگانہ ہستی کا اعتراف تمام نوعِ انسانی کی اصل میراث ہے۔ اعتقادی و فکری خلفشار کے اسباب بعد میں رفتہ رفتہ پیکرِ محسوس کی خوگر یہ اقوام اپنے راستے سے بھٹکنے لگیں اور ان کے اندر یہ فکری خلفشار پیدا ہوئی کہ ہم ہر اُس کو مانیں گے جو محسوس کیا جا سکے یا انہیں عقل کی گرفت میں لایا جا سکے۔ اس لئے انہوں نے پروردگار عالم کے لئے بھی پیکر محسوس تراشتے ہوئے کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہونا چاہیے جسے دیکھا، محسوس اور سمجھا جا سکے۔ اِسی نقطہ نظر سے شرک کی تمام آلودگیوں کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ نتیجتاً نوعِ انسانی کبھی اصنام پرستی کا شکار ہوئی، کبھی اوہام پرستی میں مبتلا ہوئی، کبھی اس نے مظاہرِ فطرت کی پوجا کی اور کبھی طاقت کی مسند پر بیٹھنے والوں کو مظاہرِ فطرت کے اوتار اور دیوتاؤں کی صورت میں قبول کیا۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا۔ انبیاء و رُسل عظام علیہم السلام نے اِن اعتقادی گمراہوں کی اصلاح کرتے ہوئے یہ حقیقت واشگاف کی کہ خالق و مالک کی معرفت ایک مشکل بات سہی مگر جن لوگوں کو تم علم و معرفت کے حوالے سے، اخلاق و کردار کی بلندی کے حوالے سے، خدمات کے حوالے سے، انکشاف اور اکتشاف کے حوالے سے اور ایجاد و اختراع کے حوالے سے عظمت و بلندی کا مینار سمجھتے ہو، غور و فکر کرو کہ اِن کو جاننے اور سمجھنے کا طریقہ کیا ہے؟ کیا کسی بڑے اور عظیم انسان کو دیکھنے سے اِس کی حقیقی عظمت و بلندی نظر آجاتی ہے؟ کیا کسی موجب اور باعث و سبب کو دیکھنے سے اِس کی قوتِ ایجاد و اختراع دکھائی دے دیتی ہے؟ کیا کسی معمار اور کاریگر کو دیکھنے سے اس کا وہ جوہر اور کاریگری جو پتھر کو آئینے کی شکل و صورت دیتا ہے نظر آجاتا

ہے؟ کیا اگر تمہارے سامنے بقراط، سقراط اور افلاطون کو لا کھڑا کر دیا جائے یا وہ سب مجسم شکل و صورت میں تمہارے سامنے آ جائیں اور تم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو کیا وہ جوہر اور کاریگری جس کی وجہ سے دنیا میں اُن کا نام مشہور ہے وہ تمہاری آنکھوں کے راستے سے تمہارے علم کا حصہ بن جائے گا؟ واضح سی بات ہے کہ وہ سارے لوگ اِنسانوں کی طرح انسان اور حقیقی عظمت اور معرفت کو کبھی نہ پاسکیں گے۔ کیونکہ ان کو جاننے، سمجھنے کا صحیح طریقہ انہیں دیکھنا نہیں بلکہ اِن کی صفات کو جاننا ہے۔ کاریگر اپنی کاری گری میں، معمار اپنی تعمیر میں، شاعر اپنی شاعری میں، ادیب اپنے ادب میں، فلسفی وحکیم اپنے فلسفہ و حکمت میں، مفکر و دانشور اپنی فکر و دانش میں اور خطیب اپنی خطابت میں نظر آتا ہے۔ یہ معرفت کا وہ صحیح طریقہ ہے جو حقیقی معرفت کا پتہ دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح تم اپنے خالق و مالک اور معبود حقیقی کی معرفت حاصل کرسکتے ہو۔

وہ خالق ہے اُسے صفتِ خلق میں دیکھو، وہ مالک ہے اُسے اُس کی ملک میں جانو، وہ رازق ہے اُسے رزق رسانی میں تلاش کرو، وہ رحیم ہے اُسے اُس کے رحم و کرم کے آئینے میں ڈھونڈو۔ اِس طرح تمہیں ہوا کا ایک جھونکا، پانی کی ایک بوند، روشنی کی ایک کرن، درخت کے پتے کی ایک ایک ڈالی اور پھولوں کی ایک ایک پنکھڑی یہاں تک کہ اِنسان کی اپنی ذات اللہ احکم الحاکمین کی خبر دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انبیائے کرام علیھم السلام کی تعلیم و ہدایت نے حواس اور خرد کی اِن پیدا کردہ غلطیوں اور گمراہیوں کا ازالہ کیا۔ انبیائے کرام علیھم السلام کی دعوت کا ایک بنیادی اُصول اور ضابطہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے معرفتِ ربانی کی تعلیم ویسے ہی اُسلوب اور آہنگ میں دی جیسے اُسلوب وشکل کے فہم وتحمل کی اِستعداد اُن کے مخاطبین میں پیدا ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ انسانوں کے معلم و مربی تھے اور معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے متعلمین میں جس درجے کی فہم واستعداد پائی جائے اُسی درجہ کا سبق بھی دے۔

الغرض انبیاء و رسل عظام علیھم السلام نے وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی صفات کے لئے جو

پیرایہ تعلیم اختیار کیا اُس کے ظاہری قالب کو حقیقت جاننے کی وجہ سے آگے چل کر بعض لوگوں نے گمراہیوں کی نئی نئی شکلیں اختیار کر لیں۔ چنانچہ یہی فہم و استعداد کا فرق ہے جو ہمیں معرفتِ ربانی کے حوالے سے مختلف ادوار کی گمراہیوں میں نظر آتا ہے کہ وہ ذاتِ واجب کی صفات کا جو مرقع تیار کرتے ہیں اِس سے بنیادی کردار اِن کی ذہنی استعداد اور احوال وظروف کا ہوتا ہے۔ صفاتِ خداوندی کا تصور جو معرفتِ ذات کی شاہ کلید ہے۔ بد نصیبی سے اس میں بھی نوع بہ نوع اور مختلف قسم کی گمراہیاں در آئی ہیں۔ بعض اقوام نے صفات کو حواس کے آئینے میں دیکھا تو ذاتِ واجب کو مجسم شکل وصورت دے کر اَصنام پرستی تک پہنچ گئیں۔ بعض قوموں نے اِن صفات کو مستقل جانا تو بے شمار دیوتا اور اوتار بنا دیئے گئے۔ مثلاً عیسائیوں کا اقانیمِ ثلاثہ کا قائل ہوجانا اور اِس کو اپنے اعتقادات کا محور و مرکز بنا لینا۔ یہودیوں کا تورات میں خالقِ کائنات کو مجسم شکل میں دکھانا۔ یہ تمام ضلالت و گمراہیوں کی مختلف کڑیاں ہیں۔ توحید اور شرک کی صورتِ حال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنسان نے معرفتِ الٰہی میں باوجود اس کے اعتقاد رکھنے کے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی وہ یہ تھی کہ ذاتِ واجب کو واسطۂ رسالت کے بغیر محض حواس کے ذریعے جاننا چاہا تو اللہ تعالی نے آخری کتاب قرآنِ حکیم میں واضح کر دیا کہ اُس کی صفات کے ذریعے معرفت حاصل کی جائے اور واسطۂ رسالت کے ذریعے ہی معرفت و قربتِ خداوندی کو حاصل کیا جائے۔

صفاتِ خداوندی کے بارے میں گمراہ اقوام کی افراط وتفریط

پھر فہم اِنسانی نے دوسری ٹھوکر یہ کھائی کہ اپنے فہم و استعداد کی نارسائی اور اثباتِ صفات میں غلو کے باعث ذاتِ واجب کے لئے پہلے تشبیہ اور پھر تجسیم کا سراپا تیار کر لیا تو قرآن حکیم نے اسے تنزیہ کا راستہ سکھایا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جن اقوام میں عقل وخرد اور فلسفیانہ علوم کا غلبہ ہوا انہوں نے تشبیہ سے بچنے کے لیے تنزیہ کا راستہ اختیار کیا مگر

چونکہ وحی الٰہی کو راہنما نہ بنایا نتیجتاً تعطیل کی وادی میں داخل ہو گئے۔

یہاں پر تنزیہ و تعطیل کا مفہوم ذہن نشین کر لینا از حد ضروری ہے۔ تنزیہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقلِ انسانی کے لئے ممکن ہے صفاتِ الٰہیہ کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک، اور بلند و بالا رکھا جائے۔ تعطیل کا مفہوم یہ ہے کہ تنزیہ کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصور کے لئے کوئی بات باقی نہ رہے۔

تشبیہ اور تعطیل کے مابین اعتدال کا راستہ

اب قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ جس طرح اثباتِ صفات میں غلو، تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح نفیٔ صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر تشبیہ انسان کو حقیقت سے نا آشنا کر دیتی ہے تو تعطل اُسے عقیدہ کی روح سے محروم کر دیتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے اپنے دامن کو محفوظ رکھ کر تشبیہ و تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے جو راہ اختیار کی وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے اور دونوں انتہاؤں کے میلان سے بچاتی ہوئی اعتدال عطا کرتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے ایک طرف تو تنزیہ کو اس کے کمال درجہ تک پہنچایا اور دوسری طرف تعطیل سے بھی بچا لیا۔ قرآن حکیم فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اِثبات کرتا ہے۔ گو ساتھ ہی مشابہت کی بھی کلیتاً نفی کرتا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسن و خوبی و کمال کی اُن تمام صفات سے جو انسانی ذہن و فکر میں آ سکتی ہیں متصف ہے۔

آیت الکرسی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ و شستہ تعبیرات ہیں انہیں بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً اللہ رب العزت کا ہاتھ تنگ نہیں:

بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ. (۱)

’’بلکہ (حق یہ ہے کہ) اس کے دونوں ہاتھ (جود وسخا کے لئے) کشادہ ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ (یعنی بندوں پر عطائیں) فرماتا ہے‘‘

یعنی اُس کے تحت حکومت و کبریائی کے احاطہ سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔

وسع کرسیّہ السموات والارض کے لفظوں سے صاف اور بے لچک باور کرایا گیا ہے کہ اس سے مشابہہ کوئی چیز نہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اُس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس کی پروردِگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس کا دیکھنا، سننا، جاننا ویسا نہیں ہوسکتا جس طرح کے دیکھنے، سننے اور جاننے کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ اس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال واحاطہ کا عرش ضرور ہے لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہوسکتا جو اِن الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہنوں میں متشکل و متصور ہونے لگتا ہے۔ قرآن حکیم میں ’’لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ‘‘ اور ’’لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ‘‘ اور ’’فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ‘‘۔ جیسی آیات میں یہی سمجھایا گیا ہے۔

آیت الکرسی میں توحید کا ایجابی اور سلبی پہلو

آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے سلبی پہلو میں دو فقرے اور ایجابی پہلو میں آٹھ جملے آئے ہیں۔

ایجابی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ یہ صفات ہیں، سلبی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ یہ صفات نہیں ہیں۔ کیونکہ فلاسفہ بزورِ عقل معرفتِ خداوندی میں تنزیہ کی راہ پر اتنے دور نکل گئے کہ آخر انہیں سوائے عدمِ محض کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اِن تنزیہات کا سلسلہ جہاں جا کر ختم ہوا وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں، یہ بھی نہیں۔ تاہم انسان موجود ہے۔

(۱) المائدۃ، ۵: ۶۴

الغرض آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے مثبت پہلو کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سلبی پہلو میں دو جملے اور ایجابی پہلو میں آٹھ جملے کہہ کر واضح کیا گیا ہے کہ صفات اللہ تعالیٰ کی شئون ہیں مگر ایسی نہیں کہ جن کا وہم و خیال اور ادراک کیا جا سکے۔ تنزیہ کے درجے میں اِتنی بات کافی ہے کہ اُس کی قیومیت پر کسی کمزوری کا داغ نہیں اور اُس کی شہنشاہیت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔

www.MinhajBooks.com

اَلْحَیُّ کا معنی

آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے لئے دوسری صفت ''حیات'' بیان کی گئی ہے۔ حیات سے ''حیّ'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام ''الحیّ'' اس لئے ہے کہ وہ لوازمِ حیات، علم، قدرت، سمع و بصر اور ارادہ و کلام والا ہے۔ وہ حیاتِ ذاتیہ کا مالک ہے، اُسی نے ان کمالات کا مظاہر عالمِ ظہور میں دکھلایا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ معبود حقیقی اور بندگی و پرستش کے لائق ہے جو زندہ اور حیّ ہے۔ اس کا مطلب ہے زندہ، سدا رہنے والا، مدام زندگی والا، سب کو سنبھالنے والا، باعث حیات، موجب زیست۔ اسی سے انسانی زندگی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے انسان کی موجودہ زندگی سلسلہ ارتقاء کی پہلی کڑی ہے۔ اس سطح پر اگر اس نے اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لی تو پھر یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی اگلی کڑی پر فائز ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

حیات کیا ہے؟

حقیقی حیات محض روح کے پائے جانے سے وجود میں نہیں آتی بلکہ ایسی صفت کے پائے جانے سے وجود میں آتی ہے جو احساس، علم، قدرت اور ارادہ کا باعث بنے۔ چنانچہ ائمہ لغت و تفسیر اس کی تصریحات یوں کرتے ہیں۔

۱۔ علامہ سید محمود احمد آلوسیؒ فرماتے ہیں:

هي ما يصح بوجوده الإحساس أو معنى زائد على العلم والقدرة يوجب للموصوف به حالا لم يكن قبله من صحة العلم والقدرة. (۱)

(۱) آلوسی، روح المعانی، ۲۹ : ۴

''جس صفت کے پائے جانے سے احساس کا وجود صحیح قرار پائے یا جس کا وجود علم وقدرت کے وجود پر زائد ہو اور وہ اپنے موصوف کے لئے صحت علم وقدرت کے ایسے حال کو واجب کر دے جو اس سے پہلے نہ ہو۔''

۲۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں:

ھی صفة تستتبع العلم والقدرة والإرادة وغیرھا من صفات الکمال.(۱)

''وہ ایسی صفت ہے جس کے ساتھ علم، قدرت ارادہ وغیرہ تمام صفاتِ کمالیہ وابستہ ہیں۔''

۳۔ علامہ نفسیؒ فرماتے ہیں:

ما یصح بوجوده الإحساس والموت ضده.(۲)

''حیات وہ صفت ہے جس کے پائے جانے سے احساس کا وجود صحیح قرار پائے اور موت اس کی ضد ہے۔''

۴۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:

الحیاة تستعمل علی اوجه الاول للقوة النامیة، الثاینة للقوة الحاسة.(۳)

''حیات کا استعمال کئی طرح سے ہے۔ اوّل قوت نامیہ (بڑھنے کی قوت) کے لئے، دوم قوت حاسہ کے لئے ہے۔''

---

(۱) قاضی ثناء اللہ، تفسیر المظہری، ۱: ۱۸

(۲) نسفی، مدارک التنزیل، ۴: ۲۶۳

(۳) راغب اصفہانی، المفردات: ۱۳۸

www.MinhajBooks.com

۵۔ امام جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں:

الحیوٰۃ وھی ما به الإحساس والموت ضدھا أو عدمھا. (۱)

’’حیات صفت ہے جس کے ساتھ احساس ہو موت اس کی ضد ہے یا اس کا عدم۔‘‘

۶۔ علامہ خازنؒ فرماتے ہیں:

ھي القوۃ الحاسة مع وجود الروح في الجسد وبه سمی الحیوان حیوانا. (۲)

’’حیات ایسی قوت حاسہ کو کہتے ہیں جو بدن میں روح کے پائے جانے کے ساتھ پائی جائے۔ اسی وجہ سے حیوان کو حیوان کہتے ہیں۔‘‘

۷۔ علامہ سید شریف جرجانیؒ فرماتے ہیں:

الحیاۃ ھي صفة توجب للموصوف بھا أن یعلم ویقدر. (۳)

’’حیات وہ صفت ہے جو موصوف کے لئے یہ لازم کرتی ہے کہ وہ علم اور قدرت رکھے۔‘‘

ان تمام تعریفات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوا کہ حیات ایسی صفت کا نام ہے جو احساس، علم، قدرت، ارادہ وغیرہ کا سبب ہو اور موت وہ حالت ہے جس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں۔

www.MinhajBooks.com

(۱) جلال الدین محلی، جلالین: ۵۶۳

(۲) خازن، لباب التأویل، ۷: ۱۰۳۔۱۰۴

(۳) شریف جرجانی، التعریفات: ۸۴

حیات کی کُنہ کو سمجھنا ناممکن ہے

زندگی کی کُنہ کو سمجھنا ناممکن ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ چند بے جان طبیعی عناصر اور معدنی نمکیات کو ایک مخصوص وزن اور خاص مقدار کے مطابق اِس کائنات کے خزائنِ طبیعی میں سے لے لیتا ہے اور پھر اپنے خاص قانونِ حیات کے مطابق انہیں زندہ موجودات میں تبدیل کر کے انہیں تحرّک حیات عطا کر دیتا ہے۔ انہیں طرح طرح کے اعمال و افعال بجا لانے کی صلاحیت اور قوت دے دیتا ہے۔ ایک زندہ وجود کے اندر اپنی خاص صورتوں اور شکلوں میں ہزاروں مرتبہ کیمیاوی عمل انجام پاتے ہیں اور مجموعی طور پر متابلیسم تیار کرتے رہتے ہیں۔

ان تمام کیمیاوی عوامل میں نہ صرف اعلیٰ درجے کی زمانی اور مکانی ہم آہنگی ہوتی ہے اور وہ اِس عمل میں باہم مربوط رہتے اور اجتماعی طور پر کام کرتے ہیں۔ بلکہ یہ سارا عمل ایسے منظّم طریقوں کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے کہ پورے زندہ جسم کی حفاظت اور تعمیر ہوتی رہتی ہے اور وہ اپنے کمال کی طرف بڑھنے کی ہدایت پاتا رہتا ہے۔ مسئلہ حیات اِس عالم طبیعی کے اہم ترین اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ مادی نقطہ نظر سے زندگی کی تحقیق کرنے والوں اور اُس کے طبیعی پہلو کا مشاہدہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ زندگی اُس توانائی کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک زندہ موجود غذا کھاتا ہے، ہضم کرتا ہے، جذب کرتا ہے اور خارج کرتا ہے اور خلیئے بناتا ہے۔ تاکہ ایک طرف سے اس کے اندر سے تحلیل ہونے والے حصے کا بدل بن سکے اور دوسری طرف سے اِس زندہ موجود کے رُشد اور ترقی کا باعث بنے۔ معنوی نقطہ نظر سے زندگی کی تعبیر کرتے ہوئے محققین نے کہا کہ حیات ایک ایسی واقعیت ہے کہ جو بھی موجود اُس کو پالیتا ہے وہ علم، ادراک اور قدرت کا حامل بن جاتا ہے۔ اِن دونوں تعریفات پر اللہ تعالیٰ کی حیات کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

آیت الکرسی نے اپنے آغاز میں اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور لائق پرستش ہونے میں تنہا اور واحد بتایا ہے، بایں معنی کہ اس ذات الٰہی کے علاوہ کوئی بھی بندگی اور

عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اس کے بعد اس معبودِ حقیقی کی صفات کمال یکے بعد دیگرے بیان کرنے شروع کی ہیں کہ جن میں سے اولین حیثیت حیات کو حاصل ہے کہ وہ ذات حیّ ہے۔ حیات کی مثال وجود کی سی ہے جس کا مفہوم واضح ہے، لیکن اس کی حقیقت نامعلوم ہے۔

مراتبِ حیات کیا ہیں؟

وجود کی طرح حیات بھی مختلف مراتب اور درجات رکھنے والی چیز ہے یعنی وہ غنی بالذات اور فقیر بالذات، واجب بالذات اور ممکن بالذات اور حیات ازلی و ابدی اور حیات حادث و فانی کے مدارج رکھتی ہے۔ گویا حیات کا اطلاق مختلف قوتوں پر ہوتا ہے، مثلاً قوتِ نامیہ، قوت حساسہ، قوتِ عاملہ عاقلہ وغیرہ۔ یہ ساری حیات کی قسمیں فانی ہیں اور ان کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہیں ہوسکتا۔ حیّ ایک ایسا کلمہ ہے جس کا اطلاق باری تعالیٰ کی حیات پر بھی ہوتا ہے، جبکہ اس کی حیات اس کی عین ذات اور اس کی ذات سے قائم ہے۔ اگرچہ خود ذات حق تعالیٰ ہی حیات و زندگی کی اصل و بنیاد اور حقیقت حیات ہے، تاہم اسی کلمہ حيّ کا اطلاق ممکنات ومخلوقات کی حیات پر بھی ہوتا ہے حالانکہ ان کی حیات ان کی ذات سے زائد، جداگانہ اور اس کی عارض ہونے والی حقیقت ہے اور ان کی حیات کا قیام اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، گویا حیّ کا اطلاق خالق ومخلوق ہر دو کی حیات پر ہوتا ہے۔ حیات و زندگی ایک حقیقی کمال ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات جو معبودِ حقیقی اور جمیع کمالات کی جامع ہے۔ اس کے لئے اس کمال حیات کا مالک ہونا از حد ضروری ہے۔ اگر بالفرض خداوند عالم کے لئے حیات ثابت اور متحقق نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے ممکنات جو صفت حیات سے متصف ہیں۔ وہ ہمارے خالق اور معبود برحق سے زیادہ کامل تر اور برتر ہو جائیں گے۔

مادہ پرستوں کے انکار کا جواب

زندگی ایک ایسی عجیب حقیقت ہے جو مادہ پرست لوگوں کے لئے ایک سنگین مشکل اور نا قابل توجہ شے بن کے رہ گئی ہے کیونکہ جب کسی بھی مادہ پرست فرد سے سوال کیا جائے کہ ایک مردہ اور بے شعور مادہ جو زندگی کے جوہر سے یکسر محروم تھا۔ اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ اس کے اندر زندگی پیدا ہو گئی؟ اس نے یہ عظیم نعمت کہاں سے اور کیسے حاصل کی ہے؟ تب وہ جواب میں چند ڈانواں ڈول باتیں پیش کر کے رہ جاتا ہے۔ وہ اس سوال کا کوئی قطعی اور معقول جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی اسے یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ ظہور زندگی کے واقعہ کو کسی علمی اور منطقی انداز میں واضح اور روشن کر سکے، لیکن اِسلام کا پیروکار اور خالق لم یزل ولا یزال کو اس عالم کائنات کی بنیاد و اساس ماننے والا اس سوال کے جواب میں بول اُٹھتا ہے کہ ہر موجود کو وجود عطا کرنے والا خدا ہی ہے جو خود زندہ اور حیّ ہے اور ہر زندہ کو زندگی بخشنے والا ہے۔ جس طرح اس نے تمام موجودات کو خلعت وجود سے آراستہ فرمایا ہے اسی طرح ان کے لئے حیات کا فیض بھی جاری فرمایا ہے۔ یہ زندہ کائنات ایک زندہ خدا ہی سے وجود میں آئی ہے لیکن ہم لوگ اتنے عاجز ہیں کہ اس حیات و زندگی کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں اور ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء پر زندگی کا فیضان کیسے جاری فرمایا ہے۔ تاہم ایک مسلمان اس منطق سے آفرینش کی وضاحت کرتے ہوئے زندگی کے بارے میں کیئے گئے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے والی ہے

اس سے پیشتر اشارہ ہوا کہ آیت الکرسی مشرکین کے خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے اور انہیں شرک در عبادت سے نجات دلانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اوّلین کلمہ جو عقل کے لئے غور کرنے کی بنیاد ہے، انہیں تفکر و تعقل پر مجبور کر دیتا ہے اور انہیں بت پرستی کی ذلت آمیز بندگی سے نجات بخشتا ہے وہ کلمہ ''حیّ'' ہے۔ آیت الکرسی اس کلمہ ''حیّ'' کے

ذریعے لوگوں کو یہ بات سمجھاتی ہے کہ وہ معبودِ حقیقی جو عبادت و پرستش کے لائق ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب حیات ہو۔ لہٰذا اے انسان! تو وہ ہے کہ جو اپنا راستہ گم کر بیٹھا ہے بت، آگ، سورج اور چاند جیسی بے جان اشیاء کی عبادت کرنے لگا ہے۔ اے اپنی بیش بہا شخصیت کو تباہ کرنے والے! ذرا ہوش میں آ بیدار ہو کچھ سوچ کہ اس جہان میں تنہا تو ہی ایسا زندہ موجود ہے جو کامل فیض یافتہ اور ان تمام نباتاتی یا حیوانی موجودات کی نسبت برتر اور کامل تر ہے۔ صرف تو ہی وہ زندہ اور عاقل موجود ہے کہ جس کو خداوند عالم نے آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا اور آزاد خلق فرمایا ہے۔ آیا عقل یہ اجازت دیتی ہے کہ ایک زندہ اور صاحب ادراک انسان جو اس جہان طبیعت میں شانِ کاملیت کی منازل طے کر چکا ہے اور اس کرۂ ارض کی اشرف ترین مخلوق ہے وہ پستی اور انحطاط کی راہ اپنائے! وہ اپنی عقل کو پیچھے چھوڑ دے، اس کی صدا پر کان نہ دھرے اور اپنی اس آزادی سے سوء استفادہ کرنے لگے جبکہ اس کے مقابل ایک جماداتی موجود جو عقل و حیات کی نعمت سے محروم ہے، بندگی کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے اور اس ذات کی عبودیت کا طوق اپنے ہاتھوں سے اپنی گردن میں ڈال لے۔ بڑی ہی افسوس ناک اور حیران و پریشان کرنے والی صورتِ حال ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جا بجا قرآن حکیم میں روشنی ڈالی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَo اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَo(۱)

”(ابراہیم علیہ السلام نے) فرمایا: کیا وہ تمہیں سنتے ہیں جب تم (ان کو) پکارتے ہو؟o یا وہ تمہیں نفع پہنچاتے ہیں یا نقصان پہنچاتے ہیں؟o“

(۱) الشعراء، ۲۶: ۷۲۔۷۳

عُقلا کے لئے دعوتِ فکر

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے شعور کو نئی زندگی بخشنے کے لئے اسی منطق سے استفادہ کیا اور ان بت پرست لوگوں سے فرمایا: جب تم ان بے جان بتوں کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری آواز سن لیتے ہیں! کیا یہ جماداتی موجودات اس اَمر پر قادر ہیں کہ زندگی کے قوانین پر اثر ڈالیں اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں!

بیشک اگر ایک بت پرست انسان اپنا اعمال نامہ عقل کی عدالت میں لے آئے اور اس قاضی خرد سے فیصلہ چاہے تو وہ قطعی طور پر اس کے اعمال نامے کو قابل مذمت قرار دے گا۔ منصف عقل اس کے احمقانہ عمل کو قبیح قرار دے گی اور اسے اس شرمناک بندگی اور بت پرستی کے نتیجے میں اس کی ذلت آمیز اسارت سے نجات دلانے کا حکم فرمائے گی اور حریت و آزادی کی طرف اس کی راہنمائی کرے گی۔ پس آیت الکرسی نے اپنے کلمہ (حیّ) کے ساتھ کہ جو معبود برحق کی ان صفات میں اوّلین صفت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ صفت بیان کر کے اس نے دیگر جمادی معبودوں کو اُلوہیت کی کرسی سے نیچے اُتار پھینکا ہے اور ہر عاقل اور زندہ انسان کو ان بناوٹی خداؤں کی پرستش سے آزاد فرما دیا ہے۔

زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے

پوری کائنات میں اسی الحي القيوم اللہ تعالیٰ ہی کا نظام کارفرما ہے اور اس کے سوا اس کائنات میں کوئی صاحب اقتدار نہیں ہے۔ ارشاد ہوا ”اللہ لا اله الا هو الحی القیوم“؛ ”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ حیّ ہمیشہ رہنے والا ہمیشہ قائم دائم ہے۔“ اس صفت سے یہ واضح ہوا کہ وہ معبودانِ باطلہ مثلاً بت، آگ، سورج اور چاند کی طرح جامد اور مردہ نہیں ہے۔ زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے۔ اِس جہانِ ہست و بُود کی تمام چیزیں وہ نباتات ہوں یا حیوانات وہ ابدی زندگی کے مالک

نہیں۔اس نظام کائنات میں ہر زندہ وجود عناصر کے باہمی تفاوت کے تحت اپنی ایک معین طبیعی زندگی لے کر آتا ہے۔ جونہی اُس کی زندگی کا دورانیہ مکمل ہوتا ہے، اُس کی طبیعی موت کا وقت آجاتا ہے اور اُس وقت وہ زندہ وجود مرجاتا ہے۔ زندہ وجود کے طبیعی عناصر اور اُس کے جسم کو تشکیل دینے والے تمام مواد کتابِ خلقت کے مقرر کردہ مخصوص نظام میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ مسلسل تبدیلی اور پے درپے تغیر و تبدل قانون موت و حیات کا نتیجہ ہےاور اِس کا خالق و مالک خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ جس کی صفت الحیّ ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ○[1]

”وُہی مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہےاور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہےاور زمین کو اس کی مُردنی کے بعد زندہ و شاداب فرماتا ہے اور تم (بھی) اسی طرح (قبروں سے) نکالے جاؤ گے○“

دوسرے مقام پر موت و حیات کا فلسفہ اور اُس کی حکمتوں کو واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ○[2]

”جس نے موت اور زندگی کو (اِس لئے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے، اور وہ غالب ہے بڑا بخشنے والا ہے○“

یہ ایک حقیقت ہے کہ حیات کی طرح موت بھی ایک مخلوق ہے اور اس نے بھی ایک دن مرنا ہے۔

(۱) الروم، ۳۰: ۱۹
(۲) الملك،٦٧: ٢

عذابِ قبر

وہ آیات قرآنی جس میں عذاب قبر کا ذکر ہے ان میں سے چند ایک یہاں مذکور ہیں:

کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَکُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ۚ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ○ (۱)

’’تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالاں کہ تم بے جان تھے اس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت سے ہمکنار کرے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ○‘‘

اس آیہ مبارکہ میں حسب ذیل نکات قابل غور ہیں:

کنتم امواتا (تم مردہ تھے): مردہ ہونے کا بظاہر یہ مفہوم ہے کہ کوئی چیز موجود ہو کر مر جائے مگر اس مقام پر انسانی زندگی کے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے کی حالت کو تشبیہاً موت قرار دیا جا رہا ہے۔

فاحیاکم (پھر اس نے تم کو زندہ کیا): اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو عدمِ محض سے نکال کر حالتِ وجود (existence) میں لا کھڑا کیا۔ مگر یہ سمجھنا حماقت ہوگی کہ یہ زندگی اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

ثم یمیتکم (پھر وہ تمہیں دوبارہ مارے گا): جس خدا نے تم کو عالمِ عدم سے نکال کر عالمِ وجود میں پہنچایا ہے وہی تمہیں بارِ دیگر عالمِ عدم یعنی موت سے دو چار کرے گا۔ مگر یہ منزل بھی انسان کے سفر کی آخری منزل نہ ہوگی۔

ثم یحییکم (پھر وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا): اگرچہ یہ زندگی جو دوسری

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۸

www.MinhajBooks.com

موت کے بعد انسان کو دی جائے گی، پہلی زندگی سے ماہیتاً اور احوالاً مختلف ہو گی مگر یہ بھی انسان کی آخری قرار گاہ نہ بننے پائے گی۔

ثم الیہ ترجعون (پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے): اس دوسری زندگی کے بعد انسان کو پھر دربارِ خداوندی میں حاضر کر دیا جائے گا۔

اس آیت میں دو موتوں اور زندگیوں کا اور پھر خدا کی بارگاہ میں پیش کیے جانے کا، یعنی کل پانچ مرحلوں کا ذکر ہے۔ جن سے انسان یکے بعد دیگرے گزرتا ہے۔ ایمان بالآخرت سے جس آخر کی زندگی پر ایمان مراد لیا جاتا ہے اس کی حقیقت سب سے آخر میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ.

''پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

ترجعون: مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ جس سے یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ انسان خواہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، وہ کافر ہو یا مسلمان ہر شخص کو بہرحال خدا کے سامنے جواب دہی کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مومن اور برگزیدہ افراد ہنسی خوشی اس طرف بڑھیں گے، ان کے لئے جانے میں کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ مگر کافر اور بدکار اس سے دور بھاگنا چاہیں گے۔ ان کی خواہش ہوگی کہ ہم کسی طرح اس مرحلے سے بچ جائیں لیکن وہ کسی طور پر بھی اس زندگی کے نتائج و اثرات سے بچ نہ سکیں گے۔

www.MinhajBooks.com

دو موتیں

قرآنِ کریم نے دو موتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک تو انسان کے سفرِ زندگی شروع کرنے سے پہلے کی حالت، حالتِ عدم ہے جبکہ دوسری موت سے مراد وہ حقیقی موت ہے جس کا نظارہ ہم اپنی روز مرہ زندگی میں کرتے ہیں۔

دو زندگیاں

جس طرح یکے بعد دیگرے انسان پر دو موتیں وارد ہوتی ہیں۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے انسان کو دو زندگیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان میں پہلی زندگی تو واضح ہے کہ اس سے مراد عالمِ شہادت میں رنگ و کیف کی موجودہ زندگی ہے۔ یہ نور وظلمت اور ہست وبود کی زندگی ہے۔ مگر دوسری زندگی سے مراد قیامت کی زندگی نہیں بلکہ عالمِ برزخ یعنی مرنے سے لے کر قیامت تک کی زندگی ہے۔ جس کے دوران منکر نکیر کے سوال و جواب ہوتے ہیں اور انسان عذابِ قبر سے دو چار ہوتا ہے یا رحمت خداوندی کا مستحق ہوتا ہے۔ اس زندگی کا اصطلاحی نام ''حیاتِ برزخی'' ہے جبکہ اُخروی زندگی (آخرت) کا آغاز اس وقت سے ہو گا اس زندگی اور اس مادی کائنات کو کلیتًا فنا کر دیا جائے گا۔ پھر سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر وقوعِ قیامت تک جتنے بھی انسان اس دنیا میں آئے ہوں گے ان سب کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا اور وہ سب عدالتِ الٰہیہ میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب وکتاب پیش کریں گے جس کے نتیجے میں یا تو وہ ابدی جنت کے مستحق ہوں گے یا جہنم کے سزاوار ٹھہرائے جائیں گے۔ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد ہوتا ہے۔

عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يؤتى بالموت كهيئة كبش أملح فينادي مناد يا أهل الجنة! فيشرئبون وينظرون فيقول: هل تعرفون هذا؟ فيقولون: نعم هذا الموت وكلّهم قد رآه ثم ينادي يا أهل النّار فيشرئبون وينظرون فيقول: هل تعرفون هذا؟ فيقولون: نعم هذا الموت وكلهم قد رآه فيذبح ثم يقول: يا أهل الجنّة خلود فلا موت ويا أهل النّار خلود فلا موت ثم قرأ ﴿وَاَنْذِرْ هُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾[1] وهؤلاء

(۱) مریم، ۱۹: ۳۹

في غفلة أهل الدّنيا ﴿وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾.(۱)

’’حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: موت کو (روزِ قیامت) ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا۔ پھر ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اے اہل جنت! وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا: کیا تم اس کو جانتے ہو؟ وہ کہیں گے: ہاں جانتے ہیں۔ یہ تو موت ہے۔ (وہ اس کو پہچان لیں گے) کیونکہ سب نے اسے دیکھا ہوگا۔ پھر پکارا جائے گا: اے اہل جہنم! وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم اسے جانتے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں جانتے ہیں۔ یہ تو موت ہے (وہ اس کو پہچان لیں گے) کیونکہ سب اسے (مرتے وقت) دیکھ چکے ہوں گے۔ پھر اسے (موت کے مینڈھے کو) ذبح کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا: اے اہل جنت! تم اس جنت میں ہمیشہ رہو گے اب کوئی موت نہیں ہوگی اور اے اہل جہنم! تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ اب کسی کو موت نہیں آئے گی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ’’اور آپ انہیں حسرت (و ندامت) کے دن سے ڈرایئے جب (ہر) بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا، مگر وہ غفلت (کی حالت) میں پڑے ہیں اور ایمان لاتے ہی نہیں۔‘‘ اور یہ اہلِ دنیا غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔‘‘

---

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب التفسير، باب قوله و انذرهم يوم الحسرة، ۴: ۱۷۶۰، رقم: ۴۴۵۳

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الجنة و صفة نعيمها و أهلها، باب النار يدخلها الجبارون و الجنة يدخلها الضعفاء، ۴: ۲۱۸۸، رقم: ۲۸۴۹

۳۔ عبد بن حميد، المسند، ۱: ۲۸۶، رقم: ۹۱۴

۴۔ منذري، الترغيب و الترهيب، ۴: ۳۱۶، رقم: ۵۷۶۲

۵۔ بغوي، شرح السنة، ۱۵: ۱۹۸، رقم: ۴۳۶۶

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے جگر گوشہ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

واعلم أن مالک الموت هو مالک الحياة وأن الخالق هو المميت.(۱)

’’جان لو کہ اس کائنات میں موت کا مالک اور اُس کا فرماں روا وہی ہے جو زندگی کا مالک ہے۔ وہی جس نے پیدا کیا ہے وہی موت دینے والا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ حکیم ہے جو عالم و قادر اور حیّ ہے کہ جس نے اپنے ارادے کے ساتھ اِس جہان کا نظام قائم کیا ہے۔ اُسی نے زندگی کو پیدا فرمایا ہے اور پھر زندہ اشیاء کو ایسی قوتوں اور توانائیوں سے آراستہ و پیراستہ فرمایا کہ جن کی اُنہیں اپنی زندگی کی بقا کے لئے سخت ضرورت لاحق رہتی ہے۔ حی و قیوم میں ’’حیّ‘‘ کے معنی زندہ کے ہیں اور قیوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو خود زندہ نہ ہو وہ تمام دنیا جہان کے لئے زندگی بخش کس طرح ہوسکتا ہے اور جو خود اپنی ذات سے قائم نہ ہو، وہ آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا کس طرح ہوسکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ ایک زندہ حقیقت ہے

اللہ تعالیٰ ایک زندہ خدا ہے۔ ایک زندہ خالق و مالک ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا ہے، سنتا ہے، ہماری دعائیں اور فریادیں سنتا ہے۔ ہمارے اعمال و افعال اس کی نظر میں ہیں۔ اس سے یہ بات متحقق ہوتی ہے کہ وہ ہماری دعائیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے اور ہمارے اعمال پر ایک دن وہ جزا اور سزا بھی دے گا۔

اہلِ کتاب ’’اللہ تعالیٰ کے زندہ خدا‘‘ کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ سابقہ انبیاء و رُسل عظام علیہم السلام کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جہاں کہیں

(۱) شرح ابن الحدید: ۷۳

بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کی غیرت کا اظہار ہوا ہے بالعموم اس کے لیے ''زندہ خدا'' ہی کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ علاّم الغیوب سب کچھ جانتا ہے۔ جو اس کے سامنے ہے وہ حاضر و مستقبل میں ہے اور جو ان سے پیچھے گزشتہ اقوام و ملل کو پیش آیا اور پوری مخلوقات اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی اور اللہ تعالیٰ نے یوں بھی ارشاد فرمایا:

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ط وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًاo(۱)

''اور (سب) چہرے اس ہمیشہ زندہ (اور) قائم رہنے والے (رب) کے حضور جھک جائیں گے، اور بیشک وہ شخص نامراد ہوگا جس نے ظلم کا بوجھ اٹھا لیاo''

وہ حیّ لا یموت ہے۔ اس ضمن میں یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ط وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاo(۲)

''اور آپ اس (ہمیشہ) زندہ رہنے والے (رب) پر بھروسہ کیجئے جو کبھی نہیں مرے گا اور اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہئے اور اس کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا کافی ہےo''

حمد و تسبیحِ الٰہی حصولِ صبر و توکل کا وسیلہ ہے

وہ زندہ خدا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس پر بھروسہ کرنے والے کبھی محروم اور نامراد نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح حصولِ صبر و توکل کا وسیلہ ہے اور پھر اپنے ان مخالفین کا معاملہ اپنے رب کے حوالے کر دو۔ وہ ان کے تمام جرائم سے پوری طرح باخبر ہے اور جب وہ باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جس کے یہ سزاوار

(۱) طہ، ۲۰: ۱۱۱

(۲) الفرقان، ۲۵: ۵۸

ہیں۔ اللہ تعالیٰ ’’الحی‘‘ ہے اور اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ صرف وہی زندہ ہے اسی حوالے سے ارشادِ باری ہے:

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ط اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۱)

’’وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم اس کی عبادت اُس کے لئے طاعت و بندگی کو خالص رکھتے ہوئے کیا کرو، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے ○‘‘

حقیقی زندگی کا سرچشمہ ذاتِ واجب الوجود ہے

حقیقی زندہ اور زندگی بخشنے والا صرف وہی ہے۔ اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ جیسا کہ کئی دیگر مقامات پر بتایا گیا ہے کہ وہ زندگی سے محروم ہیں۔ ’’أموات غیر احیاء‘‘ زندگی سے محروم مردے ہیں۔ وہ نہ سنتے ہیں نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں۔ ان کو پکارنا بالکل لاحاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو اور پورے اخلاص کے ساتھ اسی کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جو تمام عالم کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی درحقیقت الحيّ القیوم ہے۔ وہ زندہ ہے اور زندگی عطا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا معبودانِ باطلہ کو ہرگز موت وحیات پر اختیار نہیں ہے۔ اس ضمن میں ارشادِ باری ہے:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ○ (۲)

’’اور ان (مشرکین) نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود بنا لئے ہیں جو کوئی چیز بھی پیدا

---

(۱) المؤمن، ۴۰: ۶۵

(۲) الفرقان، ۲۵: ۳

www.MinhajBooks.com

نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے لئے کسی نقصان کے مالک ہیں اور نہ نفع کے اور نہ وہ موت کے مالک ہیں اور نہ حیات کے اور نہ (ہی مرنے کے بعد) اٹھا کر جمع کرنے کا (اختیار رکھتے ہیں)o‘‘

ان معبودانِ باطلہ کے برعکس اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ جو اپنے قانون کے مطابق زندگی دیتا ہے اور موت طاری کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک خوبصورت انداز اس طرح سے ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا نِالَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ. (۱)

’’آپ فرما دیں اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول (بن کر آیا) ہوں جس کے لئے تمام آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جلاتا اور مارتا ہے،‘‘

سورۃ الدخان میں اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کو قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا م اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَo لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ط رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَo (۲)

’’آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے (اُس کا) پروردگار ہے، بشرطیکہ تم یقین رکھنے والے ہو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی دیتا اور موت دیتا ہے (وہ) تمہارا (بھی) رب ہے اور تمہارے اگلے آبا و اجداد کا (بھی) رب ہےo‘‘

(۱) الأعراف، ۷: ۱۵۸

(۲) الدخان، ۴۴: ۷، ۸

گویا اللہ تعالیٰ ہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے تو جب کسی دوسرے کو نہ موت کے معاملے میں کوئی دخل نہ زندگی کے معاملے میں کوئی اختیار، تو اس کے سوا کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے کے کیا معنی؟ اسی اختیار اور قانون فطرت کے مطابق اقوام کی موت اور حیات بھی آتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ افراد کی پیدائش اور پرورش اور موت پر قادر ہے۔ اسی طرح اقوام کی موت و حیات اللہ تعالیٰ کے انہی محکم قوانین سے وابستہ ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے زندہ رہتی ہے اور جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے تباہ ہو جاتی ہے۔ گویا ہر شے کو موت و حیات اللہ تعالیٰ کے قانون ہی کے مطابق ملتی ہے۔ ’’اللہ الحیّ‘‘ مردوں کو اپنے قانون کے مطابق زندگی عطا کرتا ہے ’’انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو زندہ کیسے قبر سے نکالا جاؤں گا۔‘‘ اس کے جواب میں ارشاد باری تعالیٰ اس طرح سے ہوتا ہے:

اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَکُ شَیْئًاo[1]

’’کیا انسان یہ بات یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے (بھی) اسے پیدا کیا تھا جبکہ وہ کوئی چیز ہی نہ تھاo‘‘

اس طرح سے بھی اس الحی القیوم کا ارشاد ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ یُحْیِ الْمَوْتٰی وَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌo[2]

’’یہ (سب کچھ) اس لئے (ہوتا رہتا) ہے کہ اللہ ہی سچا (خالق اور رب) ہے اور بیشک وہی مُردوں (بے جان) کو زندہ (جاندار) کرتا ہے اور یقیناً وہی ہر چیز پر بڑا قادر ہےo‘‘

---

(۱) مریم، ۱۹: ۶۷

(۲) الحج، ۲۲: ۶

اللہ تعالیٰ کس طرح مردہ ہو جانے والوں کو زندہ کرے گا، اس سلسلے میں قرآن حکیم میں متعدد آیات میں اس جانب واضح طور پر اشارہ کر دیا گیا ہے:

فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ج وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ○(۱)

''سو آپ اللہ کی رحمت کے اثرات کی طرف دیکھئے کہ وہ کس طرح زمین کو اس کی مُردنی کے بعد زندہ فرما دیتا ہے، بیشک وہ مُردوں کو (بھی اسی طرح) ضرور زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ○''

سورہ یٰسین میں اس ضمن میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ.(۲)

''بیشک ہم ہی تو مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے ہیں۔''

اور یوں بھی ارشاد فرمایا:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلْقَهٗ ط قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ○(۳)

''اور (خود) ہمارے لئے مثالیں بیان کرنے لگا اور اپنی پیدائش (کی حقیقت) کو بھول گیا۔ کہنے لگا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہوچکی ہوں گی؟ فرما دیجئے: انہیں وہی زندہ فرمائے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، اور وہ ہر مخلوق کو خوب جاننے والا ہے ○''

---

(۱) الروم، ۳۰: ۵۰

(۲) یٰس، ۳۶: ۱۲

(۳) یٰس، ۳۶: ۷۸۔ ۷۹

کیا ان کافروں اور نادانوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کارساز بنا رکھے ہیں۔ پس کارساز تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور اس کی قدرتِ کاملہ تمام اشیائے کائنات پر محیط ہےاور وہ اس پر قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے۔

اس دنیا میں زندگی ملنے سے پہلے کا عرصہ پہلی موت، پھر زندگی پھر دنیا کی زندگی کا خاتمہ یعنی موت اور اس کے بعد دوسری زندگی، اسی حوالے سے ارشاد الٰہی ہے کہ ''تم قانون خداوندی سے کیسے انکار کر سکتے ہو! تم مردہ تھے اس نے زندگی عطا کی، پھر مر جاؤ گےاور اس کے بعد پھر زندگی ملے گی۔'' ارشاد باری ہے:

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ○(۱)

''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دوبار موت دی اور تو نے ہمیں دوبار (ہی) زندگی بخشی، سو (اب) ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، پس کیا (عذاب سے بچ) نکلنے کی طرف کوئی راستہ ہے؟○''

ہر طرح کی زندگی کا اظہار الحیّ کی صفت کا مرہونِ منت ہے

اور پھر یہ بھی ہے کہ موت کے بعد دنیا میں واپسی بھی نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں سورۃ المومنون میں اور سورہ المنافقون میں بھی ارشاد الٰہی ہے کہ اللہ الحی کی یہ صفت زندگی کی نمود اور زندگی کی روانی اور پھر حیات بعد الممات پر پوری طرح سے حاوی ہے۔ ہر طرح کی زندگی کا اظہار اسی ''الحیّ'' کی صفت کا مرہون منت ہے اور جب اس میں روئیدگی آجاتی ہے تو گویا اسے حیات تازہ عطا کرنا قرار دیتا ہے۔ اسی طرح انسان پر جب طبیعی موت وارد ہوتی ہے اسے مردہ کہا جاتا ہے اور جب اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو اسے حیات نو کہا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے موت کے بعد اس دنیا میں کوئی شخص واپس

(۱) المؤمن، ۴۰: ۱۱

نہیں آسکتا۔ اس لیے انسان کے لیے عمل کا صرف اسی دنیاوی زندگی ہی میں موقع ہے اور اسی زندگی کے اعمال کے مطابق اس کی مستقبل کی زندگی متشکل ہوتی ہے، اچھی بھی اور بری بھی۔ دوبارہ یہاں آنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

طبیعی موت انسان کے محض جسم پر وارد ہوتی ہے

قرآن حکیم کی رو سے طبیعی موت انسان کے جسم پر وارد ہوتی ہے لیکن انسانی ذات جو نہ قوانین طبیعی کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور نہ ہی ان قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ اس پر موت وارد نہیں ہوسکتی، قرآن حکیم نے اسے نفس کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا انسان کی طبیعی موت کے بعد نفس انسانی آگے جاتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ **المحي** اور **الحي** ہے، اسی طرح وہ ''**المميت**'' بھی ہے۔ اپنی اس صفت کے حوالے سے وہ اپنے خاص قانون اور قاعدے کے مطابق وہی مارتا ہے اور وہی زندہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ○(۱)

''اور کوئی شخص اللہ کے حکم کے بغیر نہیں مر سکتا (اس کا) وقت لکھا ہوا ہے، اور جو شخص دنیا کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں، اور جو آخرت کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں، اور ہم عنقریب شکر گزاروں کو (خوب) صلہ دیں گے ○''

پھر اس طرح ارشاد فرمایا:

وَاللهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○(۲)

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۵

(۲) آل عمران، ۳: ۱۵۶

’’اور اللہ ہی زندہ رکھتا اور مارتا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال خوب دیکھ رہا ہے o‘‘

ہر طرح کی زندگی اور موت وہی اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اس سلسلے میں یوں ارشاد ہے:

هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَo(۱)

’’وہی جلاتا اور مارتا ہے اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے o‘‘

اسی ضمن میں سورۃ الحجر میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوَارِثُوْنَo(۲)

’’اور بیشک ہم ہی جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور ہم ہی (سب کے) وارث (و مالک) ہیں o‘‘

اللہ تعالیٰ نے جو حیات و ممات کا ایک بے پناہ نظام نافذ کر رکھا ہے، یہ یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بھی اس اللہ المحی اور الحی و الممیت نے غور و فکر کرنے والوں کے لیے مقاماتِ تفکر فراہم کیے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَo(۳)

’’اور وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور شب و روز کا گردش کرنا (بھی) اسی کے اختیار میں ہے۔ سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟‘‘

یہ اللہ تعالیٰ ہی کا سارا وسیع و عریض نظام ہے اور ہر چیز کا اسی نے اہتمام کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

---

(۱) یونس، ۱۰: ۵۶

(۲) الحجر، ۱۵: ۲۳

(۳) المؤمنون، ۲۳: ۸۰

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ط هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ط سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○ (۱)

’’اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر اس نے تمہیں رزق بخشا پھر تمہیں موت دیتا ہے پھر تمہیں زندہ فرمائے گا، کیا تمہارے (خود ساختہ) شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان (کاموں) میں سے کچھ بھی کر سکے، وہ (اللہ) پاک ہے اور ان چیزوں سے برتر ہے جنہیں وہ (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں○‘‘

کائنات کی ہر چیز اُسی کے امرِ کن سے وجود میں آتی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ○ (۲)

’’اس کا امرِ (تخلیق) فقط یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو (پیدا فرمانا) چاہتا ہے تو اسے فرماتا ہے ہو جا، پس وہ فوراً (موجود یا ظاہر) ہو جاتی ہے۔ (اور ہوتی چلی جاتی ہے)○‘‘

دوسرے مقام پر اس کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ج وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ج اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ○ (۳)

’’اور وہ کہتے ہیں ہماری دنیوی زندگی کے سوا (اور) کچھ نہیں ہے ہم (بس) یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے کے (حالات و واقعات کے) سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا (گویا خدا اور آخرت کا مکمل انکار کرتے ہیں) اور انہیں

(۱) الروم، ۳۰: ۴۰

(۲) یٰس، ۳۶: ۸۲

(۳) الجاثیۃ، ۴۵: ۲۴

اس (حقیقت) کا کچھ بھی علم نہیں ہے وہ صرف خیال و گمان سے کام لے رہے ہیں o‘‘

پھر فرمایا:

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ o(۱)

’’فرما دیجئے: اللہ ہی تمہیں زندگی دیتا ہے اور پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے پھر تم سب کو قیامت کے دن کی طرف جمع فرمائے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے o‘‘

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ o(۲)

’’بیشک ہم ہی زندہ رکھتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے o‘‘

اسی تناظر میں یوں بھی آیا ہے:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ج وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ o(۳)

’’اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے، اور وہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے o‘‘

www.MinhajBooks.com

---

(۱) الجاثیۃ، ۴۵: ۲۶

(۲) قٓ، ۵۰: ۴۳

(۳) الحدید، ۵۷: ۲

سلسلۂ کائنات ہمیشہ رہنے والا نہیں

جان لینا چاہیے کہ یہ سارا سلسلہ کائنات سدا رہنے والا نہیں ہے۔ یہ سارا سلسلہ کائنات ایک متعین مدت کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ کوئی شخص سدا زندہ نہیں رہ سکتا، موت ہر ایک کو آئے گی۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر واضح طور پر بتا دیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّاَنَّ اللهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○(۱)

’’کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ رات کو دن میں داخل فرماتا ہے اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے اور (اسی نے) سورج اور چاند کو مسخّر کر رکھا ہے، ہر کوئی ایک مقرّر معیاد تک چل رہا ہے اور یہ کہ اللہ ان (تمام) کاموں سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے○‘‘

اور بڑے ہی واشگاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ.(۲)

’’(اے موت کے ڈر سے جہاد سے گریز کرنے والو) تم جہاں کہیں (بھی) ہوگے موت تمہیں (وہیں) آ پکڑے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں (ہی) ہو۔‘‘

اور اس طرح سے بھی موجود ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ط وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ○(۳)

(۱) لقمان، ۳۱: ۲۹

(۲) النساء، ۴: ۷۸

(۳) الأنبیاء، ۲۱: ۳۵

’’ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی میں آزمائش کے لئے مبتلا کرتے ہیں، اور تم ہماری ہی طرف پلٹائے جاؤ گے o‘‘

اور پھر سورۃ العنکبوت میں اس طرح سے ارشاد باری ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ o[1]

’’ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے o‘‘

سورۃ الجمعہ میں اس طرح سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِىْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ o[2]

’’فرما دیجئے: جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تمہیں ملنے والی ہے پھر تم ہر پوشیدہ و ظاہر چیز کو جاننے والے (رب) کی طرف لوٹائے جاؤ گے سو وہ تمہیں آگاہ کر دے گا جو کچھ تم کرتے تھے o‘‘

اللہ تعالیٰ اپنے خاص نظام کے تحت مخلوقات کو موت سے ہمکنار کرتا ہے۔ گویا جس طرح وہ اللہ تعالیٰ زندگی دیتا ہے اسی طرح موت بھی وارد کرتا ہے۔ وہ مارنے والا ہے اللہ تعالیٰ ہی اجسام کو مارنے والا ہے اور اسی طرح دلوں کو غفلت اور نادانی سے مارتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات اور وسوسوں کو مارے اور الحيّ کی صفت سے اپنے آپ کو متصف کرتے ہوئے قلب و باطن کی حقیقی زندگی سے آراستہ کرے۔

www.MinhajBooks.com

---

(۱) العنکبوت، ۲۹: ۵۷

(۲) الجمعۃ، ۶۲: ۸

اَلْقَیُّومُ کے معانی و مطالب

''قیوم'' کا اصل مادہ ''ق و م'' ہے۔ ''قیوم'' مبالغہ کا وزن ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم ہو اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ اور ذریعہ ہو۔ اس کے معنی ہیں اعتدال اور توازن قائم ہونا۔ اسی نہج پر قام اور قیام کے معنی کھڑے ہونے کے ہیں۔ کھڑا وہی رہ سکتا ہے جس کا توازن قائم رہے۔

اَلْقَیُّومُ کا پہلا معنٰی

القیّوم کا پہلا معنی یہ ہوا کہ وہ خود قائم اور ہر چیز کا محافظ اور اس کو وہ اسباب عطا فرمانے والا جن کے ساتھ اس کا قیام ممکن ہے لہٰذا اس کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں یعنی اپنی ذات میں قائم اور دوسروں کو قائم رکھنا۔ پھر قیوم کے دیگر معانی میں ہمیشہ قائم رہنے والا، ہر طرح کے حوادث اور خطرات سے محفوظ اور سدا قائم۔ ''قیوم'' کی صفت سابقہ انبیاء کے صحیفوں میں بار بار پہلے بھی مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اور اس کی قدرت سے قائم ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی بدیہی صفات میں سے ہے، جن پر عقلاً بھی ایمان لانا ضروری ہے اور نقلاً و شرعاً بھی۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کی صفت کا حوالہ اور دلیل یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی بھی کرتا ہے، وہ اپنی خلق کو قائم رکھنے والا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کے اسباب و وسائل بھی پیدا کرتا ہے اور قیومیت اس بات کی مقتضی ہے کہ خدائے قیوم و کارساز اس امر کی بھی نگرانی کرے کہ بندہ سرکشی اور بغاوت کا مرتکب نہ ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ خود حق پر اور عدل پر قائم ہے اور دوسروں کو عدل و

حق پر قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم میں کئی لطیف ارشادات موجود ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت تین بار اِستعمال ہوئی ہے اور الحیّ القیوم کی صورت میں آئی ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ.(۱)

’’اللہ، اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں (وہ) ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے (سارے عالم کو اپنی تدبیر سے) قائم رکھنے والا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے اور پوری مخلوقات اور کائنات اس کے علم کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ط وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًاo(۲)

’’اور (سب) چہرے اس ہمیشہ زندہ (اور) قائم رہنے والے (رب) کے حضور جھک جائیں گے، اور بیشک وہ شخص نامراد ہوگا جس نے ظلم کا بوجھ اٹھا لیاo‘‘

خدا خاموش علت العلل نہیں ہے

مشرکین مکہ خدا کو تو مانتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت انہوں نے اپنے خدا کو بوڑھا اور ناکارہ خدا سمجھا ہوا تھا۔ لیکن قرآن حکیم ان کے زعمِ باطل پر ضرب لگاتا ہے اور فرماتا ہے کہ خدا کوئی ناکارہ وجود نہیں ہے بلکہ زندہ خدا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا کے سارے معاملات کو دوسروں کے اوپر نہیں چھوڑتا اور وہ کوئی خاموش علت العلل بن کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ ’’قیوم‘‘ یعنی اس کائنات کے سارے نظم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو خود اپنی نگرانی اور اہتمام میں چلا رہا ہے۔ اس اِسم مبارک کے حوالے سے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اللہ کے سوا سب سے بے نیاز ہو جائے اور اللہ کے بندوں کے

(۱) آل عمران، ۳: ۲

(۲) طٰہٰ، ۲۰: ۱۱۱

کام سنوارے۔ اللہ تعالیٰ کی زندگی ذاتی ہے اور اِس قسم کی زندگی نہیں ہے جس قسم کی مخلوقات کی ہے، اِس کی زندگی فانی نہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی زندگی ازلی و ابدی ہے اس کی کوئی ابتداء اور انتہاء نہیں ہے۔ اِس کی زندگی میں زمانہ نہیں ہے۔ مخلوقات کی زندگی زمانے کی حدود میں محدود ہے اور اس کی زندگی حیات مطلقہ ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں ہے وہ مخلوقات کی زندگیوں میں موجود خصوصیات سے بالاتر ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

القیوم القائم الحافظ لکل شیءٍ والمعطی لہٗ ما بہٖ قوامہٖ وذالک ہو المعنیٰ المذکورہ فی قولہٖ تعالیٰ والذی اعطی کل شیءٍ خلقہٗ ثم ھُدی. (۱)

’’قیوم تمام اشیاء کا قائم رکھنے والا اور ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ قیوم وہ ہے جس نے ہر موجود کو اُس کا ذریعہ قوام اور اُس کی بقاء کے لئے کام آنے والا سرمایۂ عطا فرمایا ہے۔ یہ وہی ہستی ہے جس کا تذکرہ قرآنِ حکیم کی اِس آیت میں کیا گیا ہے۔ وہ اللہ جس نے ہر شے کو وہ سب کچھ دیا جو اِس کی تخلیق کے لئے لازم ہے اور پھر اِس کو ہدایت کی۔‘‘

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اوران کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس آئے اور اُسے دعوتِ توحید دی تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى‏ ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (۲)

’’(فرعون نے) کہا تو اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ ۝ (موسیٰ علیہ السلام

(۱) راغب، اصفہانی، المفردات: ۲۱۷

(۲) طٰہ، ۲۰: ۴۹، ۵۰

نے) فرمایا: ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسبِ حال) اس کی رہنمائی کیo‘‘

اس آیت سے یہ امر متحقق ہوا کہ:

اُس نے کہا: اے موسیٰ! تم دونوں کا خدا کون ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہمارا رب وہ پروردگار حکیم و دانا ہے جس نے اپنے حکیمانہ انداز کے مطابق قائم کئے ہوئے نظام میں ہر زندہ موجود کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جو اُس کے لئے ضروری تھا اور اُسے وہ سب کچھ عطا کر دیا ہے جو اُس کے اپنی زندگی گزارنے کے لئے لازمی تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کو اپنی زندگی کی راہ بتائی اُسے اُس کی زندگی کی ضروریات کی پہچان دی اور اپنے اعضاء و جوارح سے صحیح استفادہ کرنے کے لئے اُس کی رہنمائی کر دی ہے۔

ہر شے لوازم حیات سے آراستہ ہے

پانی میں رہنے والا ایک معمولی سا کیڑا ہو یا خشکی پر زندگی بسر کرنے والا ایک ضعیف سا مچھر اِنسان یا حیوان کے خون سے غذا پاتا ہے وہ بھی اپنی زندگی گزارنے کے لئے تمام لوازِم حیات سے آراستہ دکھائی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیڑے کے جسم میں اِس قدر لچک اور نرمی رکھی ہے کہ وہ بآسانی پانی میں تیر سکتا ہے اور اُس کے بدن کی ساخت اِس طرح کی ہوتی ہے کہ دائمی طور پر پانی میں رہنے کی وجہ سے کمزوری اور بوسیدگی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی خوراک کو اچھی طرح پہنچانتا ہے اور لپک کر اُس کا شکار کرتا ہے اور اپنی بھوک مٹاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مچھر کو پر عطا کئے ہیں اور وہ پرواز کر کے اپنی غذا کے مقام کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ اِس کے پاس ایک نازک سی نوک دار سونڈ ہوتی ہے۔ اُسے اِس بات کا علم ہے کہ اِس سونڈ کو اِنسان حیوان کی رگ میں اُتار کر اپنی غذا حاصل کرے۔

غرض اللہ قیوم نے تمام حشرات اور سارے حیوانات چرند، پرند کو کچھ اِس طرح پیدا فرمایا اور اُن کو ایسے اعضائے بدن اور ایسے قویٰ سے مسلح کر دیا ہے جو اُس ماحول کے

عین مطابق اور سازگار ہوتی ہے۔

نظامِ کائنات قدرتِ خداوندی کی حکیمانہ تدبیر کا زندہ ثبوت ہے

عرفاء و کاملین نے پرندوں کی خلقت بیان کر کے توحید کا حکیمانہ استدلال کیا ہے۔ لمبی ٹانگوں والے پرندے ہوں یا لمبی گردن والا حیوان زرافہ یہ تمام پرند اور حیوان اِس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سارا نظام خداوند قدوس کی حکیمانہ تدابیر کا زندہ ثبوت ہے۔ حضرت سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ لمبی ٹانگوں والے پرندے سے متعلق بیان فرماتے ہیں:

’’چونکہ اِس کی زندگی کا اکثر وقت کم گہرائی والے پانی میں خوراک تلاش کرتے گذرتا ہے۔ اِس لئے یہ اپنی لمبی ٹانگوں کے ساتھ چوکیدار کی طرح پانی پر گہری نگاہ لگائے ہوئے ہوتا ہے جو کسی اونچی مچان پر جاسوسی کے لئے بیٹھا ہو۔ جونہی اِس کی اپنے شکار پر نگاہ پڑتی ہے تو پھر بڑی آہستگی کے ساتھ اِس کی طرف چل دیتا ہے اور بڑے آرام سے اُسے پکڑتا اور ہڑپ کر لیتا ہے۔ اب اگر اِس کی ٹانگیں چھوٹی ہوتیں تو جب یہ اپنے شکار کی طرف چلتا تو اِس کا پیٹ پانی سے ٹکراتا اور اِس میں تلاطم پیدا ہو جاتا۔ اِس سے کیڑے گھبرا کر بھاگ جاتے اور یہ پرندہ شکار نہ ملنے کے باعث بھوکا رہ جاتا۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس پرندے کو دو لمبی ٹانگیں عطا کر دیں تاکہ وہ اِن کے ذریعے اپنی غذائی ضروریات کو پورا کر سکے اور اپنے شکار کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے۔‘‘(۱)

ہر لمبی ٹانگوں والے پرندے کو لمبی گردن عطا فرمائی۔ ٹانگوں اور گردن کی لمبائی کی یہ ہم آہنگی رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پرندہ اپنا لقمہ آسانی سے زمین سے اُٹھا سکے۔ اگر اِس کے برعکس ہوتا کہ ٹانگیں لمبی ہوتیں اور گردن چھوٹی ہوتی تو یہ زمین پر سے اپنی غذا اُٹھانے پر قادر نہ ہوتا۔ یہ الحیّ القیوم اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اپنے حسبِ حال نواز رکھا ہے۔(۲)

(۱) ہارون یحییٰ، اللہ کی نشانیاں (مترجم ڈاکٹر تصدق حسین): ۳۷

(۲) عجیلی، الفتوحات الالہیہ، ۱: ۳۴

زرافہ کی گردن کی لمبائی سے متعلق حضرت سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

”زرافہ کی گردن کی لمبائی درختوں سے غذا حاصل کرنے اور زندگی گزارنے کے ماحول کے عین مطابق ہے، کیونکہ اُس کی زندگی گھنے جنگلوں میں گذرتی ہے اور اِس کے بارے میں قیوم خالق و مالک کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ درختوں کے پتوں سے اپنی غذا حاصل کرے۔ قیوم خالق نے اِبتداء ہی سے اِسے لمبی گردن والا پیدا فرمایا اور اُسے ایسے بدن اور ایسے عضو کے ساتھ آراستہ کر کے روانہ فرمایا جو اِس کی زندگی کی بقاء کے لئے لازمی تھا۔“(۱)

امام راغب اصفہانیؒ نے لفظ قیوم کا یہ معنی کہ ”المعطی لہٗ مابہ قوامہ“ یعنی وہ ہرشے کو وہ سب کچھ عطا کرنے والا ہے جس سے اُس کا قوام اور اُس کی بقاء ہے۔ یہ اِسی بنیادی و اساسی اُصول کی طرف اشارہ ہے۔ قیوم خالق نے ہر موجود کو وہ تمام وسائل حیات عنایت کر دیئے ہیں جو زندگی کی راہ میں اُس کی بقا اور قائم رہنے کے لئے ضروری ہو سکتے ہیں۔

الحیّ القیّوم کے بلا عطف استعمال ہونے کی حکمت

الحیّ القیوم دونوں صفاتِ خداوندی کا بلا عطف آیت الکرسی میں اِستعمال ہونا اِس میں نہایت بلیغ نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حیّ سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کائنات حیّ یعنی زندہ خدا کے حکم سے زندہ ہوئی ہے۔ چونکہ صرف زندگی عطا کر دینا ہی زندگی کی بقا اور دوام کے لئے کافی نہیں جب تک اُسے وسائلِ حیات سے آراستہ نہ کیا جائے اور لوازم زندگی سے مسلح نہ کیا جائے۔ وہ اپنے ماحول کے مطابق زندگی گزارنے اور زندہ رہنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اِسی لئے آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ”حیّ“

(۱) عجیلی، الفتوحات الالھیہ، ۱: ۳۴

ہونے کی صفت کے تذکرے کے فوراً بعد بلا عطف ''قیوم'' ہونے کی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہی نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ ''قیوم'' نے جہاں موجوداتِ کائنات کو نعمتِ زندگی سے مالا مال کیا، وہاں اِن کی زندگی گزارنے اور باقی رہنے کے لئے بڑے حکیمانہ انداز میں ضروری منصوبہ بندی بھی فرما دی ہے۔ چنانچہ تمام زندہ موجودات کو ایسے مناسب اعضا اور بہترین قویٰ عطا کر دیئے ہیں جو اِن کے ماحول سے بڑی مناسبت اور موافقت رکھتے ہیں اور وہ اِن سے کامل فائدہ حاصل کرنے پر قدرت و اختیار بھی رکھتے ہیں۔ پس اِن زندہ اشیائے کائنات کا ضروری اعضاء و جوارح وقویٰ سے آراستہ و پیراستہ ہونا بیک وقت اللہ تعالیٰ کی دو صفات ''حیّ اور قیوم'' سے متصف ہونے کا مظہر بن رہا ہے۔

اَلْقَیُّوم کا دوسرا معنی: ازلی وجود کا مالک

قیوم کا دوسرا معنی ''اَلّذی لا بدء لہٗ'' وہ کہ جس کا کوئی آغاز اور اِبتداء نہ ہو۔ اِس معنی کے لحاظ سے قیوم اس ہستی کو کہیں گے کہ جو ازلی وجود کی مالک ہو۔ یعنی اُس کے وجود کے لئے نقطۂ آغاز اور ابتداء کسی معین وقت یا زمانے کی ضرورت نہ ہو۔ گویا وہ ہمیشہ سے ہو۔ یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ ذات واجب الوجود ازلی اور قیوم ہے اور اِس کے لئے کوئی آغاز نہیں ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جدید ذہنوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ

سوال کیا جاتا ہے کہ یہ جہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن خود اللہ تعالیٰ کا وجود کہاں سے آیا اور اِس کو کس نے پیدا کیا؟ اِس سوال کے جواب میں محقق علمائے فلاسفہ سے اِستفادہ کرنا ناگزیر ہے وہ کہتے ہیں ''الذاتی لا یعلل'' وہ شے جو کسی موجود کی ذات ہو یعنی وہ شی جو کسی موجود کی ذات کا مستقل لازمہ ہو۔ اِس لئے کہ ذات کبھی ذات سے

جدا نہیں ہوتی۔ ذات کے وجود میں آتے ہی اِس کی ذات بغیر کسی علت وسبب کے وجود میں آ جاتی ہے۔ مثلاً زوجیت یعنی جوڑا ہونا۔ دو کے عدد کی ذات کو لازم ہے اور یہ لازمہ اُس عدد کی ذات سے کبھی جدا نہیں ہوسکتا۔ جہاں کہیں دو ہونا صادق آئے گا، وہاں اِس کا یہ لازمہ یعنی اُن کا جفت ہونا ایک ضروری شے ہے، لیکن اُس جفت ہونے کے تحقّق کے لئے دو ہونے کا تحقّق کافی ہے اور جب دو ہوئے تو جفت بھی ہوں گے لہٰذا ثابت ہوا زوجیت یعنی جفت ہونا دو ہونے کی ذاتی ہے اور اِس کا لازمہ ہے کیونکہ یہ ذاتی کبھی بھی اپنی ذات سے جدا نہیں ہوسکتی۔ اب یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا ازبس ضروری ہے کہ وجود بھی واجب الوجود کی ذات کا لازمہ ہے۔ اس لئے نہ تو وجود ذات اللہ تعالیٰ سے جدا ہوسکتا ہے اور نہ ہی ذاتِ خدا وجود سے جدا ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس وہ ممکن الوجود ہے کہ جو از خود وجود نہیں رکھتا اور اِس کے لئے ضروری ہے کہ خدا اُس کو وجود بخشے تو وہ معرضِ وجود میں آئے لہٰذا ثابت ہوا کہ وجود تو پس ذاتِ واجب کا لازمہ ہے۔ اِس لئے یہ سوال کرنا ہی غلط ہے کہ وہ ہستی کہاں سے آئی؟ کیونکہ ذاتی علیحدہ علت وسبب کی طرف احتیاج ہی نہیں رکھتی۔ ایک اور پہلو سے اس سوال پر غور کیا جائے کہ کائنات کی روشنی تو نور سے ہے، لیکن خود نور کی روشنی کس چیز سے ہے؟ اِس طرح کائنات کا وجود تو اللہ تعالیٰ سے ہے لیکن خدا کا وجود کہاں سے ہوا؟ یا یوں کہا جائے کہ تاریک اور اندھیرے جہاں میں روشنی تو نور کے صدقے آتی ہے، لیکن نور کس چیز سے روشن ہوتا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہوگا کہ نور کسی دوسری چیز سے روشن نہیں ہوتا بلکہ نور کی روشنی نور کی ذاتی ہے اور یہ ذات نور کا لازمہ ہے۔ پس یہ جہان تو اللہ تعالیٰ سے وجود میں آیا اور اُس کے نور نے آسمان و زمین کو وجود بخشا ہے۔ لیکن خود اللہ تعالیٰ کا وجود کہیں اور سے نہیں آیا۔ کیونکہ وجود تو اُس ذاتِ واجب الوجود کا عین ذات ہے اور وہ ذاتِ حق عین وجود ہے۔ جب کہ کسی وجود کی ذاتی کسی دوسری علت کی محتاج نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ازلی اور قدیم ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور اِس کی کوئی اِبتداء نہیں ہے۔ قیوم کے اِس دوسرے معنی میں اِس سوال کا جواب ہے کہ خدا کہاں سے آیا ہے؟

اَلْقَیُّومُ کا تیسرا معنی

تاج العروس اور لسان العرب میں قیوم کا ایک تیسرا معنی یہ بیان ہوا ہے۔

القیوم هو القائم بنفسه مطلقا لا بغیره وهو ماذالک بقوم به کل موجود. (۱)

’’قیوم وہ ذات واجب الوجود ہے کہ اپنے تمام صفاتِ کمال کے ساتھ خود بخود قائم ہے، وہ کسی غیر کی طرف معمولی سا احتیاج بھی نہیں رکھتی اور تمام موجودت کائنات اور پورا جہانِ ہستی اُس ذاتِ الٰہی کے سہارے قائم ہے۔‘‘

اِس معنی میں یہ اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ہر ممکن لباس وجود کے ساتھ آراستہ ہونے کے بعد بھی ہر جگہ اور ہر حال میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عظیم بارگاہ میں نیازمند، محتاج اور فقیر ہے۔ ہر شے موجود رہنے اور پھر باقی رہنے میں وہ مسلسل واجب الوجود ذات کی محتاج ہے۔ یہ جہانِ ہستی نہ صرف اپنے موجود ہونے میں اللہ ’’قیوم‘‘ کا محتاج تھا، بلکہ اِس جہان کا قیام اور اِس کائنات کا نظام بھی اِس کی ذاتِ اقدس سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا فیض لحظہ بہ لحظہ اور دائمی طور پر پوری کائنات میں پہنچ رہا ہے اور وہ اُس کی قیوم کی صفت اور قدرت سے برقرار ہے۔ ممکنات کی اللہ تعالیٰ کی طرف یہ احتیاج ختم نہیں ہوتی بلکہ انہیں ہمیشہ ضرورت لاحق رہتی ہے۔ یہ فیض مسلسل اور متواتر برقرار ہے۔ کائنات کی تکوینی حرکات وسکنات کا تسلسل واستمرار کے ساتھ باقی رہنا اللہ ’’قیوم‘‘ کی صفت کا تقاضا ہے۔ پس یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے زیرسایہ اور اِس کی متواتر دائمی عنایات کے ذریعے قائم ہوئی ہے۔ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

کل شیءٍ خاضع له وکل شیءٍ قائم به. (۲)

---

(۱) ابن منظور، لسان العرب، ۴:۱۷۷

(۲) نہج البلاغہ، شرح ابن الحدید: ۴۱۷

’’تمام کائنات اپنے خدائے مالک کی بارگاہ میں سرِ تعظیم جھکائے ہوئے ہے اور اِس جہانِ ہستی کی ہر چیز اُس کے دائمی فیضان اور مسلسل نظرِ کرم کے صدقے قائم اور زندہ ہے۔‘‘

یا حیّ یا قیّوم کا ورد ہر درد کی دوا ہے

مقبولانِ بارگاہِ الٰہی ہر مقام پر اُس کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور ہر لمحہ اُس سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یوں وہ اِس کے نام کے وسیلے سے اِس کی عناياتِ کریمانہ کو اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عظیم مفسرِ قرآن علامہ اِسماعیل حنفی حقیؒ لکھتے ہیں:

قال علی رضی اللہ عنہ: لما کان یوم بدر جئت انظر ما یصنع النبيّ فإذا ھو ساجد یقول: ’’یا حيّ یا قیوم‘‘ فترددت مرات وھو علی حالہ لا یزید علی ذالک إلی أن فتح اللہ لہ. (۱)

’’حضرت سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔ غزوہ بدر کے دن میں یہ دیکھنے کے لئے آیا کہ حضور نبی اکرم ﷺ اس سنگین اور وحشت انگیز کیفیت اور طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں کیا تدبیر کر رہے ہیں تب میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے سر سجدے میں رکھا ہوا ہے اور مسلسل ’’یا حيی یا قیوم‘‘ پکار رہے ہیں۔ میں کئی بار گیا اور واپس آیا لیکن آپ ﷺ نے اُسی طرح سر سجدے میں رکھا ہوا تھا اور ’’یا حيی یا قیوم‘‘ کے علاوہ اور کچھ نہ کہتے تھے۔ آپ ﷺ اِس ذکرِ مبارک کو بار بار دہراتے رہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو غزوہ بدر میں فتح و نصرت عطا فرما دی۔‘‘

اس لئے اہل اللہ نے کہا ہے کہ یا حیّ یا قیّوم کا ورد ہر مشکل کی کنجی ہے اور

(۱) اسماعیل حقی، روح البیان، ۱: ۲۷۱

دینی و دنیاوی پریشانیوں کا اس میں علاج پوشیدہ ہے۔

یا حيُّ یا قیُّوم کا وردِ سنتِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور نبی اکرم ﷺ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ ﷺ پڑھا کرتے:

یا حيُّ یا قیُّوم برحمتک أستغیث. (۱)

’’اے زندہ اور قائم رکھنے والے میں تیری رحمت کے ساتھ مدد طلب کرتا ہوں۔‘‘

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ یہ پڑھا کرتے تھے:

یا حيُّ یا قیُّوم حین لا حي یا محي یا ممیت یا ذا الجلال والاکرام.

’’اے زندہ اے سب کو سنبھالنے والے توانا جب کوئی زندہ نہ رہے گا اس وقت تو ہی زندہ ہوگا اے زندہ کرنے والے اے مارنے والے اے جلال اور انعام والے۔‘‘

اہل اللہ کا کہنا ہے کہ جو شخص کثرت سے الحیّ القیوم کا ورد رکھے گا وہ ان شاء اللہ کبھی بیمار نہ ہوگا نیز جو آدمی اس اسم ’’الحیّ القیوم‘‘ کو چینی کے برتن پر کستوری اور گلاب سے لکھ کر شیریں پانی سے دھو کر پیے گا یا کسی دوسرے بیمار کو پلائے گا اسے شفائے کاملہ نصیب ہوگی۔ اس کا کثرت سے ورد رکھنے والا لوگوں میں عزت و نیک نام پائے گا اور جو آدمی صبح کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک یا حیّ یا قیوم کا ورد پکا کرے گا اس کی سستی و کاہلی اور غفلت و لاپرواہی دور ہو جائے گی۔

(۱) ترمذی، السنن، کتاب الدعوات، باب منه، ۵: ۵۳۹، رقم: ۳۵۲۴

صفتِ قیوم اور مسئلہ جبر و قدر

اللہ تعالیٰ کی صفت قیوم میں مسئلہ جبر و اختیار کی حقیقت ''امر بین الامرین'' بھی نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اِنسان نہ تو اپنے اعمال و افعال میں مجبور و بے اختیار ہے اور نہ ہی مکمل طور پر مختار ہے، بلکہ اپنے تمام اُمور میں وہ بین بین یعنی بعض میں مجبور اور بعض میں مختار ہے۔ مطلق اختیار اپنے حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے کہ اِس کا ارادہ و اختیار اُس کی ذات سے قائم ہے اور وہ کسی شے یا کسی اِنسان کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اللہ ہی ایسی ذات ہے کہ جو کچھ چاہے اُسے پوری آزادی اور اختیار کے ساتھ عمل میں لا سکتا ہے اور جس شے کے بارے میں جو ارادہ کرے عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اِس لئے کہ وہ بلا قید و شرط مختار اور صاحبِ ارادہ ہے۔ اِس جہان ہستی میں کوئی بھی اِس طرح کی آزادی اور اختیار کا مالک نہیں ہے اور ''قیوم'' کہتے ہی اُسے ہیں جو اپنے تمام صفاتِ کمال میں بذاتِ خود قائم ہو اور کسی غیر کی طرف معمولی سی احتیاج بھی نہ رکھے۔ اِس مرید و مختار ربِ کائنات نے اپنی حکیمانہ مشیت اور عالمانہ قضا کے ساتھ ارادہ فرمایا تو اِس جہانِ ہست و بود کو پیدا فرما دیا اور گوناگوں ذمہ داریاں اِن کے سپرد کر دیں۔ اِس جہانِ ہستی میں بیشتر موجودات ایسی ہیں جو اپنے سپرد کئے گئے کاموں میں مجبور ہیں اور از خود معمولی سا ارادہ و اختیار بھی نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ کے جبر تکوینی نے اِن کے کام معین فرما دیئے اور ہر ایک کو اپنا کام انجام دینے پر لگا دیا۔ کرۂ ارض بالجبر چکر لگا رہا ہے، زمین کی کشش بالجبر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ سمندروں اور دریاؤں کا پانی بالجبر سورج کی شعاعوں سے بخارات میں بدل جاتا ہے۔ تمام تکوینی قوانین و ضوابط بالجبر جاری ہو رہے ہیں اور کوئی موجود اِن تکوینی فرائض کی بجا آوری سے انحراف اور سرکشی کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اِس کائنات میں صرف ایک اِنسان ہے کہ جسے اختیار سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اِنسان بذاتِ خود قائم نہیں بلکہ اِس کا وجود اور اِس کا اختیار و ارادہ ہر دو اللہ تعالیٰ کے ذریعے قائم ہیں اور یہ ہرگز مختارِ مطلق نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کی مشیت اور آزادی کو اپنی مشیت سے وابستہ کیا ہے۔ نیکی و بدی کے انجام دینے میں جو وہ

اپنے اختیار و ارادہ کے ساتھ کام کر لیتا ہے یہ قدرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کو اپنے ارادہ و مشیت کے ساتھ اُس کی اطاعت میں اِستعمال کرتا ہے یا اُس کی مخالفت میں صرف کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ’’اللہ تعالیٰ کی صفت قیوم کے پیش نظر یہ سارا جہانِ ہستی اللہ تعالیٰ سے موجود اور قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِنسان آزاد پیدا فرمایا اور وہ اپنے اچھے یا برے افعال و اعمال میں مجبور نہیں ہے بلکہ اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتا ہے لیکن اِنسان اپنے اصل وجود اور اس کی ساری طاقتیں اُس ذات قیوم کے ساتھ قائم ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان اپنے عمل میں آزادی مطلق کا مالک نہیں۔ ایک ایسی آزادی رکھتا ہے جو جبر مطلق اور اختیار مطلق کے بین بین ہے۔ آیت الکرسی اِنسانوں کو متوجہ کرتی ہے کہ وہی خدا بندگی کے لائق ہے جو قیوم ہے۔ یہ جہانِ ہستی اِس کے متواتر اور دائمی فیض کے ذریعے قائم ہے۔ ایسے موجودات جو خود محتاج اور اُس قیوم کی عنایت و کرم کے نیاز مند ہیں وہ ہرگز معبود نہیں ہو سکتے۔ ہم یہاں ایمان بالقدر پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع ’’ایمان بالقدر‘‘ ہے۔

’’القدر‘‘ قدر بقدر قدراً سے مصدر ہے جس کے لفظی معنی اندازہ لگانے، پیدا کرنے، لکھنے یا توانا ہونے کے ہیں، لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ ذاتی ارادہ ہے، جو مختلف حقائق کائنات کے تعلق میں اپنے اپنے مقررہ اوقات پر ظاہر ہوتا ہے۔(۱)

خداوند تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کے بے پناہ خزانے ہیں، مگر ان خزانوں کو ایک خاص اندازے سے نازل کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔(۲)

(۱) دستور العلماء، ۳:۷۳، مطبوعہ حیدر آباد دکن

(۲) الحجر، ۱۵: ۲۱

’’ہر چیز کے ہمارے پاس بے شمار خزانے ہیں، مگر ہم اُنہیں ایک مقررہ اندازے سے ہی نازل کرتے ہیں۔‘‘

اِسی مسئلے کا نام مسئلہ تقدیر یا مسئلہ قضا و قدر ہے۔

جو ارکانِ ایمان میں سے آخری مگر انتہائی مہتم بالشان رکن ہے مگر انتہائی مہتم بالشان جزو ہے، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلے کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اوہام و وساوس پائے جاتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس یہاں رُک جاؤ، شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔ اس سے آگے نہ سوچو۔[۱]

مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پیچیدہ اور نازک مسئلے میں خواہ مخواہ اُلجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ انسانی عقل و دانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث و تمحیص میں حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہی ہوسکتا ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ’’انسان کے مجبور یا مختار‘‘ ہونے کا مسئلہ صرف مذہبی فلسفے کا ہی موضوع بحث نہیں رہا، بلکہ یہ دُنیا بھر کے فلاسفہ، مفکرین اور علماء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ نفسیات، جرمیات، عمرانیات اور دیگر مختلف فلسفوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل مباحث ملتے ہیں۔ جنہیں مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے اپنے فکر اور

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبلیس وجنوده، ۳: ۱۱۹۴، رقم: ۳۱۰۲

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الإیمان، باب بیان الوسوسة في الإیمان، ۱: ۱۲۰، رقم: ۱۳۴

اپنے اپنے علم سے فروغ بخشتا ہے۔ پھر یہ زبان، ادب اور شاعری کا بھی موضوع رہا ہے۔ اس بنا پر اس مسئلے میں قسم قسم کی آراء ملتی ہیں۔ اسی لئے اس کے اثرات خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔

(الف) خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق

اس سلسلے میں قرآن کریم تقدیر کے جس کلیے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اور اس کے جملہ اعمال کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ○[1]

’’حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے○‘‘

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر یاد رہے کہ تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں، کسب (اسی سے اکتساب بروزن افتعال ہے) کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں۔ جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے والا) ہے، مگر ان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ انسان اور اُس کی تمام تر اشیاء و اعمال مخلوقِ محض ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ دُنیا کی ہر چیز کے خالق و باری ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصورات رہ جاتے ہیں، اوّل خداوند تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصوّر اور دوم انسان اور اُس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور۔ خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق۔

خدا اور اُس کی ذات وصفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنٰی و اعلیٰ چیز مخلوق ہے، اس لئے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال و افعال بھی مخلوق ہیں۔

(۱) الصافات، ۳۷: ۹۶

جن کی من حیث المخلوق، تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے، مگر کسب و ارتکاب انسان اپنی رضا ورغبت سے کرتا ہے۔ اس لئے اب اس سوال کا جواب کہ انسان کی اپنے افعال کی طرف کیا نسبت ہو گی۔ قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں، بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○(۱)

’’ہاں جو برے کام کرے اور اس کے گناہ ہر طرف اسے گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے○‘‘

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔(۲)

’’اگر اس نے نیک کام کئے تو اسی کو فائدہ پہنچے گا اور اگر برے کام کئے تو اسی کو اس کا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔‘‘

جس طرح کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی، انسان ہے یا حیوان، جن ہے یا فرشتہ، سیارہ ہے یا ستارہ، زمین ہے یا کوئی اور خطہ، سمندر ہے یا خشکی، جمادات میں سے ہے یا حیوانات سے، مادہ ہے یا توانائی، کوئی خارجی وجود ہے یا ذہنی تصوّر، کوئی عملی حقیقت ہے یا فکری تخلیق، ہر چیز اپنے وجود میں خدا تعالیٰ کی صفتِ خلّاقیت وصنّاعی کی آئینہ دار اور اپنے ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے اور اس کا خالق صرف اللہ ہے، اسی طرح انسان جو بھی عمل کرتا ہے۔ مثلاً اس کا گفتگو کرنا، اس کا آرام کرنا، اس کا کھیلنا کودنا، اس کا حوائجِ ضروریہ کی تکمیل کرنا، اس کا اُٹھنا بیٹھنا، اس کا چلنا پھرنا، آنا جانا اس کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے اور ہر فعل

(۱) البقرہ، ۲: ۸۱

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۸۶

ایک وجود ہونے کے اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیونکہ فعل بھی انسان ہی کی طرح انفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت بہر حال انسان کی طرف ہی ہو گی، جیسے کہ مذکورہ بالا آیت میں الفاظ ''وَمَا تَعْمَلُوْنَ'' (اور جو تم عمل کرتے ہو) میں فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عائد کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے، مگر اس کے پہلو دو ہیں۔ ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور دوسرے کے اعتبار سے انسان کا مکسوب۔ اس تصور کو سمجھنے کے لئے بچے کے تخلیق کے عمل ہی کو لیجئے: ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پیدائش کے لئے ''امرِ ایزدی'' کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کتنے ہی جوڑے ایسے ہیں کہ برسہا برس گزر جانے کے باوجود ان کے دامن بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بنیادی عمل دخل ''رشتۂ ازدواج'' کا ہی ہوتا ہے۔ گویا کسباً تو بچے کو وجود والدین کے دم قدم سے ملا لیکن خلقاً یہ خدا تعالیٰ کی عطا کا مرہون منت ہے۔

اسی لئے قرآن کریم میں ایسے ''جوڑوں'' کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے جو اولاد کی نعمت کو اپنی طرف یا کسی اور سفلی ذریعے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

فَلَمَّا اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَا اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○ (۱)

''پس جب خدا تعالیٰ نے ان کو صحیح و سالم بچہ عطا کر دیا تو وہ اس کے خلق میں شریک ٹھہرانے لگے، حالانکہ اللہ تعالیٰ شریک کئے جانے سے بلند و بالا ہے۔''

حالانکہ اولاد کی نعمت عطا کرنا، یا اس سے محروم رکھنا اور اسی طرح دیگر انسانی حاجات کی تکمیل کرنا خالصتاً اللہ رب العزت کا فعل ہے۔ اسی طرح ہر انسانی عمل اپنے

(۱) الاعراف، ۷: ۱۹۰

کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے۔ مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالیٰ کے حکم ''کن'' کا دستِ نگر ہے۔

کیا مخلوق ہونے کے لئے دیکھا جانا ضروری ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی عمل دیکھنے میں تو انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے، اسے انسانی کسب سے الگ ایک مخلوق کس طرح مان لیا جائے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مخلوق کے لئے الگ طور پر قابلِ دید ہونا بھی ضروری ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق، بحیثیت ایک مخلوق کے، ہر ایک کے لئے مرئی نہیں ہوا کرتی۔ قرآن کریم میں قسم کھا کر یہ کہا گیا ہے:

فَلَا اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ○ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ○(۱)

''قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو○ اور جن کو تم نہیں دیکھ سکتے○''

سائنس بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دُنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آ سکتیں۔ مثلاً اس کمرے میں ٹنوں کے حساب سے ہوا موجود ہے۔ مگر یہ ہوا انسانی آنکھ یا خوردبین کے ذریعے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اسی طرح انسانی آواز مخلوق ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے کان بند کر لئے جائیں تو آنکھوں اور دوسرے حواس کی مدد سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی چیز کا مرئی ہونا (یعنی دکھائی دینا) اس وقت ضروری ہے، جبکہ اس کا طبعی وجود کثیف ہو اور دوم یہ کہ اس کی محسوس اور معلوم کرنے والی خاص حس اپنی صحیح حالت میں ہو۔ جو اشیاء غیر حسی ہوں یا ان کو محسوس کرنے والے حواس میں نقص ہو تو ایسی صورت میں کوئی چیز خارج میں پائے جانے کے باوجود محسوس نہیں کی جا سکتی۔

خود انسان حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے اس لئے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے

(۱) الحاقه، ۶۹: ۳۸

دیکھا جا سکتا ہے، مگر اس کا عمل بذاتِ خود ایک لطیف وجود ہے، لہٰذا اس کے اثرات و نتائج کا تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء کو تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر ان اعضاء و جوارح اور اثرات و نتائج سے قطع نظر فی نفسہٖ عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحم اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں، لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی مامتا، باپ کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں، ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دے سکتا، یعنی اُنہیں دیکھنے کے لئے کسی رحم دل شخص کے عمل اور کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی ظرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بخل، حرص اور تکبر وغیرہ جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ گویا اوصاف کے وجود کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے ظہور کے لئے کسی مظہر کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے پائے جانے کا انکار ممکن نہیں مگر انہیں سمجھنے کے لئے کوئی ذریعہ چاہیے۔ جو شے خود ایک لطیف یا غیر حسی وجود رکھتی ہو اسے معلوم کرنے کے لئے اس کا اتصال کسی حسی اور کثیف حقیقت سے ہونا ضروری ہے۔ جیسے جان جسم کے بغیر دکھائی نہیں دیتی، اسی طرح عمل، کسی عامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ لہٰذا عامل کو، عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا کاسب تصوّر کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے عمل کو فی نفسہٖ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے

قرآن کریم یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوقِ خدا ہے، لیکن صدور اور ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے اور کسب و ارتکاب چونکہ آزادانہ ہے اس لئے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیونکہ جزا و سزا کا تعلق کسبِ اعمال سے ہوتا ہے نہ کہ خلقِ اعمال سے۔ اسی بنا پر سورۃ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (۱)

(۱) الملک، ۶۷: ۲

”اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔“

موت و حیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے، خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا رہینِ منت ہے۔ زندگی، اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالمِ آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا۔ دُنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون برے۔ اسی تصور کو قرآن کریم دوسری جگہ واضح کرتا ہے:

وَمَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ. (۱)

”اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔“

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِکَ. (۲)

”تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔“

گویا نعمت کے حصول میں تو خدا تعالیٰ کا لطف و کرم شامل ہوتا ہے، مگر مصیبت کے وقوع میں خالصتاً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے، اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت ہوتی من جانب اللہ ہے۔ لیکن ادب بندگی یہی ہے جس کی اوپر تعلیم دی جا رہی ہے۔ یعنی انسان دنیا میں جن نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے وہ سب اس کے اپنے اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔

---

(۱) الشوریٰ، ۴۲: ۳۰

(۲) النساء، ۴: ۷۹

یہ تو انفرادی شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی مصیبتوں کا ذکر تھا، دوسری جگہ اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج قرار دیا گیا۔ ارشاد فرمایا گیا:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا.(۱)

”خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ چکھائے۔“

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود گو من جانب اللہ ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی اس لئے کہ اللہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب وارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ پھر ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایتِ ربّانی کے ذریعے اس عمل کے نتائج وعواقب سے بھی انسان کو باخبر کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے فتنہ وشر اور بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اپنے اعمال کی جزا وسزا کا ذمہ دار کیوں نہ ٹھہرایا جائے؟

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس تفصیل سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسان سے اگر مؤاخذہ ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ بقائمی ہوش وحواس، اپنی مرضی اور اپنے ارادہ واختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے سود ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو انسان کو کیوں لائقِ تعزیر گردانا جاتا ہے؟ انسان کو بلاوجہ نہیں پکڑا جاتا، اس کی گرفت اس کے سبب

(۱) الروم، ۳۰: ۴۱

واختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی غلط فہمی مشرکین مکہ میں بھی موجود تھی چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ.(۱)

"اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام نہ ٹھہراسکتے۔"

مگر اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہوسکتا، برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے اور اسی غرض کے لئے ہے کہ اکتساب کے حوالے سے لوگوں سے اچھے اور برے کا امتیاز پیدا ہوسکے۔

خدائی فعل "خلق" کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق کیا اور انسان کو بھی پیدا کر کے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال چاہے اپنے لئے منتخب کر لے۔ اس لئے انسان اپنے اختیار سے اعمال کا جو چناؤ کرے گا اور جس قسم کے اعمال کو اپنے کسب وارتکاب کے لیے مختص کرے گا وہ اسی طرح کی جزا یا سزا کا مستوجب ہوگا۔ اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے، دن کے ساتھ رات، آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، خیر کے ساتھ شر، حق کے ساتھ باطل، صدق کے ساتھ کذب، رحم کے ساتھ ظلم، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ۔ اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنانے کی ذمہ داری سے برأت کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اگر خدا تعالیٰ نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا تو اس لئے نہیں کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہوجانے کے بعد، وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا باعث خدا تعالیٰ کا دھوپ کو پیدا کرنا ہے؟ اس صورت میں اس کے اس قول پر کون شخص

(۱) الانعام، ۶: ۱۴۸

یقین کرے گا؟ اُلٹا ہر کوئی اسی کو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لئے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردیوں میں دھوپ دونوں کی راحت میسر آسکے۔ دھوپ کی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلا مقصد برہنہ سر یا برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں چلے پھرے اور خواہ مخواہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے اگر خود انسان نے اس کا استعمال غلط طریقے پر کیا تو اس سے تخلیق کا کیا قصور ثابت ہوا۔

(ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں ایک مسئلہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا بھی ہے کہ آیا انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھا جائے یا مجبورِ محض۔

تاریخِ اسلام میں ایسے متعدد فرقوں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ انسان مکمل طور پر مجبور ہے اور وہ ایک تنکے کو بھی اپنی مرضی سے ہلانے کا اختیار نہیں رکھتا، جبکہ ان کے بالمقابل بعض ایسے لوگ بھی تھے جو انسان کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن و سنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ ''بین القدر والجبر'' ہے۔

اس ضمن میں حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتًا ایسا مختار ہے کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو اور نہ ایسا مجبور کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت ''بین القدر والجبر'' ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار و ارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس مسئلے کی بابت استفسار کیا تو آپ نے سائل سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اُوپر اٹھاؤ، اس نے اٹھالی، پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھاؤ، اس نے عرض کیا: یہ تو ناممکن ہے فرمایا کہ پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی اور

دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے۔ یعنی اس کا اپنا توازن اسے اختیار کی ایک خاص حد سے آگے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

بین القدر والجبر کا مفہوم

بین القدر والجبر کے تصوّر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

۱۔ فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کش مکش پیدا ہوتی ہے یعنی اس کا فرض اور اس کی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے، ان کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسے افعال پر گرفت ہوتی ہے۔ عملاً اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ میں سوئی چبھونا چاہے اور اس کے خوف سے آپ کی پلکیں اضطراری طور پر بند ہو جائیں تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابلِ مواخذہ نہیں، لیکن اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی فعل ناحق کے لئے حرکت کریں تو یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پر گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

بہرحال اولاً ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی اور دوسری طرف خدا کے حکم نہی کا بھی خیال آ گیا۔ نتیجتاً دونوں خیالات اُبھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہوگئی۔ اسی لئے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو ''کشمکش کا مرحلہ'' کہا گیا ہے۔

۲۔ غور و خوض کا مرحلہ

اس کے بعد غور و خوض کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج یعنی فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتا ہے، وہ خدائی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی، اس طرح فعل کا ذہنی وجود کشمکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غور و خوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمکش اور غور و خوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری اور پابندی (Coersion & Compulsion) کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

۳۔ انتخابِ نیت کا مرحلہ

اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے اور پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کا مرتکب ہو یا برائی کا، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر اور فرض کی پیروی کرے یا خواہشِ نفس کی، اسی ذہنی فیصلے کو ''انتخاب نیت'' کہتے ہیں۔ یہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے، آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیے کہ کیا ان تینوں مرحلوں میں کسی اعلیٰ قوت نے انسان کو مجبور کیا؟ اسے خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور و خوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا؟ ہرگز نہیں، یہ تو خالصتاً ذہنی قلبی اور داخلی عمل تھا۔ آپ نے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے دیکھا اور پرکھا، ایک کشمکش اور ذہنی تصادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ و بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچے۔ یہاں تک عمل مکمل طور پر آزاد ہے۔

۴۔ عزم و ارادے کا مرحلہ

اس کے بعد عزم و ارادے کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے

یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ذہنی طور پر کمربستہ ہو جاتے ہیں یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیشِ نظر رہے کہ نیت، ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمربستہ ہوجانے کا نام ہے۔ گویا ارادہ، نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے، نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ مؤخر، لہٰذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔

۵۔ تعمیل کا مرحلہ

اس کے بعد پانچواں مرحلہ ارادے کی تعمیل کا آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان عملی قدم اٹھاتا ہے۔ عملی تدبیر کیلئے سرگرم ہوجاتا ہے۔ اگر آپ نے بالفرض کسی دشمن کو مارنے کا ارادہ کرلیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہوگا۔ لہٰذا تعمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

۶۔ نتیجۂ عمل کا مرحلہ

جب ارادے کی تکمیل ہوچکی تو اب اس عمل کے نتیجے کے برآمد ہونے کا مرحلہ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار استعمال کرنے سے وہ شخص مرجائے یا زخمی ہوجائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلۂ تعمیل کے تابع ہے جبکہ مرحلۂ تعمیل خود عزم و ارادے کے تابع ہے اور انتخابِ نیت کا مرحلہ خود کسی شے کے تابع نہیں، کیونکہ وہ محض غور وخوض کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

یہ ہیں چھ مراحل جن سے کوئی عمل گزر کر اپنے نتیجے کے مرحلے تک پہنچتا ہے۔ بتائیے ان مراحل میں سے وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں آپ پر کوئی خارجی دباؤ موجود تھا؟ ذہنی کشمکش سے لے کر نتیجۂ عمل تک آپ خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے اسی اقدام کا نام ”کسبِ عمل“ ہے۔

بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل کے چھ مرحلے دو حصّوں میں منقسم ہیں۔

پہلا حصہ ذہنی کشمکش سے شروع ہو کر انتخابِ نیت کا تھا، جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہو کر نتیجۂ عمل تک محیط تھا۔ ان میں سے پہلے حصے میں آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے لیکن دوسرے حصے میں خود اپنے انتخابِ نیت کا پابند۔ لیکن یہ مجبوری کیسی؟ خود اپنی سوچ اور نیت کی مجبوری۔ اسی لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إنّما الأعمال بالنّیات. (۱)

’’اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔‘‘

مزید فرمایا:

إنّ اللہ لا ینظر إلی صورکم و أموالکم ولکن ینظر إلی قلوبکم و أعمالکم. (۲)

’’بلا شبہ اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتا ہے۔‘‘

گویا اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت اور اس کے تحت ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسی نیت ہوگی ویسی ہی جزائے عمل ہوگی اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَ مَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِہٖ مُہَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ یُدۡرِکۡہُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ. (۳)

’’اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی نیت سے اپنے گھر بار سے ہجرت

(۱) بخاری، الصحیح، باب بدء الوحی، ۱: ۳، رقم: ۱
(۲) مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم الظلم وخذلہ، ۴: ۱۹۸۷، رقم: ۲۵۶۴
(۳) النساء، ۴: ۱۰۰

کے لئے نکلے، پھر راستے میں اسے موت آ لے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا اجر ثابت ہو گیا (یعنی اسے پورے عمل کی جزا عطا کی جائے گی)۔‘‘

کیونکہ خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں؟ بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتساب عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔

قرآن و حدیث میں اسی بنا پر نیت کے اخلاص اور اس کی درستگی پر زور دیا گیا ہے اور اسی پر ہی تمام فوائد و ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لئے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر باشعور اور بااختیار ہوتا ہے۔ اسے دونوں راستوں میں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ اسی آزادی کی بنا پر وہ ’’شخص‘‘ ’’بااختیار‘‘ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے اسی اختیار کے باعث اس سے جواب طلبی اور مواخذہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بقیہ تمام مراحلِ عمل اس کی آزادانہ منتخب شدہ نیت کے تابع ہوتے ہیں۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباؤ تو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم و ارادے کے مرحلے (چوتھے مرحلے) پر ہوتا ہے۔ کیونکہ عزم و ارادہ اُصولی طور پر تو انتخابِ نیت کے تابع ہوتا ہے لیکن کسی مجبوری کے باعث یہ ارادۂ نیت (ذہنی طلب اور قلبی فیصلے) کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو یہ فعل ’’جبر و اکراہ‘‘ کہلاتا ہے اور جبر و اکراہ حالت اضطرار (Extreme Necessity) تک پہنچ جائے تو انسان سے اخلاقی و قانونی ذمہ داری اور جوابدہی مرتفع ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔

لہٰذا یہ حالت ’’استثنیٰ‘‘ (Exception) کی ہو گئی مگر اُصول و کلیہ وہی رہا کہ ہر شخص اپنے آزادانہ انتخابِ نیت کے باعث پابندِ جزا و سزا ہے۔

اس موضوع پر عقائد اسلامی کی کتاب ’’شرح عقائد النسفی‘‘ میں بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کے چند ضروری مقامات حسب ذیل ہیں۔ علامہ تفتازانیؒ فرماتے ہیں:

وللعباد أفعال إختيارية يثابون بها إن كانت طاعة ويعاقبون عليها إن كانت معصية لا كما زعمت الجبرية أنّه لا فعل للعبد أصلا و أن حركاته بمنزلة حركات الجمادات لا قدرة عليها ولا قصد ولا اختيار وهذا باطل لأنّا نفرق بالضرورة بين حركة البطش و حركة الإرتعاش ونعلم أنّ الأوّل باختياره دون الثانى ولأنّه لو لم يكن للعبد فعل أصلا لما صح تكليفه، ولا يترتب استحقاق الثواب والعقاب على إفعاله ولا اسناد الافعال التى تقتضى سابقية القصد والإختيار إليه على سبيل الحقيقة مثل صلّى وكتب وصام بخلاف مثل طال الغلام وأسود لونه. أنّ الله خالق والعبد كاسب وتحقيقه أن صرف العبد قدرته وإرادته إلى الفعل كسب وإيجاد الله تعالىٰ الفعل عقيب ذالک خلق والمقدور الواحد داخل تحت القدرتين لكن بجهتين مختلفتين فالفعل مقدور الله تعالى بجهة الإيجاد ومقدور العبد بجهة الكسب كالأرض تكون ملكا لله تعالى بجهة التخليق وللعباد بجهة ثبوت التّصرف.(۱)

’’اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے اس بنا پر اگر یہ افعال

(۱) تفتازانی، شرح عقائد النسفی: ۶۴-۶۶

طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت پر مبنی ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقیہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں اس کی حرکات و سکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار، جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا احکام الٰہی کا مکلّف ٹھہرایا جانا اور اس کا ثواب و عذاب کا مستحق ہونا، نیز افعال کا اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ان افعال میں حرکت سے پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی، اس نے لکھا جو اشیاء اس کی قدرت سے باہر ہیں، ان کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا جبکہ لڑکا بڑا ہو گیا یا اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا، افعال کی نسبت بندے کی طرف نہیں کی جاتی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت صرف کرتا ہے، لہٰذا یہ کسب ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی کوشش کے بعد اس فعل کو موجود کر دیتا ہے یہ خلق ہے، ایک ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے۔ مگر اپنے کسب کے اعتبار سے بندے کا۔ جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور ثبوتِ تصرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں۔''

علامہ تفتازانیؒ کی اس بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے فعلِ خلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے لیکن عملی طور پر بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

انسان کے مجبور یا مختار ہونے، نیز انسان کے ''اپنے افعال کے کاسب ہونے'' پر گذشتہ باب میں تفصیل سے اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے۔ مگر خالق خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ نیز یہ کہ انسان کو کسبِ اعمال میں اختیار اور ارادے کی آزادی بھی حاصل ہے۔

اس بحث سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ رب العزت کی طرف سے اختیار کی جو دولت عطا کی گئی ہے اس کا پس منظر اور سبب کیا ہے۔ انسان کو آخر مختار کیوں بنایا گیا؟ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ایک جامع ارشاد ہے:

اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ○ (۱)

''تم جو چاہو کرتے رہو وہ (اللہ) تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے○''

اس آیت مبارکہ کے تین الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو مسئلہ تقدیر کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آجاتے ہیں اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک وشبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اِعملوا:۔ (تم عمل کرو) لفظ اعملوا میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے کسب میں مختار ہے۔ اچھے یا برے عمل کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔ وہ جس قسم کے اعمال چاہے کرے اور جس قسم کے اعمال سے چاہے احتراز کرے۔ اس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ ما شئتم:۔ (جو تم چاہو) ''اعملوا'' کے لفظ سے عملی آزادی اور خود مختاری کا اظہار ہوتا ہے۔ جبکہ ''ما شئتم'' سے فکری، ذہنی اور قلبی آزادی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی پسند اور نیت کے انتخاب میں بھی جس قسم کی روش چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ نہ

(۱) حم السجدہ، ۴۱: ۴

سوچ میں پابند اور مقید ہے اور نہ عمل و کردار میں۔

۳۔ **إنّه بما تعملون بصیر**: اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جملہ اعمال و افعال کو ذاتِ باری دیکھ رہی ہے تاکہ اسے جزا و سزا بھی دی جا سکے۔ اسے اگرچہ نظری، فکری اور عملی اعتبار سے آزادی اور خود مختاری دی گئی ہے، مگر اس آزادی کے عطا کیے جانے کا مقصد اسے شترِ بے مہار کر دینا نہیں، بلکہ اسے یہ احساس دلانا ہے کہ ہر عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائیگا اور اُسے اپنی صوابدید کے مطابق کیے ہوئے اعمال پر بارگاہِ ایزدی میں جوابدہ ہونا ہوگا۔ قرآن حکیم کے مطالعے روشنی میں انسان کو آزادی دیئے جانے کے جو مقاصد بیان کئے جا سکتے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل

اللہ تعالیٰ کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے اس کارخانۂ قدرت کو قانونِ عدل پر ہی قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف خود عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ سورہ المائدہ میں ارشاد ہے:

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔(۱)

”اور کسی قوم کی سخت دشمنی (بھی) تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم (اس سے) عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو (کہ) وہ پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے۔“

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔(۲)

(۱) المائدہ، ۵: ۸

(۲) النساء، ۴: ۵۸

’’اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔‘‘

عدل کی تعریف علماء لغت نے ان الفاظ میں کی ہے:

وضع الشيء علی محله۔[1]

’’کسی چیز کو اس کے صحیح ٹھکانے پر رکھنا۔‘‘

دوسرے لفظوں میں حقدار کو حق دینا، مستحق کو اس کا جائز مقام دینا، عدل ہے۔ جبکہ اس کے برعکس روش اختیار کرنا ظلم و جور ہے۔ قرآن کریم ہر حال اور ہر صورت میں عدل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواہ معاملہ اپنے کسی قریب ترین عزیز حتیٰ کہ ماں باپ کا ہو۔

چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ج اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔[2]

’’اے ایمان والو! تم انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے (محض) اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ خواہ (گواہی) خود تمہارے اپنے یا (تمہارے) والدین یا (تمہارے) رشتہ داروں کے ہی خلاف ہو اگرچہ (جس کے خلاف گواہی ہو) مالدار ہے یا محتاج، اللہ ان دونوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔ سو تم خواہش نفس کی پیروی نہ کیا کرو کہ عدل سے ہٹ جاؤ (گے)۔‘‘

دوسرے مقام پر عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

(۱) راغب اصفہانی، مفردات القرآن، بذیل مادہ عدل

(۲) النساء، ۴: ۱۳۵

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآیٔ ذِی الْقُرْبٰی۔ (۱)

”بے شک اللہ (ہر ایک کے ساتھ) عدل اور احسان کا حکم فرماتا ہے اور قرابت داروں کو دیتے رہنے کا۔“

عدل کا مقامِ رفیع ...... احسان

آیہ کریمہ میں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو سطورِ بالا میں بیان کیا جا چکا ہے۔ جبکہ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ حق دار کو اس کا حق دینا عدل ہے۔ اپنا حق کم لینا اور دوسرے کا حق زیادہ دینا احسان ہے۔ گویا احسن جود و فضل اور لطف و کرم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح نیکی کی زندگی کے دو مدارج بیان کئے گئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ نہ کسی کا حق کھاؤ نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو۔ لیکن یہ درجہ بے حد احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگر اس درجے سے ذرا بھی قدم لڑکھڑا جائے یعنی معمولی سا بھی افراط و تفریط ہو جائے تو انسان درجۂ ظلم پر پہنچ جاتا ہے اس لئے نیکی اور تقویٰ کے نقطۂ نظر سے ایک بلندتر درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ○ (۲)

”بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے○“

یہ ”مقامِ احسان“ ہے اس لئے فرمایا: اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر فائز رہو۔ حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تاکہ اگر کبھی مقامِ احسان سے اُترنا بھی چاہو تو مقامِ عدل پر تو فائز رہ سکو۔

(۱) النحل، ۱۶: ۹۰

(۲) البقرۃ، ۲: ۱۹۵

جو ذات اپنے بندوں کو ہر حال میں نظامِ عدل و احسان اپنانے کی تلقین کرے، جس کا اپنے بندوں سے یہ مطالبہ ہو کہ جب بھی اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق فیصلے کا موقع آئے، تو عدل و انصاف کے اُصولوں کے مطابق فیصلہ کرو۔ وہ ذات جب خود مسند عدالت پر متمکن ہو گی تو کیا اپنے بندوں کے متعلق عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھے گی؟ وہ ذات تو سراسر عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اللہ رب العزت کے انصاف کا ذکر کیا گیا ہے، سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًاط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا۔ (۱)

’’اور ہم قیامت کے دن عدل و انصاف کے ترازو رکھ دیں گے سو کسی جان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا (تو) ہم اسے (بھی) حاضر کر دیں گے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ○ (۲)

’’اور جس جان نے جو کچھ بھی (اعمال میں سے) کمایا ہوگا اسے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا○‘‘

ایک دوسرے مقام پر ’’روزِ محشر‘‘ کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق فردِ عمل دی جائے گی۔ مجرمین کو بائیں ہاتھ میں اور نیکوکاروں کو سیدھے ہاتھ میں:

اس موقع پر ارشاد ہوگا:

---

(۱) الأنبیاء ۲۱: ۴۷

(۲) آل عمران، ۳: ۲۵

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰکَ وَاَنَّ اللهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِo(۱)

’’یہ تیرے ان اعمال کے باعث ہے جو تیرے ہاتھ آگے بھیج چکے تھے اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہےo‘‘

اللہ تعالیٰ کی احسان پسندی

یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کی بجائے جہاں تک ہو سکے گا لطف وکرم اور فضل و احسان کا برتاؤ فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَاج وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَo(۲)

’’جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطورِ اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں اور جو کوئی ایک گناہ لائے گا تو اس کو اس جیسے ایک (گناہ) کے سوا سزا نہیں دی جائے گی اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گےo‘‘

ایک دوسرے مقام پر اس احسان پسندی کا یوں ذکر کیا گیا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَاج وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَo(۳)

’’جو شخص نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر (صلہ) ہے اور جو شخص برائی لے کر آئے گا تو برے کام کرنے والوں کو کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اسی قدر جو وہ کرتے رہے تھے۔‘‘

(۱) الحج، ۲۲: ۱۰

(۲) الانعام، ۶: ۱۶۰

(۳) القصص، ۲۸: ۸۴

جس خدا کا اپنے بندوں سے سلوک اور مہربانی کا یہ عالم ہو اس کے متعلق بھلا یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان کی اچھی یا بری تقدیر لکھ کر اسے مجبور کر دیا ہے۔ نیز اگر اس کے حق میں کوئی برائی لکھی جا چکی ہے تو اس کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً. (۱)

’’اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی امت بنا دیتا۔‘‘

نیز فرمایا:

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَo (۲)

’’پس اگر وہ (تمہیں مجبور کرنا) چاہتا تو یقیناً تم سب کو (پابندِ) ہدایت فرما دیتاo‘‘

مگر ایسی صورت میں جزا و سزا کا تصوّر بے معنی ہو کر رہ جاتا اور انسان کو کسی جگہ بھی اپنی مرضی چلانے کا اختیار باقی نہ رہتا۔ اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے انسان کو عملی آزادی مرحمت فرمائی اور فرمایا:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ۔

’’جو چاہو، عمل کرو۔‘‘

---

(۱) النحل، ۱۶: ۹۳

(۲) الانعام، ۶: ۱۴۹

یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے آزاد اور مختار ہونے کی عقلی دلیل ہے۔

جزا و سزا اور نظامِ عدل

یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خدا وند تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ادنیٰ درجے کا ظلم بھی گوارا نہیں کرتا۔

اسی سے نظامِ عدل کے ساتھ جزا وسزا کا تعلق بھی واضح ہو جا تا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ○(۱)

’’بس تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو کرتے رہے تھے ○‘‘

دوسرے مقام پر مزید واضح کیا گیا :

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ○(۲)

’’اور یہ کہ انسان کو (عدل میں) وہی کچھ ملے گا جس کی اُس نے کوشش کی ہو گی۔‘‘

ایک اور مقام پر اعلان ہوا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ.(۳)

’’اس نے جو نیکی کمائی اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس نے جو گناہ کمایا اس پر اس کا عذاب ہے۔‘‘

---

(۱) التحریم، ۶۶:۷

(۲) النجم، ۵۳:۳۹

(۳) البقرۃ، ۲:۲۸۶

جزا و سزا اور اتمامِ حجت

جزا و سزا کے لئے اللہ رب العزت کا ایک اٹل اُصول ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اتمام حجت نہ کر لے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۝ (۱)

''اور ہم ہرگز عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ ہم (اس قوم میں) کسی رسول کو بھیج لیں۝''

اس سلسلے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى. (۲)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بارِ (گناہ) نہ اٹھا سکے گا۔''

اسی بنا پر قیامت کے روز ہر شخص خود اپنی فکر میں مبتلا ہوگا۔ چنانچہ سورۂ عبس میں ارشاد فرمایا:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۙ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۝ (۳)

''اُس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا۝ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (بھی)۝ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے (بھی)۝ اس دن ہر شخص کو ایسی (پریشان کن) حالت لاحق ہو گی جو اسے (ہر دوسرے سے) بے پروا کر

---

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۱۵

(۲) الفاطر، ۳۵: ۱۸

(۳) عبس، ۸۰: ۳۴۔۳۷

دے گی o‘‘

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گا کہ اس کی جگہ اس کے تمام متوسلین اور مقربین کو پکڑ لیا جائے اور اس کی جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ سورۃ المعارج میں ارشاد فرمایا:

یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍۢ بِبَنِیْهِo وَصَاحِبَتِهٖ وَ اَخِیْهِo وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُؤْیْهِo وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ یُنْجِیْهِo(۱)

’’مجرم آرزو کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب (سے رہائی) کے بدلہ میں اپنے بیٹے دے دے o اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی (دے ڈالے)o اور اپنا (تمام) خاندان جو اُسے پناہ دیتا تھاo اور جتنے لوگ بھی زمین میں ہیں، سب کے سب (اپنی ذات کے لیے بدلہ کر دے)، پھر یہ (فدیہ) اُسے (اللہ کے عذاب سے) بچالے o‘‘

البتہ نیکوکار اور پرہیزگار لوگ اس کلیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لئے فرمایا:

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَo(۲)

’’سارے دوست و احباب اُس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیزگاروں کے (انہی کی دوستی اور ولایت کام آئے گی)o‘‘

بالفاظ دیگر اس روز سبھی پریشان اور متفکر ہوں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے وہ بزرگ و برتر بندے جو دنیا میں بھی دوسروں کی فکر میں غلطاں رہتے تھے اس دن بھی اپنے بجائے دوسروں کی فکر میں مبتلا ہوں گے اور اپنے اپنے درجے اور رتبے کے مطابق خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے منصب شفاعت پر سرفراز ہوں گے مگر ان کی شفاعت شفاعت صغریٰ ہو گی جبکہ سب سے بڑی شفاعت سرورِ کائنات ﷺ کی ہو گی۔

(۱) المعارج، ۷۰: ۱۱۔۱۴

(۲) الزخرف، ۴۳: ۶۷

بہر حال جب تک اتمام حجت نہ کر دیا جائے اقوام و ملل مبتلائے عذاب نہیں ہوتیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے:

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِکَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۝ (۱)

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم وہاں کے امراء اور خوشحال لوگوں کو (کوئی) حکم دیتے ہیں (تاکہ ان کے ذریعہ عوام اور غرباء بھی درست ہو جائیں) تو وہ اس (بستی) میں نافرمانی کرتے ہیں پس اس پر ہمارا فرمانِ (عذاب) واجب ہو جاتا ہے پھر ہم اس بستی کو بالکل ہی مسمار کر دیتے ہیں۝''

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی ضابطے اور کسی قانون کے بغیر کسی قوم کو ہلاک اور برباد کرنے کا اصول کارفرما نہیں بلکہ جس بستی اور اس قوم کی قیادت کی طرف (خواہ مذہبی قیادت ہو یا سیاسی یا اقتصادی) حکم نازل کرتا ہے انہیں اطاعت اور فرمانبرداری کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ وڈیرے نما لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ آخری حد کو بھی عبور کر جاتے ہیں تو پھر ان پر عذابِ خداوندی قہر بن کر ٹوٹ پڑتا ہے اور ان کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو قوم خود اپنی حالت بدلنا نہ چاہے، خدا تعالیٰ اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ اسی لئے سورۂ الرعد میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۲)

''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔''

---

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۱۶
(۲) الرعد، ۱۳: ۱۱

اتمام حجت کا مفہوم

اتمام حجت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوندتعالیٰ لوگوں کے سامنے اپنے احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کے انجام و عواقب کو واضح فرما دیتا ہے۔ انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ اطاعت کی صورت میں کیا صلہ اور خلاف ورزی کی صورت میں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی قوم راہ راست پر نہیں آتی تو پھر اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ اس پر اپنی گرفت مضبوط کرلیتا ہے۔ اسی لئے فرمایا:

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ (۱)

’’تاکہ (ان) پیغمبروں (کے آجانے) کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔‘‘

ذاتِ خداوندی انسان کی اس قدر سچی خیر خواہ ہے کہ اس پر عذاب نازل کرنے سے پہلے اس کو بار بار فہمائش کرتی ہے، محبت، پیار اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ سے اس کے گمراہی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنے کی سعی کرتی ہے۔ اُس ذات کا ارشادِ گرامی ہے:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَo (۲)

’’اور ہم ان کو یقیناً (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے قریب تر (دنیوی) عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے تاکہ وہ (کفر سے) باز آجائیںo‘‘

اُس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

(۱) النساء، ۴: ۱۶۵

(۲) السجدة، ۳۲: ۲۱

اخلاقی جدوجہد

اللہ رب العزت کی طرف سے انسان کو تیسرا تصور اخلاقی جدوجہد کا دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ الملک میں ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا.(۱)

”جس نے موت اور زندگی کو (اِس لیے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔“

یعنی اچھے اور برے عمل جانچنے کے لئے کائنات کا یہ سٹیج سجایا گیا، دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍo ثُمَّ رَدَدْنٰـہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَo اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍo(۲)

”بے شک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہےo پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیاo سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا (دائمی) اجر ہےo“

ایک اور مقام پر ہے:

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰھَاo فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَ تَقْوٰھَاo قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَاo وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَاo(۳)

(۱) الملک، ۶۷: ۲

(۲) التین، ۹۵: ۴-۶

(۳) الشمس، ۹۱: ۷-۱۰

’’اور انسانی جان کی قسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قسمo پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دیo بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشو و نما کی)o اور بے شک وہ شخص نامراد ہوگیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)o‘‘

ایک اور جگہ اس نکتے کی وضاحت یوں فرمائی:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَo(۱)

’’کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کما رکھی ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انہیں اُن لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے (کہ) اُن کی زندگی اور ان کی موت برابر ہو جائے۔ جو دعویٰ (یہ کفّار) کر رہے ہیں نہایت برا ہےo‘‘

ان تمام آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو اخلاقی جدوجہد اپنانے کی تلقین فرماتا ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ انسان کو آزاد اور خودمختار گمان کیا جائے اور خداوند تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دے کہ وہ بیچارہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے نہ بدی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی صورت میں اس سے جو کوئی نیکی صادر ہوتی ہے یا برائی سرزد ہوتی ہے تو ایسی نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی ہرگز نہ کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ مجبور آدمی کی نہ نیکی اپنی ہوتی ہے اور نہ بدی۔

اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں

(۱) الجاثیہ، ۴۵: ۲۱

مضبوطی سے باندھ دیں اور اس کو پوری طرح بے بس اور بے دست و پا کرنے کے بعد اسے کہیں کہ وہ آپ کی کسی سابقہ غلطی کو معاف کر دے تو اس حالت میں کیا دنیا کی کوئی عدالت عفوو درگزر کو کوئی اہمیت دے سکتی ہے؟ عفو تو وہی معتبر ہے کہ متعلقہ شخص انتقام لینے یا معاف کرنے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے، معاف کر دے۔

گویا مجبوری کی حالت کو ''اضطرار'' تو کہہ سکتے ہیں، نیکی و بدی نہیں قرار دے سکتے۔ چنانچہ جب ہمارے دنیوی قوانین میں مجبوری اور اختیار میں اتنا فرق کیا جاتا ہے اور جبر واکراہ کی حالت میں کیا ہوا کوئی قول اور ارتکاب کیا ہوا کوئی جرم معتبر نہیں سمجھا جاتا تو اللہ تعالیٰ جس نے فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق تخلیقِ کائنات کے وقت سے یہ فیصلہ کر لیا تھا:

إنّ رحمتي سبقت غضبي.(۱)

''میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔''

اس سے کیونکر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ انسان کی اس بے بسی اور بے چارگی و مجبوری سے غلط فائدہ اٹھائے گا۔ حاشا و کلّا

حالتِ اضطرار اور قانونِ اسلامی

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حالتِ اضطرار میں شریعتِ اسلامیہ حلال اور حرام کی تفریق اٹھا لیتی ہے اور جان بچانے کی غرض سے مَیتہ اور خنزیر تک کے گوشت کو کھانے کی اِجازت دیتی ہے۔ چنانچہ سورۂ البقرہ میں ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ○(۲)

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب التوحید، باب وکان عرشه علی الماء، ۶: ۲۷۰۰، رقم: ۶۹۸۶

(۲) البقرہ، ۲: ۱۷۳

’’اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام کیا ہے، پھر جو شخص سخت مجبور ہو جائے نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہےo‘‘

اللہ تعالیٰ نے کتنا آفاقی، کائناتی اور عالمگیر تصور دیا ہے کہ حالتِ اضطرار میں حرام تک کو مباح قرار دے دیا، دوسرے مقام پر فرمایا:

وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ. (۱)

’’حالاں کہ اس نے تمہارے لیے ان (تمام) چیزوں کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، سوائے اس (صورت) کے کہ تم (محض جان بچانے کے لیے) ان (کے بقدرِ حاجت کھانے) کی طرف انتہائی مجبور ہو جاؤ۔‘‘

نیز فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِی مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌo (۲)

’’پھر اگر کوئی شخص بھوک (اور پیاس) کی شدت میں اضطراری (یعنی انتہائی مجبوری کی) حالت کو پہنچ جائے (اس شرط کے ساتھ) کہ گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو (یعنی حرام چیز گناہ کی رغبت کے باعث نہ کھائے) تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہےo‘‘

انہی وجوہ واسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِی الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. (۳)

---

(۱) الانعام، ۶: ۱۱۹

(۲) المائدہ، ۵: ۳

(۳) الحج، ۲۲: ۷۸

’’اور اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔‘‘

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا یُکَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا.(۱)

’’اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔‘‘

اور حضور سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

بعثت بالحنيفية السّمحة.(۲)

’’مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔‘‘

اور اسلام سے قبل کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے:

وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ.(۳)

’’اور اُن سے اُن کے بارِگراں اور طوقِ (قیود) - جو اُن پر (نافرمانیوں کے باعث مسلّط) تھے - ساقط فرماتے (اور انہیں نعمتِ آزادی سے بہرہ یاب کرتے) ہیں۔‘‘

یہ ’’اغلال‘‘ اور ’’اصر‘‘ کیا ہے؟ یہ غلط عقائد اور تصوّرات کی زنجیریں اور توہمات کی بیڑیاں تھیں، جن میں انسانیت کا بند بند جکڑا ہوا تھا، حضور ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد انسانیت کو ان زنجیروں اور بندھنوں سے نجات دلانا بھی تھا۔ اسی بناء پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ○ فَکُّ رَقَبَةٍ○(۴)

(۱) البقرہ، ۲: ۲۸۶

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۲۶۶، رقم: ۲۲۳۴۵

۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۸: ۱۷۰، رقم: ۷۷۱۵

(۳) الاعراف، ۷: ۱۵۷

(۴) البلد، ۹۰: ۱۲۔۱۳

’’اور آپ کیا سمجھے ہیں کہ وہ (دینِ حق کے مجاہدہ کی) گھاٹی کیا ہےo وہ (غلامی و محکومی کی زندگی سے) کسی گردن کا آزاد کرانا ہےo‘‘

بہر حال قرآن نے انسان کو مجبوریوں سے نجات کی راہ دکھائی اس کے لئے سہولتوں کا اعلان کیا۔ جن میں سے ایک حالتِ اضطرار اور حالتِ اختیار کا نمایاں فرق بھی ہے۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد

خلافتِ فاروقی کے زمانے میں حجازِ مقدس میں سخت قحط پڑا۔ اناج مفقود ہوگیا اس حالت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل درآمد روک دیا اور فرمایا: جب تک حکومت ہر شخص کو ضروریاتِ زندگی مہیّا نہیں کرسکتی، وہ قطعِ ید کی حد نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ (۱)

سلطنتِ اسلامیہ کا فرض

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فرمان اور عمل سے قرآن و حدیث کے بیان کردہ اُصول کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے، اور یہ قرار پاتا ہے کہ سلطنتِ اسلامیہ کا فرض صرف حدود و تعزیرات کا نفاذ ہی نہیں بلکہ اس کا اصل فرض برائی اور جرم کے مبادیات اور اسباب کا قلع قمع کرنا بھی ہے یعنی چوری، ڈکیتی اور دیگر بیماریوں کے اصلی محرکات کا کھوج لگانا اور پھر اس کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنا اسلامی حکومت کا اوّلین فرض ہے۔

آج کے دور میں اسلامی حدود کو سخت بتایا جاتا ہے، مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان حدود کے عملی نفاذ سے پہلے مملکتِ اسلامیہ میں زندگی گزارنے کے بہتر حالات پیدا کرنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اگر تمام ممکنہ سہولتوں کے باجود کوئی شخص بدی کی طرف جھکتا ہے تو وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

(۱) امام ابویوسف، کتاب الخراج: ۱۴

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چوری کا ایک مقدمہ سماعت کے لئے پیش ہوا۔ صورت حال یہ تھی کہ کچھ ملازموں کو اپنے سرداروں کے اونٹ چرانے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ جب مقدمہ چلا تو ان پر چوری پوری طرح ثابت ہوگئی۔ ابھی چوری کی سزا پر عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ انہوں نے ان سرداروں کو بلا بھیجا جن کے پاس وہ لوگ ملازم تھے۔ وہ حاضر ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا: تم نے کتنی مدّت سے اپنے ان ملازمین کو تنخواہیں نہیں دیں۔ پتہ چلا کہ کافی عرصہ سے ان ملازمین کو تنخواہ نہیں مل رہی تھیں۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ ان سرداروں سے اُونٹوں کی دوگنا قیمت بطور تاوان وصول کی جائے۔ (۱)

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مجبوری اور حالتِ اختیار میں نمایاں طور فرق کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ حرام بھی حالتِ اضطرار میں حلال ہو جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دین کے لئے بھی اکراہ و جبر گوارا نہیں:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قف قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ. (۲)

”دین میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جس میں کوئی چیز دوسری چیز سے التباس

(۱) مالك، المؤطا، ۲: ۷۴۸، رقم: ۱۴۳۶

(۲) البقرہ، ۲: ۲۵۶

نہیں رکھتی۔ خیر کو شر سے، نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے نیز حالتِ اختیاری کو حالتِ اضطراری سے ممیّز کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جب حج جیسے مقدس فریضے کا حکم نازل ہوا تو اس کیساتھ بھی حالتِ مجبوری کا لحاظ رکھا گیا، ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا.(۱)

’’اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔‘‘

ایک صحابی کا سوال اور حضور ﷺ کا جواب

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے سوال کیا:

أفي كلّ عام يا رسول الله؟

’’یا رسول اللہ! کیا یہ حج ہر سال فرض ہے؟‘‘

آپ خاموش رہے، اس نے سوال دہرایا مگر آپ ساکت رہے، اس نے تیسری مرتبہ اپنے سوال کا اعادہ کیا تو پھر بھی آپ خاموش رہے۔ مگر جب سائل کا شوقِ سوال دیکھا تو فرمایا:

لو قلت نعم لوجبت ولمّا استطعتم ثمّ قال: ذروني ما تركتكم فإنّما هلك من كان قبلكم بكثرة سؤالهم.(۲)

(۱) آل عمران، ۳: ۹۷

(۲) مسلم، الصحيح، كتاب الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ۲: ۹۷۵، رقم: ۱۳۳۷

’’اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج واجب ہو جاتا اور تم اس کی ہرگز استطاعت نہ رکھتے۔ پھر فرمایا: لہٰذا جہاں میں خاموش رہوں وہاں تم بھی خاموش رہو کیونکہ تم میں سے پہلی اُمتیں کثرتِ سوال کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔‘‘

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ انسان کو آسانیاں اور سہولتیں دینے کے لئے ہے، یہ انسانیت کو تمام بندھنوں اور زنجیروں سے نجات دلانے آیا ہے۔ یہ دین انسان کے جسم سے جبر و اکراہ کا بوجھ اُتارتا ہے، اختیار اور اضطرار میں فرق کرتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے سراسر رحمت و رافت اور شفقت واحسان ہے۔ اس سے یہ توقع بھلا کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ انسان کو اس کے عمل اور اس کے ہر فعل میں مقید قرار دے گا۔

’’اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اختیارات، اُمورِ خیر میں صرف کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

www.MinhajBooks.com

لَا تَاخُذُهٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ کا معنٰی

"نہ اُس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند"

اللہ تعالیٰ کی ذات پر تھکن، اُونگھ یا گہری نیند کا غلبہ نہیں ہوسکتا، نیند کی اِبتدائی حالت یا انتہائی گہری حالت اِس کی مقدس ذات پر غالب نہیں آسکتی۔

اُونگھ اور نیند نہ آنے کی وجہ

اُونگھ اور نیند نہ آنے کا تذکرہ بطور صفاتِ خداوندی کیوں کیا گیا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ لوگ زندہ اور زندگی کا معنی و مفہوم اِس کائنات کی زندہ اشیاء کے مشاہدے سے حاصل کرتے ہیں اور زندگی کے قوانین کا اندازہ اِسی کُرہ زمین کی زندہ چیزوں کے پیمانے سے کرتے ہیں۔ وہ یہی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ تمام زندہ موجودات، حیوانات ہوں یا نباتات اور اِنسان اپنی زندگی اور افعالِ زندگانی کے تحفظ و بقا کے لئے نیند اور استراحت و آرام کرنے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر اُنہیں نیند نہ آئے تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں لہٰذا اِس کُرہ ارض کے زندہ موجودات، نباتات یا حیوانات یا اِنسان اِن تمام کے لئے نیند ایک لازمی ضرورت ہے۔

نیند ایک ایسی کیفیت ہے جس پر طاری ہوتی ہے وہ اپنے آپ سے منقطع اور بے خبر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے فائدے اور نقصان کی تشخیص نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے آپ کی آگاہی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ کی ذات سے اِس کی نفی کی گئی ہے۔ اُس کی تمام صفاتِ کمال اور اُس کا ارادہ خود اُس کی ذات سے قائم ہے۔ قیوم خالق

کائنات کی صفتِ دائمی و ابدی ہے اِس کا معنی ہے دوسروں کی حفاظت کرنا یعنی قیوم وہ ہوتا ہے جو ایک طرف سے بذاتِ خود قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف سے تمام موجوداتِ عالم اُس کی ذات سے قائم ہوتے ہیں۔ اونگھنا اور سونا یہ سب کچھ اِس عالم طبیعت کے زندہ موجودات کے لئے لازمی ہے۔ اُس نے اپنی ذات سے اُونگھ اور نیند کی ضرورت کو سلب کر کے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زندگی اِس کُرہ ارض میں بسنے والے زندہ موجودات کی طرح نہیں ہے۔ اُس کی ذات تمام ایسے عوارض سے منزّہ و مبّرا ہے جو ایک ممکن الوجود مخلوق کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ خالق کائنات تمام مادّی نقائص سے منزّہ و مبّرا ہے اِس لئے وہ نہ تو تھکتا ہے اور نہ کمزور ہوتا ہے اور نہ ہی اُسے تجدیدِ قویٰ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اُس کی ذات کے حریم قدس میں سستی و غفلت کا دخل نہیں ہے۔ آشنائے راز حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم عرض پرداز ہیں۔

فلسنا نعلم کنه عظمتک إلّا إنّا نعلم إنّک حيّ قیوم لا تأخذک سنة ولا نوم.(۱)

”بار الٰہا! ہم تیری عظمت و بزرگی کی حقیقت و کنہ پر آگاہ نہیں ہیں۔ ہم تو صرف اِتنا جانتے ہیں کہ تو زندہ ہے، خود بخود قائم ہے اور سارا جہان تیری ذات کے ساتھ قائم ہے نہ تو تجھے اُونگھ آتی ہے اور نہ ہی تجھ پر نیند غالب آتی ہے۔“

نیند مخلوق کی فطری ضرورت ہے

طبیعی نیند کا مطلب دماغ اور سلسلہ اعصاب کو اپنے کام سے روک دینا اور باز رکھنا ہے۔ ہر اِنسان کا دماغ حالتِ بیداری میں اپنے اعصاب کے جال کے ساتھ مسلسل مصروفِ عمل رہتا ہے لہٰذا وہ اِس متواتر دائمی محنت کی وجہ سے تھک جاتا ہے اور کام کرنے

(۱) نہج البلاغۃ خطبہ: ۱۵۹ / شرح ابن الحدید

میں مشکل محسوس کرنے لگتا ہے۔ ذات واجب الوجود نے اپنے حکیمانہ فیصلے اور مدبّرانہ قانون کے مطابق اِنسان کے لئے دن رات میں چند گھنٹے نیند کرنا لازمی قرار دیا ہے، تاکہ ہضم اور تنفس کے علاوہ اِنسان کے بدن کی مشینری کا ایک بہت بڑا حصہ جو کام میں ہمہ تن مصروف تھا وہ بالجبر کام سے رُک جائے، اُس کی تھکاوٹ دور ہو جائے اور وہ دوبارہ کام کے لئے مستعد ہو جائے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًاO[1]

''اور ہم نے تمہاری نیند کو (جسمانی) راحت (کا سبب) بنایا (ہے)O''

امام راغب اصفہانیؒ اِس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

سُباتاً أی قطعاً لِلعمل.

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کائنات کے ذریعے نیند کو کام کے قطع کرنے اور حالت بیداری کے سارے کاروبار کو تعطیل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ نیند تجدید قویٰ کا باعث ہے۔ اِنسان اگر نیند کرے تو بیدار ہونے پر نئی طاقت اور تازگی لے کر اُٹھتا ہے۔ نیند اگرچہ تھوڑی مدت کے لئے اور معمولی مقدار میں بھی ہو تب بھی مفید اثر دکھاتی ہے۔ اِس حقیقت کی طرف حضرت سیدنا علی المرتضیٰؓ نے نہایت بلیغ اشارہ فرمایا ہے۔

أربعة القلیل منها کثیر. النّار القلیل منها کثیر و النّوم القلیل منه کثیر و المرض القلیل منه کثیر و العداوة القلیل منها کثیر.[2]

''چار چیزیں ایسی ہیں کہ اِن کی معمولی مقدار بھی کثیر ہوتی ہے۔ آگ، نیند، بیماری اور دشمنی اِن چاروں میں سے ہر ایک کی تھوڑی مقدار کو بھی کم نہ سمجھو،

(۱) النباء، ۷۸: ۹

(۲) نہج البلاغة خطبه: ۳۳۷ / شرح ابن الحدید

(بلکہ اِن کی تھوڑی سی مقدار بھی زیادہ ہے اور اِس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بہت زیادہ اثرات کی بنیاد بن جائے)۔‘‘

قرآن حکیم نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ رات نیند کے لئے اور دن کسبِ معاش کے لئے ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝(۱)

’’اور ہم نے تمہاری نیند کو (جسمانی) راحت (کا سبب) بنایا (ہے)۝ اور ہم نے رات کو (اس کی تاریکی کے باعث) پردہ پوش بنایا (ہے)۝ اور ہم نے دن کو (کسبِ) معاش (کا وقت) بنایا (ہے)۝‘‘

اگرچہ انسان کے لئے زیادہ بہتر تو یہی ہے کہ رات کو نیند کرے اور دن کو محنت سے اپنا کاروبار کرے۔ تاہم اِس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ خود کو مختلف حالات کے ساتھ منطبق کرے۔ اِس بات پر وہ قادر ہے کہ اِس میں تبدیلی کر کے شب و روز کو باہم ملا دے۔ دونوں کے کچھ حصے میں نیند اور کچھ حصے میں کاروبار کرے اور اِس طرح اپنی صحت وزندگی کی حفاظت کرے۔ اس طرف قرآن حکیم نے یوں رہنمائی کی ہے:

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝(۲)

’’اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ تم رات میں آرام کرو اور (دن میں) اس کا فضل (روزی) تلاش کر سکو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۝‘‘

(۱) النباء، ۷۸: ۹-۱۱

(۲) القصص، ۲۸: ۷۳

دوسرے مقام پر اس امر کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُم مِّنْ فَضْلِهٖ. (۱)

’’اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن میں تمہارا سونا اور اس کے فضل (یعنی رزق) کو تمہارا تلاش کرنا (بھی) ہے۔‘‘

دن اور رات کو اکٹھا بیان کرنے کی حکمت

اِن دونوں آیات میں دن رات کو اکٹھا بیان کیا ہے اور نیند اور کاروبار کا تذکرہ بھی اکٹھا آیا ہے۔ نیز اِن آیات کا آغاز رحمت اور آیت کے عنوان سے ہوا ہے۔ اِن دو آیات کا مقصد یہی نظر آتا ہے کہ نیند اور کاروبار کے لئے شب و روز دونوں سے ملا جلا استفادہ کرنا بھی ممکن ہے۔ یعنی دن کا کچھ حصہ نیند کرو اور رات کا کچھ حصہ کاروبار کرو یا رات کو کسب معاش کرو اور دن کو آرام کرو کہ اِس سے بھی اِنسان کی صحت و زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ اِنسان میں تبدیلی کو قبول کرنے اور زندگی کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو سازگار بنانے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں تمام ممالک میں کاروبار دن رات چلتے ہیں اور چوبیس گھنٹے کام ہوتا رہتا ہے۔ اگر اِنسان کی تخلیق اِس طرح کی ہوتی کہ رات کو نیند کرنا اِس کی زندگی کی بقا و سلامتی کے لئے ضروری ہوتا اور وہ اِس کے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکتا تو واضح ہے کہ وہ کبھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہ رہ سکتا۔ آیت الکرسی ’’معبود حقیقی‘‘ کی معرفت کراتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ اونگھ اور نیند اللہ تعالیٰ پر غالب نہیں آسکتی اور سستی و غفلت بھی اُس کی ہستی پر مسلط نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ آیت کریمہ بالواسطہ اِنسانوں کو یہ بات سمجھا رہی ہے کہ نیند کی ضرورت اُن زندہ موجودات کو ہوتی ہے جن کا وجود طبیعی مادوں اور معدنی عناصر سے مرکب ہوتا ہے اور اُن کی زندگی مادے کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ لیکن واجب

(۱) الروم، ۳۰: ۲۳

الوجود اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ مادہ سے منزہ ہے۔ اِس کی حیات عین ذات اور مادی عیوب و نقائص سے مبرا ہے۔ اِس لئے اِس کو اُونگھ اور نیند کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کمزور اور ناتواں نہیں ہے کہ نیند کے ذریعے تجدید قویٰ کرے اور صرف شدہ اجزائے جسم کا بدل حاصل کرے۔

’’سنۃ‘‘ کو ’’نوم‘‘ سے مقدّم کیوں کیا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت الکرسی میں ’’سنۃ‘‘ کو ’’نوم‘‘ سے مقدم کیوں کیا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ طبیعی نظام میں اُونگھ نیند سے پہلے آتی ہے اور آیت الکرسی میں کلامِ ربانی کا نظم کتاب تکوین کے مطابق ہے۔ اِس لئے پہلے اُونگھ کی نفی کی ہے۔ جو اِبتداً طاری ہوتی ہے اور اِس کے بعد نیند کی نفی کی ہے جو ثانوی عارضے کے طور پر لاحق ہوتی ہے۔ یہاں ایک اہم بلیغ نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اُونگھ اور نیند ہر دو عادی عوارض میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ ایسی دو حالتیں ہیں جو بالجبر حیوان اور اِنسان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے ’’اخذ‘‘ کا لفظ اِستعمال کیا گیا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ پر یہ دونوں حالتیں غالب نہیں آ سکتیں۔ تسلط اور غلبہ کے پیش نظر ضعیف سے قویٰ کی طرف ترقی کرنا بہتر ہے اور اِس کے برعکس بلاغت کے منافی ہے۔ غرض آیت الکرسی اِنسانوں کو یہ سمجھا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیات و قیومیت، رفعت و کمال کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہے کہ نہ تو اِس پر اُونگھ غلبہ کر سکتی ہے اور نہ اُسے قیومیت باز رکھ سکتی ہے۔ نہ نیند اُس پر مسلط ہو سکتی ہے جو اُونگھ سے زیادہ قوی ہوتی ہے اور نہ ہی اُسے قیومیت سے مانع ہو سکتی ہے، بلکہ ذات واجب الوجود ہمیشہ ہر جگہ اور ہر موقع پر بذاتِ خود قائم ہے اور ساری کائنات اِس کی ذات کے ساتھ قائم اور موجود ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ کا معنٰی

”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے سب اسی کا ہے۔“

اِس جملے میں اِنسانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اِس کائنات کا ہی قیوم اور برپا کرنے والا نہیں بلکہ آسمان، زمین اور اِن کے اندر کے تمام موجودات اور تمام مخلوقات اُسی کی حقیقی ملکیت ہیں اور وہی اِس جہانِ ہستی کا بالاستحقاق مالک ہے۔ راہِ ہدایت کو گم کرنے والوں اور شرک کی وادی میں بھٹکنے والے لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہارا مالکِ حقیقی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ خود ساختہ معبودوں کی نفی کی جا رہی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللهِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ.[1]

”بیشک جن (بتوں) کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ بھی تمہاری ہی طرح (اللہ کے) مملوک ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کسی کو یا جس چیز کو تم اپنا خدا سمجھ کر پکارتے ہو اور اس کی پرستش کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔ پس اے وہ انسانو جو قسم قسم کے معبود بنائے ہوئے ہو اور اپنے حقیقی خدا کے ساتھ عبادت میں انہیں شریک قرار دیتے ہو۔ ذرا ہوش میں آؤ، اپنی عقلی طاقت سے کام لو اور ایک لمحہ بھر سوچو کہ شاید اپنی ان

(۱) الاعراف، ۷: ۱۹۴

قبیح کرتوتوں کو سمجھ لو، اپنی عقل کے ہتھیار سے غلامی و بندگی کی زنجیروں کو توڑ ڈالو اور اپنے آپ کو ان نقلی اور خودساختہ معبودوں کی قید سے آزاد کرلو۔ ’’لَهٗ ما فی السّمٰوات وما فی الارض‘‘ کے ذریعے انسانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اِسلام کے مطابق بندگی اور پرستش فقط اس کائنات کو پیدا کرنے والے خداوند قدّوس کے لئے ہے اور وہی تمام افراد اور تمام اشیاء کا حقیقی مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ملکیت پر ایمان فکر کو درست رکھنے میں گہرا اثر ڈالتا ہے

قرآنِ حکیم نے متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ کو مالکِ کائنات بتایا اور آسمانوں اور زمین کے اندر پائی جانے والی تمام اشیاء کو اس پروردگارِ عالم کی ملکیت قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مالکیت پر ایمان فکر انسانی کو درست رکھنے میں گہرا اثر ڈالتا ہے اور کائنات سے متعلق نظریہ قائم کرنے میں انسان کے طرز تفکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ مومن اس جہان کو لوگوں کے سامنے ایک نئی نظر سے پیش کرتا ہے اور یہ ایمان انسان کو خودسری، سرکشی اور بے راہ روی سے نجات عطا کرتا ہے۔ اس طرح ہر جانب سے حاصل ہونے والا تدبر انسانوں کو ایک صحیح اور سعادت بخش راستے کی سمت لے جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں دو قسم کی آیات ہیں: ایک قسم کی آیات میں آسمان و زمین میں جو کچھ موجود ہے اس کا مالک اللہ تعالیٰ کو بتایا گیا ہے اور آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کی حکیمانہ تدبیر کا بیان صفت ’’قیوم‘‘ کے ذریعے کیا گیا ہے، جبکہ دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ کی حکومت و قیومیت کو کلمہ ’’ملک‘‘ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۱)

’’اور سب آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (سو تم اپنا دھیان اور توکّل اسی پر رکھو) ○‘‘

(۱) آلِ عمران، ۳: ۱۸۹

ایک دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یوں فرمائی:

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ○ (۱)

''اور آسمانوں اور زمین اور جو (کائنات) ان دونوں کے درمیان ہے (سب) کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے○''

اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیتِ مطلقہ کے مضمون کو بار بار انداز بدل بدل کر بیان کر کے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ انسان مطلقاً کسی بھی شے کا حقیقی مالک نہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ط وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ○ (۲)

''بیشک اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہی ہے۔ (وہی) جلاتا اور مارتا ہے، اور تمہارے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار (جو امرِ الٰہی کے خلاف تمہاری حمایت کر سکے)○''

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا○ (۳)

''وہ (اللہ) کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے اور جس نے نہ (اپنے لئے) کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور

(۱) المائدہ، ۵: ۱۷
(۲) التوبۃ، ۹: ۱۱۶
(۳) الفرقان، ۲۵: ۲

اسی نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے پھر اس (کی بقا و ارتقاء کے ہر مرحلہ پر اس کے خواص، افعال اور مدت، الغرض ہر چیز) کو ایک مقررہ اندازے پر ٹھہرایا ہےo''

لامِ اختصاص کی حکمت

قرآنِ حکیم میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حکومت مطلقہ، تدبیر حکیمانہ اور بلا قید و شرط فرما روائی کو جو اسے اس پورے جہانِ ہستی پر حاصل ہے۔ کلمہ ''ملک'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ آیات کہ جن میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی بات کی گئی اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ تمام ارضی و سماوی موجودات پروردگار عالم کی ملکیت ہیں۔ ان میں سے اکثر میں یہ مضمون ''لام اختصاص'' کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً چند ایک قرآنی آیات ملاحظہ کیجئے:

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ.(۱)

''جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اللہ کے لئے ہے، وہ باتیں جو تمہارے دلوں میں ہیں خواہ انہیں ظاہر کرو یا انہیں چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔''

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ط وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًاo(۲)

''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور بیشک ہم

(۱) البقرہ، ۲: ۲۸۴

(۲) النساء، ۴: ۱۳۱

نے ان لوگوں کو (بھی) جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی حکم دیا ہے اور تمہیں (بھی) کہ اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ اور اگر تم نافرمانی کرو گے تو بیشک (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز، ستودہ صفات ہےo‘‘

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ط وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ط وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌo(۱)

’’خبردار! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کا ہے، وہ یقیناً جانتا ہے جس حال پر تم ہو (ایمان پر ہو یا منافقت پر)، اور جس دن لوگ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انہیں بتا دے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہےo‘‘

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِيَجْزِیَ الَّذِيْنَ اَسَآؤُوا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِیَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰیo(۲)

’’اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ جن لوگوں نے برائیاں کیں انہیں اُن کے اعمال کا بدلہ دے اور جن لوگوں نے نیکیاں کیں انہیں اچھا اجر عطا فرمائےo‘‘

---

(۱) نور، ۲۴: ۶۴

(۲) النجم، ۵۳: ۳۱

آیۃ الکرسی اور تصورِ ملکیت

اس طرح کی دیگر بہت سی آیات موجود ہیں کہ جو خداوند عالم کی مالکیت کو بیان کرتی اور تمام ارضی و سماوی موجودات کو خالق عالم کی ملک قرار دیتی ہیں۔

اِنسان اشیاء کا حقیقی مالک نہیں اور اس کی ملکیت ایک اعتباری امر ہے، پرانے زمانے میں انسان کی اجتماعی اور اقتصادی ضروریات کے پیشِ نظر اس جہان میں انسان کی مالکیت کی بنیاد قائم ہوئی اور انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی اس مالکیت کی تصدیق فرمائی۔

انسانی ملکیت کی حدود

ایک پھلدار درخت پر ایک انسان کی مالکیت کی حدود یہ ہیں کہ اگر وہ چاہے تو اسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ وہ اس کے پھلوں سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اِن پھلوں کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے اور چاہے تو اس درخت کو کاٹ سکتا ہے، لیکن یہ سب حقوق حقیقی مالکیت کا مفہوم نہیں رکھتے۔ اس درخت کا حقیقی اور واقعی مالک اللہ تعالیٰ ہے کہ جس نے اس درخت کے وجود کے تمام ذرّات کو خلق فرمایا ہے یعنی اس درخت کے تمام خلیوں کی زندگی اس ہستی کے فیض کا نتیجہ اور اسی کی عنایات کا اثر ہے۔ چنانچہ اس درخت کا واقعی مالک وہ ہوسکتا ہے جو اس کی زندگی کی حفاظت اور اس کی حیات کی بقاء کے لئے اسے ایک طرف سے غذا حاصل کرنے کی توانائی بخشتا اور ہضم و جذب کی صلاحیت دیتا ہے تو دوسری طرف اس درخت کی غذا کا سامان عالم کے دامن میں تیار کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ درخت کا مالک حقیقی وہ پروردگار ہے جو اس کے تمام اجزاء کا پیدا کرنے والا ہے۔ انہیں زندگی بخشنے والا ہے اور جس نے اپنی حکیمانہ تدبیر کو تکوینی قوانین کی صورت میں اس درخت کے وجود میں جاری کیا اور اِسے اپنے راہ پر رواں کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس جہان ہستی کی ''ملکیت'' اور اس عالم وجود کی مالکیت اس ذات الٰہی لم یزل ولایزال سے مختص

ہے۔ کیونکہ تمام ذرّاتِ عالم اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اور اس کے فیضانِ کرم کے طفیل موجود ہوئے ہیں۔ یہ کہنا بجا ہے کہ تمام موجودات کا حقیقی اور واقعی مالک اللہ تعالیٰ ہے کہ سارا نظامِ عالم اس ذات کی حکیمانہ تدبیر اور جاری و ساری حکم کے ذریعے باقی اور برقرار ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ اس جہانِ ہستی کا مالک اور فرمان روائی اسی حق تعالیٰ سے مخصوص ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اَ لَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○(۱)

''خبردار! (ہر چیز کی) تخلیق اور حکم و تدبیر کا نظام چلانا اسی کا کام ہے۔ اللہ بڑی برکت والا ہے جو تمام جہانوں کی (تدریجاً) پرورش فرمانے والا ہے○''

اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو اجازت دی اور اس نے اسے حکم دیا ہے کہ ہر کوئی اپنی زندگی کے تحفظ اور اپنی خوش حالی کی ضمانت کے لئے اس زمین میں موجود تمام اشیاء اور اس کے تمام منابع سے شرعی حدود کے اندر اور مصلحت کے مطابق استفادہ کرے، حالانکہ یہ سب خزانے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور تکوینی قوانین کی مدد سے پروردگار عالم ''ملک'' اور حکومت کے تمام ضابطوں کو جاری کئے رکھتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا. (۲)

''اسی نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا اور اس میں تمہیں آباد فرمایا۔''

انسان زمین میں گندم کا بیج ڈالتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس کی پیداوار سے اپنا سالانہ خرچہ اُٹھا لیتا ہے۔ یاد رہے کہ انسان اپنے اس کام میں بھی ''ملک خدا'' اور ''ملک الٰہی'' ہر دو سے اِستفادہ کرتا ہے۔ گندم، زمین اور پانی یہ سب پروردگار کی ملکیت ہیں کہ جن کو ایک کاشتکار اپنے فائدے کے لئے اِستعمال کرتا ہے۔ لیکن قانون حیات سے

(۱) الاعراف، ۷: ۵۴

(۲) ھود، ۱۱: ۶۱

زیر زمین دانے کو چیرنا، پودوں کا غذا حاصل کرنا اور نشوونما پانا یہ سب معاملات جو بیج کے پرورش پانے کے عوامل ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے ملک اور حکومت کے قاعدہ قانون میں شامل ہیں کہ جن سے ایک کاشتکار فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اس طرف رہنمائی فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ○ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ○(۱)

''اور بیشک تم نے پہلے پیدائش (کی حقیقت) معلوم کر لی پھر تم نصیحت قبول کیوں نہیں کرتے○ بھلا یہ بتاؤ جو (بیج) تم کاشت کرتے ہو○''

اس آیت کا پہلا حصہ اِنسان کے اشیائے خداوندی سے اِستفادہ کرنے کا بیان ہے جو ہمارے ارادہ و اختیار کے اندر ہے۔ دوسرا حصہ مالکیت خداوندی سے متعلق ہے اور ان تکوینی قوانین سے فائدہ پانے کو بیان کر رہا ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔

حکومتِ خداوندی سے فرار ممکن نہیں

الٰہی قوانین سے متعلق اُمور میں اللہ تعالیٰ کے تشریعی قوانین سے بے پرواہی برتنا ایک انسان کے مقدور میں ہے اور وہ اس زمین کی اشیاء سے ناجائز فائدہ اُٹھانے پر قدرت رکھتا ہے۔ بایں طور کہ ان اشیاء کو اس راستے میں اِستعمال کرنے لگے جن کی اجازت پروردگار عالم نے نہ دی ہو۔ لیکن جہاں تک تکوینی قوانین اور اس نظام آفرینش میں جاری الٰہی سنن کا تعلق ہے تو چونکہ وہ حق تعالیٰ کے توانا ارادے اور اس کی قیومیت و حکومت کے ترجمان اور اِس قدر قطعی اور لازم الاجراء ہیں کہ کسی کو قدرت نہیں کہ ان قوانین کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے اختیار کو دخل دے سکے، نہ ہی کوئی اس کے مقرر کردہ قوانین سے سرتابی اور انکار کا حق رکھتا ہے کیونکہ ''ولا یمکن الفرار من حکومتک'' اور تیری حکومت سے فرار ناممکن ہے۔

(۱) الواقعہ، ۵۶: ۶۳۔ ۶۴

دورِ حاضر کی علمی و سائنسی ترقی کے باوجود انسان عالمِ طبیعت کے قوانین کے سامنے مجبور ہے کہ ان کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے نفاذ کا حصہ ہیں، اس لئے ہر انسان کو اس نظامِ آفرینش کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے اور علمی و عملی مدارج تک ترقی کرنا چاہتا ہے تو اِسے قوانینِ خلقت سے ہم آہنگی رکھنا پڑتی ہے۔ اس کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ ان قوانین کو اپنی خواہش کے مطابق موڑ لے۔

قرآن حکیم کی جن آیات میں اللہ تعالیٰ کی مالکیت کا تذکرہ ہوا ہے، ان کی کثیر تعداد کے آخر میں لوگوں کا نام لیا گیا ہے۔ پھر ایسے جملے لائے گئے جن میں لوگوں کی اچھی یا بری نیت، ان کے اعمال کی جزا یا سزا، ان کے اپنے کئے سے درگزر یا مواخذہ اور اس قسم کے اُمور کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس پوری کائنات کی فرماں روائی اور قیومیت اس ذاتِ الٰہی سے مختص ہے اور لوگوں کو اس معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور نہ وہ اس میں دخل دینے پر قادر ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم کی جس قدر آیات میں ''ملکِ خدا اور حکومتِ الٰہی کو بیان کیا گیا ہے ان سب کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت، مخلوقات کی آفرینش، زندگی بخشنا یا موت دینا، بیٹیاں عطا کرنا یا بیٹے دینا اور ایسے اُمور کو لایا گیا ہے جن کا تعلق محض رب العزت سے ہے اور اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

کیا حاکمیت اور قیومیتِ خداوندی تکوینی قوانین کے ذریعے نافذ ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اس جہان میں اپنی حاکمیت اور قیومیت کو تکوینی قوانین کے ذریعہ نافذ کیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان تکوینی قوانین کو وضع کرنے کے بعد وہ اپنے ارادہ و اختیار سلب کرا بیٹھا اور اب ان قوانین کو زیر و زبر کرنے سے عاجز ہوگیا ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور اس کی بے قید و شرط حاکمیت اور اس کی لامحدود قدرت ہمارے اس جہان اور دیگر تمام جہانوں کے لئے بلاریب و شک ثابت ہے۔ وہ اگر چاہے

تو ان تکوینی قوانین کی بنیاد کو ہی تبدیل کر کے رکھ دے یا چاہے تو بعض خاص اُمور میں اپنی حاکمیت کا اِستعمال عام طبیعی قوانین سے ہٹ کر کسی دوسرے راستے سے انجام دے دے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا پتھر سے نکلنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آتش نمرود کا گلزار ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصاء کا اژدھا بن جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارہ پر چاند کے دوٹکڑے ہو جانا، ڈوبے سورج کا واپس پلٹنا، قطرۂ آب سے چشمہ جاری ہو جانا وغیرھم، سب اسی قسم کے اُمور سے تعلق رکھنے والے واقعات ہیں۔ انبیاء و اولیاء، اللہ تعالیٰ سے تقرّب اور کمال بندگی کے نتیجے میں ایسا روحانی مقام پا گئے کہ ولایت تکوینی کے بلند مقام کے اہل ثابت ہوئے۔ یہ اس شان کے لوگ ہیں کہ اگر کسی موقع پر چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے اذن اور الٰہی قوت و قدرت کے سہارے تکوینی قوانین کی حدود کو عبور کر جاتے ہیں اور اس جہان کے عمومی قوانین سے برتر کام انجام دے دیتے ہیں مثلاً

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ.(۱)

’’(پھر) ایک ایسے شخص نے عرض کیا جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا کہ میں اسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے (یعنی پلک جھپکنے سے بھی پہلے)۔‘‘

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا:

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًام بِاِذْنِ اللهِ.(۲)

’’میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل جیسا (ایک پُتلا) بناتا ہوں پھر میں

(۱) النمل، ۲۷: ۴۰

(۲) آل عمران، ۳: ۴۹

اس میں پھونک مارتا ہوں سو وہ اللہ کے حکم سے فوراً اڑنے والا پرندہ ہو جاتا ہے۔“

ان دونوں آیات میں دو نبیوں اور رسولوں کے ولایت تکوینی رکھنے اور تکوینی قوانین کی حدود سے بالاتر افعال یعنی معجزات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا انبیاء کرام اور اولیاء عظام سے باذن الٰہی خارقِ عادت افعال کا ظہور اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور ملکیت و حاکمیتِ مطلقہ کے منافی نہیں، بلکہ یہ بھی اُسی کے نظامِ قدرت کا حصّہ ہیں اور یہ مرضی ومنشائے باری کا نتیجہ ہیں۔

آیت الکرسی میں **لہٗ مافی السموات وما فی الارض** اور اس طرح کی دیگر آیات کے ذریعے آسمانوں اور زمین کے دائرے میں موجود تمام اشیاء کو خالق و پروردگار کی ملکیت بتایا ہے اور یہ معجزات وکرامات بھی اُسی کی ملکیت ہیں، جو کچھ صادر ہوتا ہے اُس کی مرضی ہی سے ہوتا ہے۔ ذاتاً ومستقلاً کی نفی ہے اور عطاء کا اثبات ہے، بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دینِ اِسلام میں اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے کو ایک خصوصی مقام اور اس نکتے کو ایک خصوصی شان حاصل ہے۔

پروردگارِ عالم کی ملکیت پر اعتقاد رکھنا اُصولی اور اساسی مسائل میں سے ہے۔ پھر اسی اعتقاد سے انسان و جہان کی شناخت کے باب میں ایک آدمی کے طرز تفکر پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مالکیت پر اعتقاد رکھنے کو انسان سازی اور اِسلامی نظامِ تعلیم وتربیت کی بنیادوں میں ایک اہم ترین مقام حاصل ہے۔ یہ عقیدہ ایک انسان کی زندگی کے تمام مظاہر پر دور رس اثرات مرتب کرسکتا ہے، اسے خودسری بے راہ روی سے نجات دلا سکتا ہے اور فرض شناسی اور انسانیت کی طرف تحریک کرسکتا ہے۔ اِنسان جو خود بھی ارضی موجودات میں سے ایک ہے اور ”**لہٗ مافی السموات و ما فی الارض**“ کا مفہوم اس کو بھی شامل ہے اس لئے مادی اور روحانی ہر دور اعتبار سے ہر زمانہ میں اِنسان زیر بحث رہا ہے۔

مؤمن اور غیر مؤمن کا رویہ

ایک مادہ پرست شخص جب اپنے بارے میں سوچتا ہے تو اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ وہ ایک مادی مخلوق ہے اور اس عالم طبیعت کے دامن میں اس نابینا و بے شعور مادے سے اتفاقاً وجود میں آ گیا ہے۔ نیز یہ بھی ایک اتفاقی حادثہ ہے کہ اسے عقل، ہوش اور اخلاقی وجدان نصیب ہو گیا اور اِسی طرح شہوت، غضب اور دیگر نفسانی خواہشات و رُجحانات کا حصول بھی ایک اچانک واقعہ ہے۔ گویا کہ ان عظیم صلاحیتوں میں سے کوئی ایک بھی کسی حکیمانہ منصوبے کے تحت کسی خالق حکیم کے ارادے سے اسے عطا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایسی فکر رکھنے والا شخص اپنے خالق یعنی اس عالم طبیعت کے سامنے اپنے اندر کوئی احساس ذمہ داری محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ طبیعت تو ایک بے شعور شے ہے کہ وہ نہ تو ذمہ داری کے سمجھنے پر قادر ہے اور نہ ہی اپنی مخلوق سے کوئی مطالبہ کر سکتی ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص اپنی شہوات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو ہر قسم کی قید و شرط سے آزاد خیال کرتا ہے۔ یعنی وہ ایک حیوان کی طرح اپنے لذائذ کی کشش کے تحت انہیں پورا کرنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مطمحِ نظر یہی ہوتا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اپنی خواہشات نفسانیہ کو عملی جامہ پہنائے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لذت اُٹھائے اور اپنے نفس کو راضی رکھنے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر وہ اپنے اوپر کسی پابندی کا قائل ہوتا ہے تو وہ فقط اس ملک کی عدلیہ یا انتظامیہ کی طرف سے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کی پابندی ہوتی ہے کہ جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن وہاں بھی لذت طلبی کا حصول کبھی کبھی اسے اس قدر سرکش بنا دیتا ہے کہ وہ ملکی قانون کو بھی توڑ دیتا ہے اور کام و دہن کی لذت حاصل کرنے کے لئے ممنوع افعال کا ارتکاب کر لیتا ہے۔

لیکن ایک خدا پرست انسان اپنے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اِس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ مجھے ایک قادر، عالم اور حکیم خالق نے اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ خلق فرمایا ہے۔ نیز اس نے جہاں مجھے حیوانی لذائذ اور نفسانی خواہشات عطا کی ہیں وہاں مجھے عقل و

ہوش اور اخلاقی وجدان کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا ہے۔ وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ کیا میں ایک حیوان کی مانند بلا قید وشرط آزاد ہوسکتا ہوں؟ اگر میرا خالق میرے بارے میں یہی چاہتا ہے کہ حیوان کی طرح زندہ رہوں تو پھر اس نے مجھے اخلاقی وجدان کیوں عطا کیا اور مجھے عقل کیوں دی ہے؟ کیا یہ انسانی سرمایہ کوئی فضول شے ہے؟ کیا وجدان اخلاقی جو میرے وجود کے اندر موجود ہے، وہ بے فائدہ اور لغو ہے؟ کیا یہ اخلاقی وجدان مجھے اس لئے عنایت نہیں کیا گیا کہ سعادت کے حصول میں میری راہنمائی کرے؟ کیا یہ فیصلہ کرنے کی فضیلت میری سرشت میں اس لئے نہیں رکھی کہ میں اپنے حیوانی میلانات کو اس کے سامنے پیش کروں اور پھر اس کے فیصلے پر عمل کروں تاکہ غیر انسانی اور غیر اخلاقی کردار اختیار کرنے سے بچ جاؤں؟ کیا اس ہستی نے مجھے عقل اسی لئے نہیں دی کہ نیکی و بدی کا ادراک کروں اور انسانی فرائض کا پابند اور الٰہی تکالیف کا مکلّف قرار پا سکوں؟

ارشادِ الٰہی ہے:

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی○[1]

”کیا اِنسان یہ خیال کرتا ہے کہ اُسے بے کار (بغیر حساب و کتاب کے) چھوڑ دیا جائے گا○“

یعنی اس کے باوجود کہ اسے عقل اور طاقتِ عمل سے مالا مال کیا گیا ہے، کیا خداوند عالم اسے مہمل اور اپنی حالت پر چھوڑ دے گا اور رب العزت اس پر اپنے اوامر و نواہی کی ذمہ داری عائد نہیں کرے گا؟

جو شخص بھی خود کو اللہ کی مخلوق سمجھتا اور اپنی بقاء کو اس کی حکیمانہ تدبیر کا مرہون قرار دیتا ہے، وہ کبھی اس ذات کے اوامر و نواہی کے سامنے خود کو بے تعلق قرار نہیں دیتا۔ وہ جب اس حقیقت بینی اور نورانی فکر تک پہنچ چکا تو اپنے جسم و جان، عقل و وجدان،

(۱) القیامۃ، ۷۵: ۳۶

میلانات حیوانی، بلکہ اپنے وجود کے تمام ذرات کو اپنے محسن خالق کی مخلوق مانتا ہے اور یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ وہی میرا خالق اور حقیقی مالک ہے۔ایسا انسان کبھی اپنے مالک حقیقی کے حکم کے خلاف قدم نہیں اُٹھاتا اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اگر کبھی غفلت کے نتیجے میں اس سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو جب بندگی اور عبودیت کی فکر اس کے اندر بیدار ہوتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ تو اپنے پروردگار کا مملوک ہے اور ایک مملوک بندہ اپنے آقا و مولیٰ کے فرمان کی مخالفت نہیں کرتا۔ تب وہ متنبہ ہو جاتا ہے، اپنی روش تبدیل کر دیتا ہے، اپنے کئے پر پشیمان ہوجاتا ہے اور مستقبل میں گناہ اور مخالفت مولیٰ سے پرہیز کرنے لگتا ہے۔ پس اگر ایک مادی انسان کے طرزِ تفکر اور ایک روحانی انسان کے طرز تفکر کا باہمی موازنہ کیا جائے تو وہ ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ مادی طرز فکر کا انسان اپنے اندر احساس ذمہ داری پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ہر طرف سے آزاد تصور کرتا ہے اور اس کے لئے مشکل ہے کہ اپنے سرکش لذائذ اور آزاد میلانات کو لگام دے اور طبعی رجحانات کی مخالفت کرتے ہوئے خود کو گناہ سے روک لے۔ لیکن ایک مسلمان آدمی چونکہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور مملوک مانتا ہے، اس لئے اپنے ذہن و فکر میں اس کی اطاعت کے جذبے کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ خدا پرست انسان عقیدہ رکھتا ہے کہ اپنے خالق کی فرمانبرداری مجھے اس کی طرف سے جزا کا مستحق بناتی ہے، جبکہ اس کے اوامر کی نافرمانی سزا کا مستوجب قرار دیتی ہے۔ یہی عقیدہ اس کا سبب بنتا ہے کہ وہ اپنی غلط خواہشات سے چشم پوشی کر لیتا ہے اور اپنے اللہ کی خوشنودی کے حصول کے جذبے سے سرشار ہو کر ناجائز خواہشات کو قابو کر لیتا ہے۔

اسلامی تربیت کی اساس

دراصل اِسلام میں تربیت کا نظام ہی اس بنیاد پر اُستوار ہے کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کا بندہ اور مملوک ہے۔ اس کے تمام اعضاء بدن اور اس کے اختیار میں دی گئی تمام طاقتیں درحقیقت اسی پروردگار عالم کی ملکیت ہیں۔ ہر مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ اپنے

ان اعضاء اور ان طاقتوں کو اپنے خالق کے پسندیدہ اُمور میں اِستعمال کرے اور اپنے خالق کی اس ملکیت سے اس کی رضا کے اندر رہتے ہوئے استفادہ کرے۔ اِسلام نے عالمِ انسانیت کے لئے جو بنیادی اُصول وضع فرمایا، وہ یہ ہے کہ تمام ارضی و سماوی موجودات پروردگارِ عالم کی ملکیت ہیں اور اِنسان کو جو خود بھی موجوداتِ ارضی میں سے ایک ہے اور پروردگار کا مملوک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اجازت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت پر مشتمل تمام موجودات سے شرعی حدود اور مالکِ حقیقی کی رضا کے مطابق استفادہ کر سکتا ہے۔ اب اگر کوئی سوال کرے کہ خداوند عالم نے کس حد تک اپنی ملکیت سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت دی ہے؟ اور انسان اپنی عقل و خرد کی توانائیوں کے ذریعے عالم طبیعت کے ان ذخائر سے کس حد تک استفادہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے؟ مختصر یہ کہ انسان کس حد تک حق رکھتا ہے کہ وہ پروردگارِ عالم کی ملک میں اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے؟ اس سوال کا جواب اِنسان کی صلاحیت کی حدود کو جان لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ خود خالقِ انسان اور مالکِ جہان جانتا ہے۔ وہ خود ہی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اس نے ہی انسان میں عقل و ہوش کی استعدادیں پیدا فرمائی ہیں اور اس کی استعداد و قابلیت کی مقدار کو بھی وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ انسان کے لئے ان آسمانی اور زمینی اشیاء سے استفادہ کرنے کی حدود معین فرمائے اور اپنی ملکیت سے اس کی بہرہ یابی کا اُصول قائم کرے۔

البتہ قرآن حکیم میں انسان کی قدر و قیمت اور انسان کے مقام کی رفعت کا بیان اس طرح ہوا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍO (۱)

’’بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہےO‘‘

(۱) التین، ۹۵: ۴

اِنسان حامل امانت الٰہی، صاحب عقل و ہوش اور ایک معتدل اور متوازن بدن کا مالک ہے۔ یہ اللہ کی اس قدر اہم مخلوق ہے کہ اس کو پیدا کرنے والے خالق نے اس کی تخلیق پر خود اپنی تعریف کی اور اپنے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ○ (۱)

’’پھر ہم نے اسے بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہے ○‘‘

البتہ ملک خدا سے انسان کے فائدے اُٹھانے کی حدود، بیان کرنے میں بھی قرآن حکیم نے گفتگو فرمائی ہے، چنانچہ ارضی موجودات کے بارے میں ارشاد ہوا:

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا. (۲)

’’وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔‘‘

اس آیت سے بکمال صراحت معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے انسانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ زمین کی سطح اور گہرائی میں موجود تمام معدنیات، تمام دریاؤں، صحراؤں، جنگلوں اور حیوانوں غرض زمین کی تمام موجودات و مخلوقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق استفادہ کریں۔

ملکیت اور تسخیرِ خداوندی

سماوی موجودات سے انسان کے استفادہ کرنے سے متعلق بھی قرآن حکیم نے وضاحت کی اور انسان کو نوید دی ہے کہ خالق عالم نے اپنے لطف و کرم سے تمام آسمانی اور زمینی محتویات کو انسان اور انسان کے فائدہ اُٹھانے کے لئے مسخّر اور مغلوب بنا دیا ہے۔

---

(۱) المؤمنون، ۲۳: ۱۴

(۲) البقرہ، ۲: ۲۹

ارشادِ ربّانی ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ.(۱)

’’(لوگو!) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو مسخّر فرما دیا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔‘‘

دوسرے مقام پر بیان فرمایا:

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ.(۲)

’’اور اُس نے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اپنی طرف سے (نظام کے تحت) مسخر کر دیا ہے۔‘‘

اللہ نے تمام موجودات جن کو خداوند عالم کی ملکیت قرار دیا گیا ہے وہ سب کی سب انسان کے لئے تسخیر شدہ اشیاء میں بھی ذکر کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ آیاتِ تسخیر میں بھی ’’مافی السمٰوٰت وما فی الارض‘‘ کے الفاظ ہیں اور آیات ملکیت خدا میں بھی ’’مافی السموات وما فی الارض ‘‘یا ’’للہ ما فی السموات ومافی الارض‘‘ کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ آسمانی اشیاء کی تسخیر کا جو مفہوم ہماری نظر میں جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَجرامِ فلکی کو انسانوں کی زندگی کے فائدے کے لئے مسخر اور مغلوب کر دیا ہے۔ سورج کی کرنیں جو نباتات اور حیوانات کی پرورش اور ان کی زندگی کی بقاء میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کو کثیر فوائد بخشتی ہیں۔ یہ کرنیں متواتر پڑتی رہتی ہیں اور انسان بھی مختلف شکلوں میں ان کے نور سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔ چاند کی قوت جاذبہ دریاؤں اور سمندروں کے مدو جزر میں تنظیم پیدا کرتی ہے، اس کے نور سے تاریک رات روشن ہو جاتی ہے اور انسان اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ستاروں سے لوگ صحراؤں اور دریاؤں میں

---

(۱) لقمان، ۳۱: ۲۰

(۲) الجاثیہ، ۴۵: ۱۳

راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح ارضی موجودات کا ایک وسیع و عریض حصہ انسانوں کی بہرہ یابی کا مورد بنا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان اشیاء میں سینکڑوں دیگر ایسے مفادات بھی موجود ہوں جنہیں انسان آج تک سمجھنے پر قادر نہ ہوا ہو۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اجرام فلکی اور آسمانی وُسعتوں میں پائی جانے والی اشیاء کو نوع انسانی کے فائدے کے لئے کچھ اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ انسان جانے انجانے میں ان کے منافع سے مستفید ہو رہا ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ سماوی موجودات کی تسخیر کا مفہوم صرف ان مفادات تک محدود قرار دیں جو غیر اختیاری طور پر ان اشیاء سے حاصل کئے جاتے ہیں؟ کیا انسان کے لئے اجرامِ فلکی کی تسخیر کو اس قدر وسیع معنی میں نہیں لیا جا سکتا جو اختیاری یا غیر اختیاری ہر دو قسم کے منافع کو شامل ہوں اور ان طبعی ذخائر سے حاصل کئے جانے والے تمام منافع مراد ہوں؟ خداوند عالم نے دریاؤں اور سمندروں کو انسان کے لئے مسخر کیا تاکہ وہ ان کے فوائد سے بہرہ مند ہو۔ ان میں بعض فوائد بلا ارادہ و اختیار ہمیں حاصل ہو جاتے ہیں، مثلاً سورج دریاؤں پر چمکتا ہے تو پانی بخارات بن جاتا ہے۔ وہ فضاؤں میں جا کر بارش برسانے والے بادلوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں پھر ہوا کے ذریعے یہ بادل ہماری فضاؤں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور ہمارے کھیت جو سمندروں سے سینکڑوں کلومیٹر دور ہیں یہ بادل وہاں آ کر برستے ہیں۔ وہ ان کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں کہ جن سے ہماری زندگی کی بقاء و تسلسل کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان عوامل میں سے کوئی ایک بھی ہمارے اختیار میں نہیں اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تحت اس کے مقرر کردہ تکوینی قوانین کے مطابق خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ ان غیر اختیاری مفادات کے مقابلے میں انہیں سمندروں کی تسخیر سے ہم اختیاری مفادات حاصل کرنے پر بھی قادر ہیں اور یہ اس مہربان پروردگار کے فیض بیکراں کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنی کوشش کے سائے میں ان ذخائر سے بہت زیادہ فائدے اُٹھا لیتے ہیں۔ ان سمندروں کے پانی میں ہماری کشتیاں اور بحری جہاز رواں دواں رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہماری معاشیات کا پہیہ گھومتا رہتا ہے اور اِسی تجارتی عمل سے ہماری زندگی قائم و دائم ہے۔ یہی حقیقت پروردگار نے یوں بیان فرمائی ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَاۚ وَتَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ○(۱)

’’اور وہی ہے جس نے (فضا و بر کے علاوہ) بحر (یعنی دریاؤں اور سمندروں) کو بھی مسخر فرما دیا تاکہ تم اس میں سے تازہ (و پسندیدہ) گوشت کھاؤ اور تم اس میں سے موتی (وغیرہ) نکالو جنہیں تم زیبائش کے لئے پہنتے ہو، اور (اے انسان!) تُو کشتیوں (اور جہازوں) کو دیکھتا ہے جو (دریاؤں اور سمندروں کا) پانی چیرتے ہوئے اس میں چلے جاتے ہیں، اور (یہ سب کچھ اس لئے کیا) تاکہ تم (دور دور تک) اس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرو اور یہ کہ تم شکرگزار بن جاؤ○‘‘

ایک اور مقام پر اس پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

اَللهُ الَّذِیْ سَخَّرَلَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ○(۲)

’’اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے قابو میں کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اُس میں جہاز اور کشتیاں چلیں اور تاکہ تم (بحری راستوں سے بھی) اُس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کر سکو، اور اس لئے کہ تم شکرگزار ہو جاؤ○‘‘

آسمانی موجودات سے فائدہ اُٹھانے کو بھی ارضی موجودات کے منافع کی مثل قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے تسخیری قانون سے انسان کو غیر اختیاری فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ انسان اپنی کوشش اور محنت کے ذریعے

(۱) النحل، ۱۶: ۱۴

(۲) الجاثیہ، ۴۵: ۱۲

انہیں اجرامِ فلکی سے کچھ اختیاری منافع حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے۔

انسان نے اَفلاک کی طرف سفر کرنے کا آغاز کر دیا ہے، وہ چاند کے کُرے پر قدم رکھ چکا ہے اور اب وہ زہرہ و مریخ کی تسخیر کے خیال کو پروان چڑھا رہا ہے۔ آج انسان نے خلائی جہاز تیار کر لئے ہیں اور انہیں اس فضاء بسیط میں رواں کر رہا ہے۔ اس وقت زمین سے چاند تک آمد و رفت کر رہا ہے، چاند گاڑی کے ذریعے کرۂ ماہ پر اُتر گیا اور اس کے پتھر لے آیا تاکہ زمین پر ان کی تحقیق و تفتیش کرے۔ اب انسان نے ایک ایسی بیٹری ایجاد کر لی ہے جو سورج کی کرنوں سے توانائی ذخیرہ کر لیتی ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے ایک طرف چاند کے سفر میں آلات کو چلایا جا سکے اور دوسری طرف زمین اور چاند کے مابین پیغام رسانی کا رابطہ برقرار رکھا جا سکے۔ پس انسان بیک وقت سورج اور چاند ہر دو سے اختیاری مفادات حاصل کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آج انسان فضاؤں کی تسخیر میں اپنا ابتدائی قدم اُٹھا چکا ہے اور کچھ حد تک کامیابیاں حاصل کر چکا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ دو صدیوں میں وہ اس حد تک کامیابیاں حاصل کر لے کہ ہمارا اس وقت ان کا تصور کرنا بھی ناممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ارضی و سماوی ہر دو موجودات کی تسخیر کی نوید ایک ہی آیت میں سنائی اور فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ. (۱)

”اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ سب کچھ تسخیر کر رکھا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔“

چونکہ آسمانوں اور زمین کے سارے موجودات کا مالک اللہ تعالیٰ، اس لئے ان کی تسخیر کا مژدہ انسان کے لئے ایسا پروانہ ہے جو اس جہان کے مالک نے انسان کے فائدے کے لئے صادر فرمایا ہے۔ اس طرح اس نے انہیں اجازت دے دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اشیائے ملکیت میں خود محنت کریں اور رضائے الٰہی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے

(۱) الجاثیۃ، ۴۵:۱۳

ان سے خوب خوب فائدہ اُٹھائیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت تکوینی نہ ہوتی تو وسیع و عریض سمندروں میں کشتیاں صدیوں سے تیرنے پر کبھی قادر نہ ہوسکتیں۔ کیونکہ یہ سب سمندر خداوند عالم کی ملکیت ہیں۔ اسی طرح اگر خالق کائنات کی اجازت اور اس کا قانون آفرینش اس طرح کا نہ ہوتا تو آج یہ خلائی راکٹ اس اَمر پر قدرت نہ پاتے کہ اس وسیع فضاء میں پرواز کریں کیونکہ فضائیں بھی حق تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ اگر رب العزت کی اجازت نہ ہوتی تو انسان کے لئے ماضی یا حال میں عمیق دریا میں غوطے لگا کر موتیوں اور مروارید کو نکالنا ممکن نہ ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا تکوینی اذن نہ ہوتا تو آج کا انسان چاند کے کرے پر اُترنے اور وہاں سے پتھر اور کنکر لے کر واپس زمین پر آنے پر قادر نہ ہوتا۔ مختصر یہ کہ انسان ارضی و سماوی موجودات سے متعلق جس قدر کامیابیاں حاصل کر چکا ہے یا مستقبل میں حاصل کرے گا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسخیر کر دینے اور اس کے اجازۂ تکوینی کا نتیجہ ہے۔ فرزند آدم طبیعی طور پر متجسس پیدا ہوا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ طبیعی حوادث کے علل و اسباب سے واقف ہو جائے اور اسے ہر حادثے کی وجہ معلوم ہو جائے۔ انسان کی عقل، فکر، ہوش اور دیگر خداداد صلاحیتیں اس کی جستجو اور تلاش کی خواہش کو پورا کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں اور اسرار خلقت پر آگاہی حاصل کرنے میں اس کے کام آتی ہیں۔

انسان ایک لمبے عرصے سے اس کتاب کے مطالعے میں لگا ہوا ہے، اس لئے بہت سے پوشیدہ حقائق کی شناخت حاصل کرنے اور ناشناخت رازوں پر سے پردہ اُٹھانے میں بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس طرح ’’ملکِ خدا‘‘ میں اس کے تصرفات کی حدود میں بھی اسی قدر وسعت آتی گئی ہے۔ انسان کا یہ مطالعہ کائنات ابھی ختم نہیں ہوا اور اِس کی عملی تحقیقات آگے بڑھ رہی ہیں۔ بہت سی باتیں جو آج تک معلوم نہیں ہیں وہ کل معلوم ہو جائیں گی۔ پس اسی نسبت سے انسان کا زمین و آسمان کی موجودات پر تسلط بھی بڑھتا جائے گا۔ آج کا انسان اپنے علم اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر زمین و ہوا اور سمندر کی سطح

عمق پر غلبہ حاصل کر چکا ہے، طبعی ذخائر و معاون پر اختیار حاصل کئے ہوئے ہے اور اب اس کی نگاہیں اجرام فلکی پر لگی ہوئی ہیں۔ انسان زمین میں اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ گونا گوں خزانوں کو اپنے قبضہ قدرت میں لے چکا ہے، اس ذات کی عطا کردہ تسخیری قوت سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے اور پروردگار کی ملکیت میں اپنی کارگزاریوں کے میدان کو بہت وسیع کر چکا ہے۔ لیکن افسوس کہ انسانوں کی اکثریت نے ملکیت خدا میں تصرف کرنے کے باوجود مالک کو بھلا دیا ہے اور مخلوقات خدا سے فائدہ اُٹھانے کے باوجود خالق کو فراموش کر چکے ہیں۔ کئی انسان تو ایسے بھی ہیں جو اپنی علمی اور صنعتی کامیابیوں پر اس قدر مغرور ہو چکے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ خود اپنے خالق کی پرستش و عبادت کی بات تک نہیں کرتے بلکہ دوسرے لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی پوجا کریں اور ان کے سامنے بندگی کا سر جھکائیں۔ دین اِسلام نے انسانوں کو اس کتاب آفرینش کا مطالعہ کرنے اور اس میں غوروفکر کرنے کی تشویق فرمائی اور اس کو اِسلام کی عظیم ترین عبادات میں شمار کیا ہے۔ اِسلام نے لوگوں پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ کائنات کے اس حکیمانہ نظام کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی عقل اِستعمال کریں۔ وہ اِس منظّم جہان کے اسباب و مسبّبات اور علل و معلولات کے بارے میں غوروفکر کریں تاکہ اس جہان کے اسرار و رموز پر آگاہ ہونے سے ان کے خالق کی قدرت و عظمت پر آگاہ ہو سکیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ط يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ لا وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ○[1]

”اللہ (ہی) ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین (کی تشکیل) میں بھی انہی کی مِثل (تہ بہ تہ سات طبقات بنائے)، ان کے درمیان (نظامِ قدرت کی تدبیر کا) امر اترتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر بڑا قادر

(۱) الطلاق، ۶۵: ۱۲

ہے، اور یہ کہ اللہ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ فرما رکھا ہے۔ (یعنی آنے والے زمانوں میں جب سائنسی اکتشافات کامل ہوں گے تو تمہیں اللہ کی قدرت اور علمِ محیط کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح اُس نے صدیوں قبل ان حقائق کو تمہارے لئے بیان فرما رکھا ہے)o‘‘

تصورِ ملکیت

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کا ہر نظامِ معیشت دراصل ’’تصورِ ملکیت (Concept of Ownership)‘‘ ہی پر قائم ہے۔ تصورِ ملکیت سے اس کے اساسی اصول اور تفصیلات و جزئیات متعین ہوتی ہیں اور اسی سے اس کے نفاذ کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی متحقق ہوتی ہے۔ لہٰذا تصورِ ملکیت کسی بھی نظامِ معیشت کی تشکیل میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت اقوامِ عالم میں بالعموم سرمایہ دارانہ اور اشتراکی، دو نظام ہائے معیشت رائج اور مقبول ہیں، جنہیں "Capitalistic System of Economy and Socialistic System of Economy" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ان دونوں نظاموں میں کارفرما ’’تصورِ ملکیت‘‘ کی اصل ہیئت اور فلسفے پر غور کیا جائے تو وہ ایک ہی ہے۔ فرق صرف حدود کے تعین کا ہے۔ پہلے میں ملکیت کی انفرادی حدود میں وسعت کی ضمانت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ دوسرے میں اجتماعی حدود کی۔ جہاں تک ملکیت کے معنی و مفہوم، اس سے جنم لینے والے حقوق و واجبات اور اس کے قانونی اثرات و لوازمات کا تعلق ہے، وہ یکساں ہیں۔ ان پہلوؤں پر عمیق غور و خوض کے بعد انسان بغیر شک و شبہ کے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ ’’تصورِ ملکیت‘‘ اپنے مزاج اور خصائص کے اعتبار سے خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ رجحان کا حامل ہے۔

اس تصورِ ملکیت سے جو بھی نظامِ معیشت تشکیل پائے گا، اس کی خاصیت مطالبہ حقوق (Demand of Rights) ہو گی، جس کا لازمی نتیجہ انفرادی اور اجتماعی حقوق کے درمیان تصادم ہے۔ اس سے طبقاتی بغاوت اور منافرت میں بھی اضافہ ہو گا اور ملکی پیداوار

بھی بہرصورت متاثر ہوگی۔ حقوق اور مفادات کے اس تصادم کو آج تک دونوں نظام ہائے معیشت میں سے کوئی بھی صحیح طور پر رفع نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود غرضانہ ''تصورِ ملکیت'' کے تحت فروغ پانے والے کسی بھی نظامِ معیشت میں اس رجحان کو ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اصل خرابی اسی تصور سے نمو پا رہی ہے جو پورے نظام کی بنیاد ہے۔ لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے اصلاح کی کوئی بھی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے بحیثیت نظامِ معیشت دہندہ بنی نوع انسان کو اقتصاد و معیشت کے وہ عظیم انقلابی تصورات اور عملی اصول وضوابط عطا فرمائے جس سے بہتر کوئی تصور، فکر یا فلسفہ معرض وجود میں نہیں آ سکتا جس طرح آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات حتمی و ختمی مرتبت ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے عطا کردہ نظامِ فکر و عمل کا ہر پہلو بھی نقطہ تمامیت اور رتبہ خاتمیت کا حامل ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے تعلیمات کو قرآن و سنت کے روپ میں جس نقطہ کمال تک پہنچا دیا ہے، انسانی فکر و دانش ارتقاء کی تمام منزلوں کو عبور کرکے بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اقبال اس منزلِ آخریں کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتا ہے:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست[۱]

ان اعلیٰ تصورات میں سے ایک بنیادی تصور، تصورِ ملکیت (Concept of Ownership) ہے۔ اس کا معنی و مفہوم ایک ایسے نئے انقلابی اسلوب میں متعین کیا گیا کہ جس سے نظامِ معیشت کے مجموعی مزاج اور خصائص میں بڑی بنیادی اور ٹھوس تبدیلی واقع ہوگئی۔ اس تصورِ ملکیت نے اسلام کے نظامِ معیشت کو ان تمام خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ رجحانات سے پاک کر دیا، جو اقتصادی اور معاشرتی زندگی کو تباہ کن نتائج سے دوچار کر رہے تھے۔

(۱) اقبال، کلیات (جاوید نامہ): ۶۰۰

۱۔ ملکیت کی لغوی تحقیق

''ملکیت'' عربی اور اردو زبان میں عام مستعمل ہے اس کا مادہ ''ملک'' ہے جس کے معنی بیان کرتے ہوئے علی بن محمد الجرجانی (۷۴۰۔۸۱۶ھ) اپنی کتاب ''التعریفات'' میں لکھتے ہیں:

الملك: حالة تعرض للشيء بسبب ما يحيط به. (۱)

''ایسی حالت جو کسی چیز کو ایسے سبب کے ذریعے پیش آئے جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔''

فقہاء کے نزدیک:

الملك: إتصال شرعي بين الإنسان وبين شيء يكون مطلقاً لتصرفه فيه وحاجزاً عن تصرف غيره فيه. (۲)

''الملک ایک شرعی اتصال ہے جو کسی انسان اور ایسی چیز کے درمیان ہو جس میں وہ (انسان) تو تصرف کر سکے لیکن کوئی اور دوسرا اس میں تصرف نہ کر سکے۔''

۲۔ مفہوم ملکیت

کسی چیز کی ملکیت (Ownership) درحقیقت اس چیز میں کسی شخص کے درج ذیل دو حقوق پیدا ہونے سے عبارت ہوتی ہے:

۱۔ حقِ قبضہ (Right of Possession)

۲۔ حقِ تصرف (Right of Disposition)

(۱) جرجاني، التعريفات: ۲۸۴

(۲) جرجاني، التعريفات: ۲۸۴

اسی طرح جس شخص کو کسی چیز پر مذکورہ بالا حقوق حاصل ہو جائیں تو اسے چیز کا مالک (Owner) اور اس چیز کو اس کی ملکیت (Property) تصور کیا جائے گا۔ مذکورہ حقوق کے ساتھ ساتھ اس شخص کو اپنی ملک اشیاء کے استعمال، تحفظ، مزید نفع کمانے کے لئے کاروبار میں لگانے اور انتقالِ ملکیت کے حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ملکیت کی تعریف

مذکورہ بالا بحث کے تحت ملکیت کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

’’جب کسی شخص کو کسی مال/ شے پر اپنا قبضہ قائم رکھنے اور حسبِ منشاء تصرف کرنے کا حق حاصل ہو جائے تو اس حق کو ’’ملکیت‘‘ کہتے ہیں۔‘‘

۴۔ مالک اور ملکیت میں افادیت کا پہلو

اللہ تعالیٰ نے زمین میں جس چیز کو بھی بقا عطا کی ہے اور اسے محلِ ملکیت (یعنی ملکیت میں آنے کے قابل) بنایا ہے اس کے اندر بنی نوع انسان کیلئے یقیناً کوئی نہ کوئی نفع بخشی، سودمندی اور افادیت (Usufruct) مضمر ہوتی ہے۔

یہ تصور قرآن حکیم کی درج ذیل آیات سے ماخوذ ہے:

۱۔ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا.(۱)

’’وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔‘‘

۲۔ وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ط قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ o(۲)

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۹

(۲) الاعراف، ۷: ۱۰

’’اور بیشک ہم نے تم کو زمین میں تمکّن وتصرّف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسبابِ معیشت پیدا کئے، تم بہت ہی کم شکر بجا لاتے ہو‘‘o

۳۔ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ هُوَ اَعْمٰی ط اِنَّمَا يَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِo(۱)

’’بھلا وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے حق ہے، اس شخص کے مانند ہوسکتا ہے جو اندھا ہے، بات یہی ہے کہ نصیحت عقلمند ہی قبول کرتے ہیںo‘‘

۴۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ط فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَکُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًاo(۲)

’’اور عورتوں کو ان کے مَہر خوش دلی سے ادا کیا کرو، پھر اگر وہ اس (مَہر) میں سے کچھ تمہارے لئے اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو تب اسے (اپنے لئے) سازگار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤo‘‘

۵۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللهُ لَکُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاکْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاo(۳)

’’اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کروo‘‘

سورۃ النساء کی آیت ۵ میں ’’اَمْوَالَکُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللهُ لَکُمْ قِيٰمًا‘‘ کے الفاظ

(۱) الرعد، ۱۳: ۱۹
(۲) النساء، ۴: ۴
(۳) النساء، ۴: ۵

قابلِ غور ہیں ان میں اموال کی ذاتی خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ یہ انسانی زندگی کے قیام اور اس کی بقا کا باعث ہوتے ہیں یعنی ان میں اس قدر اہم منفعت مضمر ہے کہ ان پر انسانی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ بنابریں باری تعالیٰ نے مال و دولت، ذرائع معیشت اور تمام دنیوی اسباب و وسائل کو ''متاع'' قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

۶۔ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِي الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ○[1]

''تم نیچے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب تمہارے لئے زمین میں ہی معیّنہ مدت تک جائے قرار ہے اور نفع اٹھانا مقدّر کر دیا گیا ہے○''

کائناتِ انسانی کے اموال میں مضمر عمومی نفع بخشی اور فیض رسانی کی وہ خوبی جس کی بناء پر اسے ''متاع'' قرار دیا گیا ہے۔ لفظ متاع کا معنی نفع اور فائدہ ہے اس لئے زندگی کے تمام اموال کو قرآنی اصطلاح میں ''مَتَاعُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا'' کہا جاتا ہے کیونکہ انسان ہر وقت ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

۷۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ وَالۡقَنَاطِيۡرِ الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ وَالۡخَيۡلِ الۡمُسَوَّمَةِ وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَرۡثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ ○[2]

''لوگوں کے لئے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشان کئے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)، یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے○''

مال کی اسی ذاتی خصوصیت کے باعث اسے خیر اور فضل سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:

(۱) البقرة، ۲: ۳۶

(۲) آل عمران، ۳: ۱۴

۸۔ کُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا. [۱]

''تم پر فرض ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے اگر کچھ مال چھوڑے۔''

۹۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌO [۲]

''اور بے شک وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہےO''

۱۰۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ
وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَO [۳]

''پھر جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور (پھر) اللہ کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرنے لگو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤO''

۵۔ بالقوہ افادیت اور بالفعل افادیت

ہر شے کے اندر مخفی (Potential) طور پر موجود نفع بخشی اور سود مندی کی یہ خصوصیت جو اللہ تعالیٰ نے اس کی غرض تخلیق کے طور پر پیدا کی ہے جب تک بالفعل ظاہر (Actualise) نہ ہو بنی نوع انسان اس سے کوئی عملی اور حقیقی فائدہ نہیں اٹھا سکتی اس لئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ہر مال (Property) کی بالقوہ افادیت (Potentia Utility) کو بالفعل افادیت (Actual Utility) میں بدلنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اس کی یہ طبعی اور خلقی خصوصیت غیر سودمند، بے جان اور غیر متحرک بن کر نہ پڑی رہے بلکہ اس سے صحیح معنوں میں خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے یعنی جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا وہ واقعتاً پورا ہو سکے۔

---

(۱) البقرۃ، ۲:۱۸۰

(۲) العادیات، ۱۰۰:۸

(۳) الجمعۃ، ۶۲:۱۰

٦۔ علّتِ ملکیت

مذکورہ بالا مقصد ہی حقیقت میں مختلف اشیاء و اموال پر کسی کے حقِ ملکیت کے تسلیم کئے جانے کی اصل علت (Effective Cause) ہے۔ جب تک ان اشیاء و اموال پر کسی کو قبضہ وتصرف کا حق حاصل نہیں ہو جاتا اس پر کوئی محنت نہیں کی جاسکے گی اور جب تک اس پر کوئی منظّم محنت نہ ہوگی اس کی مخفی صلاحیت اجاگر نہیں ہوسکے گی۔ لہٰذا مختلف ذرائع سے کسی شے پر کسی شخص کا حقِ ملکیت اس لئے متحقق ہوتا ہے کہ اس طرح اس شے میں اس کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس دلچسپی کی بنا پر وہ اسے واقعتاً خلقِ خدا کے لئے نفع بخش اور سود مند بنانے کیلئے تیار ہوتا ہے۔ گویا ''ملکیت'' کسی شے کو انتفاع (فائدہ اٹھانے) کے قابل بنانے کا ذریعہ ہے، اصل مقصود ہرگز نہیں ہے۔ اس لئے شریعت نے مردہ اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے والے کا حقِ ملکیت تسلیم کیا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

١ ۔ من أحيا أرضاً ميتةً فهي له.[١]

''جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔''

٢ ۔ من أعمر أرضاً ليست لأحد فهو أحق.[٢]

---

(١) ١۔ أبو داود، السنن، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في إحياء الموات، ٣: ١٧٨، رقم: ٣٠٧٣

٢۔ نسائي، السنن الكبرى، ٣: ٤٠٥، رقم: ٥٧٦١

٣۔ أحمد بن حنبل، المسند، ٣: ٣٣٨، رقم: ١٤٦٧٧

(٢) ١۔ بخاري، الصحيح، كتاب المزارعة، باب من أحيا أرضًا مواتاً، ٢: ٨٢٣، رقم: ٢٢١٠

٢۔ بيهقي، السنن الكبرى، ٦: ١٤١، رقم: ١١٥٥١

’’جس نے کسی زمین کو آباد کیا اور کسی کی نہ تھی تو آباد کرنے والا اس زمین کا مستحق ہوگا۔‘‘

اسی اصول کی بنا پر قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو مال و جائیداد کے صحیح انتظام وانصرام کا شعور نہ ہو، مال و جائیداد ان کے سپرد نہ کرو خواہ وہ فی الحقیقت انہی کے ملکیتی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اصل مقصود ملکیت یعنی قبضہ و تصرف نہیں بلکہ ان اموال کی افادیت اور نفع بخشی کی صحیح بحالی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

۱۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ (۱)

’’اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کرو۝‘‘

مستزاد یہ کہ یتیم بچوں کے سرپرستوں کو بھی یہ ہدایت اسی اصول کے تحت دی گئی ہے کہ جب تک وہ بلوغ اور رشد کی صحیح حد کو نہ پہنچیں ان کے ملکیتی اموال ان کے حوالے نہ کرو۔ یعنی ان اموال پر ان کے قبضہ اور تصرف کا حق تب بحال ہوگا جب وہ ان کی اصل افادیت اور نفع بخشی کی صلاحیت کو کماحقہ اجاگر کرنے اور محفوظ رکھنے کے ہو جائیں گے۔

۲۔ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ. (۲)

’’اور یتیموں کی (تربیۃً) جانچ اور آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ نکاح (کی

(۱) النساء، ۴: ۵

(۲) النساء، ۴: ۶

عمر) کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں ہوشیاری (اورحُسنِ تدبیر) دیکھ لو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔‘‘

مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوا کہ افراد کو تفویضِ مال کی شرط مال و جائیداد کے مصالح و منافع کی حفاظت و رعایت کی اہلیت ہے تاکہ ملکیتِ مال کا اصل مقصد یعنی انتفاع کی خصوصیت متاثر نہ ہونے پائے۔

۷۔ حقِ انتفاع کی حقیقت (Usufructuary Right)

اشیاء و اموال سے نفع اٹھانے اور ان سے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کا حق (Usufructuary Right) اصلاً تمام بنی نوع انسان میں یکساں طور پر ودیعت کیا گیا ہے لیکن ترتیب میں مالک کا حق قابض ومتصرف ہونے کے باعث دوسروں پر مقدم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی قرآن مجید نے مال و جائیداد کے مالکوں کو ان کے اپنے ملکیتی اموال میں سے دوسروں یعنی غیر مالکوں کو فائدہ پہنچانے کا حکم دیا ہے تو مستحقین کے انتفاع کو بطورِ حق (Lawful Right) بیان کیا گیا ہے خواہ وہ اقرباء ہوں یا یتامیٰ و مساکین، سائلین ہوں یا محرومین۔ قرآن مجید مالداروں کے مال میں محرومین اور مستحقین کا حق تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہیں ان کا حق ادا کرو۔ ارشادِ ربّانی ہے:

۱۔ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ O [1]

’’اور ان کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجتمندوں) کا حق مقرر تھا O‘‘

۲۔ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ O لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ O [2]

’’اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے O مانگنے والے

(۱) الذاریات، ۵۱: ۱۹

(۲) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵

اور نہ مانگنے والے محتاج کاo‘‘

۳۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ط ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللهِ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo (۱)

’’پس آپ قرابت دار کو اس کا حق ادا کرتے رہیں اور محتاج اور مسافر کو (ان کا حق)، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضامندی کے طالب ہیں، اور وہی لوگ مراد پانے والے ہیںo‘‘

۴۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًاo (۲)

’’اور قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو اور محتاجوں اور مسافروں کو بھی (دو) اور (اپنا مال) فضول خرچی سے مت اڑاؤo‘‘

مستزاد یہ ہے کہ لینے والے کا حق اتنا ہی ضروری اور پاکیزہ ہے جتنا کہ دینے والے کا اپنا حق۔ یعنی مستحق افراد کا حق مالک کے حق سے کسی لحاظ سے کمتر یا گھٹیا نہیں ہے۔

۵۔ ارشاد فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ. (۳)

’’اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا کرو اور اس میں

(۱) الروم، ۳۰: ۳۸
(۲) بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۶
(۳) البقرۃ، ۲: ۲۶۷

سے گندے مال کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کا ارادہ مت کرو کہ (اگر وہی تمہیں دیا جائے تو) تم خود اسے ہرگز نہ لو۔‘‘

یہاں دیگر مستحقین کا حقِ انتفاع اصلاً مالک کے حقِ انتفاع کے برابر قرار دیا گیا ہے اور کسی کے حق کو دوسرے کے حق پر ماھیۃً ترجیح نہیں دی گئی۔ ہاں ترتیب میں ترجیح ضرور موجود ہے۔

۶۔ حقِ انتفاع کے برابر ہونے کا ذکر ایک اور مقام پر یوں کیا گیا ہے:

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ط سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَo (۱)

’’اور اُس کے اندر (سے) بھاری پہاڑ (نکال کر) اس کے اوپر رکھ دیئے اور اس کے اندر (معدنیات، آبی ذخائر، قدرتی وسائل اور دیگر قوتوں کی) برکت رکھی، اور اس میں (جملہ مخلوق کے لئے) غذائیں (اور سامانِ معیشت) مقرر فرمائے (یہ سب کچھ اس نے) چار دنوں (یعنی چار ارتقائی زمانوں) میں مکمل کیا، (یہ سارا رزق اصلاً) تمام طلب گاروں (اور حاجت مندوں) کے لئے برابر ہےo‘‘

امام زمخشری (م ۵۲۸ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قدر فيها الأقوات لأجل الطالبين لها المحتاجين إليها من المقتاتين. (۲)

’’اللہ تعالیٰ نے اس (زمین) میں ضرورت مندوں، محتاجوں اور محنت کشوں کے لئے رزق مقدر کر دیا ہے۔‘‘

(۱) حم السجدة، ۴۱: ۱۰

(۲) زمخشري، الكشاف، ۴: ۱۸۷

سائلین کا یہی مفہوم تفسیر بحر المحیط، روح المعانی اور الجواھر میں بھی بیان ہوا ہے، الزجاج نے بھی اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔

۸۔ حقِ تملّک کی حقیقت (Proprietary Right)

انسان فطری طور پر اپنی ضروریات کو پورا کرنا چاہتا ہے خصوصی طور پر زندگی کے بنیادی لوازمات خوراک، تن پوشی، رہائش و دیگر دنیاوی احتیاجات سے نمٹنے کے لئے اسے روپے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے جس کے لئے وہ اکتسابِ مال کے لئے سعی وکوشش کرتا ہے۔ مال کمانا، اسے صرف کرنا اور جمع رکھنے کی خواہش بھی کرتا ہے۔ دینِ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں میں اپنی تعلیمات کی (حدود وقعود) کے ساتھ آزادی دی ہے۔ اس طرح فرد کی انفرادی اور اجتماعی ملکیت کے امور کو تسلیم کیا ہے۔

(ا) حقِ تملّک قرآن مجید کی روشنی میں

قرآنِ مجید میں بیان کردہ حقِ ملکیت کی وضاحت درج ذیل آیات سے کی جاسکتی ہے:

۱۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○ (۱)

”اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کرو○“

۲۔ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ. (۲)

(۱) النساء، ۴: ۵

(۲) سبا، ۳۴: ۱۵

''تم اپنے رب کے رزق سے کھایا کرو اور اس کا شکر بجالایا کرو۔''

۳۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝(۱)

''تم ہلکے اور گراں بار (ہر حال میں) نکل کھڑے ہو اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم (حقیقت) آشنا ہو۔''

۴۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝(۲)

''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، یہاں تک کہ تم ان سے اجازت لے لو اور ان کے رہنے والوں کو (داخل ہوتے ہی) سلام کہا کرو یہ تمہارے لئے بہتر (نصیحت) ہے تاکہ تم (اس کی حکمتوں میں) غور وفکر کرو۔''

۵۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝(۳)

''پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے اعلانِ جنگ پر خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لئے تمہارے اصل مال (جائز) ہیں، نہ تم خود ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

۶۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ

(۱) التوبۃ، ۹: ۴۱

(۲) النور، ۲۴: ۲۷

(۳) البقرۃ، ۲: ۲۷۹

وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○[۱]

’’اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور (اے حبیب!) آپ (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں○‘‘

۷۔ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○[۲]

’’اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے○ مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا○‘‘

۸۔ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ج فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ج وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا ط وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ج وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ط فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ ط وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ○[۳]

’’اور یتیموں کی (تربیۃً) جانچ اور آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں ہوشیاری (اور حُسنِ تدبیر) دیکھ لو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو، اور ان کے مال فضول خرچی اور جلد بازی میں (اس اندیشے سے) نہ کھا ڈالو کہ وہ بڑے ہو (کر واپس لے) جائیں گے، اور جو کوئی خوشحال ہو وہ (مالِ یتیم سے) بالکل بچا رہے اور جو (خود) نادار ہو اسے (صرف) مناسب حد تک کھانا چاہیے، اور جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنے لگو تو ان پر گواہ بنا لیا کرو، اور حساب لینے والا اللہ ہی کافی ہے○‘‘

---

(۱) البقرۃ، ۲: ۱۵۵

(۲) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵

(۳) النساء، ۴: ۶

۹۔ وَّ اٰتُوۡھُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ.(۱)

’’اور تم (خود بھی) انہیں اللہ کے مال میں سے (آزاد ہونے کے لئے) دے دو جو اس نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔‘‘

۱۰۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَھُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَھُمۡ لَھَا مٰلِکُوۡنَ○(۲)

’’کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے دستِ قدرت سے بنائی ہوئی (مخلوق) میں سے اُن کے لئے چوپائے پیدا کیے تو وہ ان کے مالک ہیں○‘‘

۱۱۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ.(۳)

’’اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ۔‘‘

۱۲۔ لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ.(۴)

’’(اے مسلمانو!) تمہیں ضرور بالضرور تمہارے اموال اور تمہاری جانوں میں آزمایا جائے گا۔‘‘

(۲) حقِ تملّک احادیث کی روشنی میں

قرآنی آیات کی طرح احادیثِ نبوی ﷺ میں بھی حقِ ملکیت کا جو تصور ملتا ہے۔ وہ درج ذیل ارشاداتِ نبوی ﷺ سے واضح ہو جاتا ہے:

۱۔ من أحيا أرضاً ميتةً فهي له.(۵)

(۱) النور، ۲۴: ۳۳

(۲) یٰس، ۳۶: ۷۱

(۳) النساء، ۴: ۲۹

(۴) آل عمران، ۳: ۱۸۶

(۵) ۱۔ ترمذي، السنن، كتاب الأحكام عن رسول الله ﷺ، باب ما ذكر في إحياء —

’’جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ملکیت ہو گی۔‘‘

۲۔ من أعمر أرضاً ليست لأحد فهو أحق.(۱)

’’جس نے کسی زمین کو آباد اور کسی کی نہ تھی تو آباد کرنے والا اس زمین کا مستحق ہوگا۔‘‘

۳۔ من سبق إلى ماء لم يسبقه إليه مسلم فهو له.(۲)

’’جو شخص ایسے چشمہ کی طرف سبقت کرے جس کی طرف کسی نے سبقت نہیں کی تو وہ اس کی ملکیت تصور ہوگا۔‘‘

...... أرض الموات، ۳: ۶۶۲، رقم: ۱۳۷۸

۲۔ أبو داود، السنن، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في إحياء الموات، ۳: ۱۷۸، رقم: ۳۰۷۳

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۳۳۸، رقم: ۱۴۶۷۷

۴۔ ابن حبان، الصحيح، ۱۱: ۶۱۶، رقم: ۵۲۰۵

۵۔ نسائي، السنن الكبرى، ۳: ۴۰۵، رقم: ۵۷۶۱

۶۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶: ۹۹، رقم: ۱۱۳۱۸، ۱۱۳۱۹

۷۔ مقدسي، الأحاديث المختارة، ۳: ۲۹۷، ۲۹۸، رقم: ۱۰۹۶، ۱۰۹۸

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب المزارعة، باب من أحيا أرضًا مواتًا، ۲: ۸۲۳، رقم: ۲۲۱۰

۲۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶: ۱۴۱، رقم: ۱۱۵۵۱

۳۔ عسقلاني، الدراية في تخريج أحاديث الهداية، ۲: ۲۴۴، رقم: ۹۸۴

(۲) ۱۔ أبو داود، السنن، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في إقطاع الأرضين، ۳: ۱۷۷، رقم: ۳۰۷۱

۲۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۱۰: ۱۳۹

۳۔ ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ، ۷: ۷۳

۴۔ عيني، عمدة القاري، ۱۲: ۱۷۵

(۳) حقِ تملّک: فقہ اسلامی میں

تمام مذاہبِ فقہ میں فرد کے حقِ ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے اس ضمن میں باقاعدہ قوانین بنائے گئے ہیں مثلاً:

☆ قانونِ زکوٰۃ وعشر وصدقات

☆ قانونِ وراثت

☆ قانونِ نفقات/کفالت

☆ قانونِ وصیت

☆ قانونِ اجرت وغیرہ

مذکورہ بالا قواعد وقوانین کی تفصیل بمعہ امثلہ وعملی تنفیذ باب ''اسلامی معاشی نظام کی تنفیذ'' میں بیان کی گئی ہے۔

۹۔ انفرادی حقِ ملکیت

اسلام نے انفرادی ملکیت کا جو حق انسان کو دیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴۔۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

أن الله تعالی لما خلق الخلق وجعل معايشهم في الأرض وأباح لهم الانتقاع بما فيها وقعت بينهم المشاحة والمشاجرة فكان حكم الله عند ذلک تحريم أن يزاحم الإنسان صاحبه فيما اختص به لسبق يده إليه أو يد مورثه أو لوجه من الوجوه المعتبرة عندهم إلا بمبادلة أو تراض معتمد على علم من غير تدليس وركوب غرر، وأيضاً لما كان الناس مدنيين بالطبع لاتستقيم معايشهم إلا

بتعاون بينهم نزل القضاء بإيجاب التعاون وأن لا يخلو أحد منهم مماله دخل في التمدن إلا عند حاجة لا يجد منها بداً.[(۱)]

’’اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو ان کی معاش اور روزی بھی اسی (زمین پر) مقدر فرمائی اور زمین کی پیداوار سے ان کے لئے انتفاع مباح کیا اور چونکہ حرص کی وجہ سے ان کے درمیان نزاع پیدا ہوا تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہوا کہ کوئی شخص دوسرے کی مخصوص و مختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے اور یہ اس کی مخصوص چیز اس طرح ہو گی کہ اس چیز پر سب سے پہلے اس کا قبضہ ہوا ہے یا اس کے کسی مورث کا قبضہ تھا یا کسی ایسے طریقے سے اس چیز پر اس کا جو ان لوگوں میں مجموعی طور پر قبضہ اور ملکیت کے لئے معتبر مانا جاتا ہے اس قسم کے قبضہ اور ملکیت میں سوائے تبادلہ اور سوچ سمجھ کر بلا کسی فریب اور دھوکہ اور قابل اعتماد باہمی رضامندی کے کسی قسم کی مزاحمت کرنا حرام اور ناجائز ہے۔‘‘

۱۰۔ حقِ ملکیت کی صحت و مشروعیت کی شرائط

اشیاء و اموال پر افراد کا حقِ ملکیت قطعاً غیر مشروط نہیں ہے بلکہ وہ اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے کہ اموال کے مقررہ حقوق پورے کئے جائیں اور اموال کے مقررہ حقوق یہ ہیں کہ دوسروں کو بھی ان کے منافع میں شریک کیا جائے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

۱۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○[(۲)]

’’اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجتمندوں) کا حق مقرر تھا ○‘‘

(۱) شاه ولي الله، حجة الله البالغه، ۲: ۱۰۳

(۲) الذاريات، ۵۱: ۱۹

۲۔ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ○[1]

’’اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے○ مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا○‘‘

۳۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن في المال حقاً سوی الزکاة.[2]

’’بیشک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔‘‘

۴۔ جب تک مملوکہ مال کا حق مکمل طور پر ادا نہ کیا جائے اس کی ملکیت نہ صرف ناجائز رہتی ہے بلکہ عذابِ آخرت کا باعث بن جاتی ہے، ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

ما من صاحب کنز لا یؤدي حقه إلا جعله اللہ یوم القیامة یحمی علیھا في نار جھنم فتکوی بھا جبھته وجنبه وظھره.[3]

’’جس شخص کے پاس کوئی مال ہے اور وہ اس مال کی زکوٰہ نہیں دیتا تو قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں اس مال کو گرم کر کے اس شخص کی پیشانی، پسلی، پیٹھ داغے جائیں گے۔‘‘

(۱) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵

(۲) ۱۔ ترمذي، السنن، کتاب الزکاة، باب ما جاء أن المال حقاً سوی الزکاة، ۳: ۴۸، رقم: ۶۶۰

۲۔ دارقطني، السنن، ۲: ۱۲۵

۳۔ سعید بن منصور، السنن، ۵: ۱۰۰، رقم: ۹۲۶

(۳) ۱۔ أبو داود، السنن، کتاب الزکاة، باب في حقوق المال، ۲: ۱۲۴، رقم: ۱۶۵۸

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۶۲، رقم: ۷۵۵۳

۳۔ بیہقي، شعب الإیمان، ۳: ۱۹۰، رقم: ۳۳۰۲

اس سے ثابت ہوا کہ اسلام اموال کی ملکیت کو بلا شرط اور بلا قید تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کا جواز اور استحقاق صرف مقررہ حقوق کو پورا کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اموال مملوکہ کا استعمال ان شرائط اور قیود کے تحت کرتے تھے:

كان ابن عمر رضى الله عنهما لا يأكل حتى يؤتي بمسكين يأكل معه.(۱)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ جب تک کوئی حاجت مند مل کر کھانا نہ کھاتا، آپ کھانا تناول نہ فرماتے تھے۔''

۶۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كنا نعد الماعون على عهد رسول الله ﷺ همام الدلو و القدر.(۲)

''ہم عہدِ رسالت مآب ﷺ میں ڈول اور ہنڈیا تک کا عاریتاً ضرورت مندوں کو دینا ماعون تصور کرتے تھے۔''

یعنی ایسی اشیائے استعمال سے بھی دوسروں کو فائدہ اٹھانے دینا شرعاً لازمی تصور کرتے تھے اور ان کا منع کرنا اس قرآنی حکم ﴿وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾ [الماعون، ۱۰۷:۷] کے تحت ناجائز اور دین کی تکذیب تصور کرتے تھے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ملکیت کا جو تصور اپنے مبارک عمل سے واضح فرمایا اسے درج ذیل ارشادات سے سمجھا جا سکتا ہے:

۷۔ **لو كان لي مثل أحد ذهباً لسرّني أن لا تمر عليّ ثلاث ليال وعندي**

(۱) بخاري، الصحيح، كتاب الأطعمة، باب المؤمن يأكل في معي واحد، ۵: ۲۰۶۱، رقم: ۵۰۷۸

(۲) ا۔ أبو داود، السنن، كتاب الزكاة، باب في حقوق المال، ۲: ۱۲۴، رقم: ۱۶۵۷

۲۔ نسائي، السنن الكبرى، ۶: ۵۲۲، رقم: ۱۱۷۰۱

منه شيء إلا شيئًا أرصده لدين. (۱)

’’اگر میرے پاس احد (پہاڑ) کی مثل بھی سونا ہو تو مجھے تب خوشی ہوگی کہ اس پر تین راتیں نہ گزر جائیں (اور میں نے ان کو صدقہ نہ کیا ہو) اور میرے پاس سوائے اس شے کے جو میں نے دین ادا کرنے کے لئے رکھی ہے کچھ نہ ہو۔‘‘

۸۔ فلما فتح الله عليه الفتوح قال: أنا أولى بالمؤمنين من أنفسهم فمن توفي من المؤمنين فترک دينًا فعليّ قضاؤه ومن ترک مالاً فلورثته. (۲)

’’جب اللہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو فتوحات عطا فرمائیں تو آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں مؤمنین کا متولی ہوں جو ان میں سے فوت ہو جائے اور قرض چھوڑ جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمے ہے اور اگر مال چھوڑ گیا تو

---

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، کتاب الرقاق، باب قول النبي ﷺ ما يسرني أن عندي مثل أحد هذا ذهبًا، ۵: ۲۳۶۸، رقم: ۶۰۸۰

۲۔ مسلم، الصحيح، کتاب الزکاة، باب تغليظ عقوبة من لا يؤدي الزکاة، ۲: ۶۸۷، رقم: ۹۹۱

۳۔ ابن حبان، الصحيح، ۱۴: ۲۶۰، رقم: ۶۳۵۰

۴۔ بيهقي، السنن الکبری، ۵: ۳۵۴، رقم: ۱۰۴۳۸

(۲) ۱۔ بخاري، الصحيح، کتاب الکفالة، باب الدين، ۲: ۸۰۵، رقم: ۲۱۷۶

۲۔ مسلم، الصحيح، کتاب الفرائض، باب من ترک مالاً فلورثته، ۳: ۱۲۳۷، رقم: ۱۶۱۹

۳۔ ترمذي، السنن، کتاب الجنائز، باب ما جاء في الصلاة على الماوردي، ۳: ۳۸۲، رقم: ۱۰۷۰

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۴۵۳، رقم: ۹۸۴۷

۵۔ بيهقي، السنن الکبری، ۷: ۵۳، رقم: ۱۳۱۲۳

وہ اس کے ورثاء کا ہوگا۔‘‘

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ایسے تمام احکام کی عملی اہمیت کم کرنے کے لئے انہیں محض نفلی اور اضافی نیکی یعنی مستحبات میں شمار کر لیا ہے حالانکہ حضور نبی اکرم ﷺ کے قول و عمل سے ان کا وجوب اور لزوم ہی ثابت ہوتا ہے۔

۹۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

إن اللہ فرض علی الأغنیاء المسلمین في أموالھم بقدر الذي ما یسع فقراءھم.(۱)

’’اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مال سے اس قدر (صدقہ) فرض فرمایا ہے جس سے فقراء کا فقر ختم ہو جائے۔‘‘

۱۱۔ زائد از ضرورت مال کی شرعی حیثیت

اموال پر قابض و متصرف ہونے کی بنا پر مالک کا حق دوسروں کے نفع اٹھانے کے حق پر مقدم ہوتا ہے یعنی پہلے مالک کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اموال سے اپنی ضروریات پوری کرے اور بعد میں زائد از ضرورت مال (Surplus Property) میں سے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کرے۔

یہ تصور ان احکام پر مبنی ہے:

۱۔ ارشادِ ربّانی ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ

(۱) ۱۔ سعید بن منصور، السنن، ۵: ۱۰۹، رقم: ۳۵۷۸
۲۔ ہیثمي، مجمع الزوائد، ۳: ۶۲، رقم: ۴۳۲۴
۳۔ ابن حزم، المحلی، ۶: ۱۵۸

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌo(۱)

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں، فرما دیں جس قدر بھی مال خرچ کرو (درست ہے)، مگر اس کے حقدار تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور محتاج ہیں اور مسافر ہیں، اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہےo''

۲۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

يا ابن آدم إنک أن تبذل الفضل خير لک وأن تمسكه شر لک ولا تلام على كفاف وابدأ بمن تعول.(۲)

''اے اولادِ آدم! ضرورت سے زائد تمہارا مال کو خرچ کرنا بہتر ہے اور روک کر رکھنا تمہارے لئے شر ہے ہاں اس قدر بچانا قابلِ ملامت نہیں جو تیری ضرورت کے لئے کافی ہو اور انفاق کا آغاز ان سے کر جن کی ذمہ داری تجھ پر عائد ہوتی ہے۔''

اس حدیث کی رو سے صرف اسی قدر مال بچا کر رکھنے پر ملامت نہیں ہے جو ضروریات کے لئے کافی ہو۔ اس سے زائد رکھنا بہتر ہے اور اس میں سے دوسروں پر خرچ کرنا لازم ہے۔

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۱۵

(۲) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب الزكاة، باب بيان أن اليد العليا خير من اليد السفلى، ۲: ۷۱۸، رقم: ۱۰۳۶

۲۔ ترمذي، السنن، كتاب الزهد، باب ۳۲، ۴: ۵۷۳، رقم: ۲۳۴۳

۳۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۴: ۱۸۲، رقم: ۷۵۷۰

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ـ۱۱۷۶ھ) بھی اس تصور کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

معنى الملك في حق الآدمي كونه أحق بالانتفاع من غيره.(۱)

’’زمین پر آدمی کے حق ملکیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ انتفاع کا حق، قابض کو دوسرے کی نسبت زیادہ ہے۔‘‘

۱۲۔ حقِ تملّک اور حقِ انتفاع میں فرق

اسلام کے تصورِ ملکیت میں اموال پر قبضہ و تصرف (Proprietary Rights) کسی حد تک تو خالصتاً انفرادی حق تسلیم کیا گیا ہے کوئی اس میں کسی کو شریک کرے یا نہ کرے شریعت اس سے تعرض نہیں کرتی۔ مگر انتفاع یعنی اموال کی نفع بخشی اور سودمندی (Usufructuary Rights) میں محض انفرادی اور نجی حق شریعت کی رو سے کلیتاً غیر اسلامی ہے اس میں ہر شخص دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا پابند ہے۔ زکوٰۃ، صدقات اور انفاق کے تمام احکام اس دعوے کے بیّن دلائل ہیں اگر اشیاء اموال کی مادی حیثیت ’’Corpus‘‘ کی ملکیت یعنی ان کے قبضہ و تصرف کی مانند ان کے منافع اور فوائد (Usufructs) کی ملکیت کو بھی مطلقاً نجی اور انفرادی ضرورت تک مختص رکھنے کی اجازت ہوتی تو شریعت لوگوں کے کمائے ہوئے مال و دولت پر زکوٰۃ، صدقات اور انفاق کے وجوبی اور لازمی احکام صادر نہ کرتی۔ یہ احکام مال کے قبضہ و تصرف میں شرکت کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ صرف ان کے حقِ انتفاع میں دوسروں کی شرکت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں مال (Property) کے قبضہ و تصرف کی حیثیت اس کے انتفاع کی حیثیت سے مختلف ہے۔ انتفاع میں اجتماعی حق جبکہ قبضہ اور تصرف میں بالعموم انفرادی حق زیادہ اہمیت کے ساتھ ملحوظ رکھا جاتا ہے اس تصور کی

(۱) شاه ولي الله، حجة الله البالغة، ۲: ۱۰۳

تائید ان قرآنی آیات سے ہوتی ہے:

۱۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ط نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا○ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○ (۱)

’’مردوں کے لئے اس (مال) میں سے حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے (بھی) ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں سے حصہ ہے۔ وہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ (اللہ کا) مقرر کردہ حصہ ہے○ اور اگر تقسیمِ (وراثت) کے موقع پر (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج موجود ہوں تو اس میں سے کچھ انہیں بھی دے دو اور ان سے نیک بات کہو○‘‘

۲۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ○ (۲)

’’نیکی صرف یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (اللہ

(۱) النساء، ۴: ۷، ۸

(۲) البقرۃ، ۲: ۱۷۷

کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے، اور اللہ کی محبت میں (اپنا) مال قرابت داروں پر اور یتیموں پر اور محتاجوں پر اور مسافروں پر اور مانگنے والوں پر اور (غلاموں کی) گردنوں (کو آزاد کرانے) میں خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جب کوئی وعدہ کریں تو اپنا وعدہ پورا کرنے والے ہوں، اور سختی (تنگدستی) میں اور مصیبت (بیماری) میں اور جنگ کی شدّت (جہاد) کے وقت صبر کرنے والے ہوں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیز گار ہیں٥"

۳۔ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ط وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ٥(۱)

"تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک تم (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے٥"

۴۔ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ط وَ اللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ٥ اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهٖ وَ يَاۡخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ٥(۲)

"آپ ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجئے کہ آپ اس (صدقہ) کے باعث انہیں (گناہوں سے) پاک فرمادیں اور انہیں (ایمان و مال کی پاکیزگی سے) برکت بخش دیں اور ان کے حق میں دعا فرمائیں، بیشک آپ کی دعا ان کے لئے (باعثِ) تسکین ہے، اور اللہ خوب سننے والا خوب

(۱) آل عمران، ۳: ۹۲

(۲) التوبۃ، ۹: ۱۰۳، ۱۰۴

جاننے والا ہے o کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ ہی تو اپنے بندوں سے (ان کی) توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات اپنے دستِ قدرت سے) وصول فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان ہے o‘‘

۵۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰـھُمْ یُنْفِقُوْنَ o(۱)

’’جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز کو (تمام حقوق کے ساتھ) قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے (ہماری راہ) میں خرچ کرتے ہیں o‘‘

۶۔ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ o اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ o(۲)

’’اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف تیزی سے بڑھو جس کی وسعت میں سب آسمان اور زمین آجاتے ہیں، جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے o یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے o‘‘

۷۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَکْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ o وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ o کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ o وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ o وَتَاْکُلُوْنَ

(۱) البقرۃ، ۲: ۳

(۲) آل عمران، ۳: ۱۳۳، ۱۳۴

التُّرَاثَ اَکْلاً لَّمًّاo وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّاo کَلَّآ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّاo وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّاo وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰیo(۱)

’’مگر انسان (ایسا ہے) کہ جب اس کا رب اسے (راحت و آسائش دے کر) آزماتا ہے اور اسے عزت سے نوازتا ہے اور اسے نعمتیں بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھ پر کرم فرمایاo لیکن جب وہ اسے (تکلیف و مصیبت دے کر) آزماتا ہے اور اس پر اس کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیاo یہ بات نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ عزت اور مال و دولت کے ملنے پر) تم یتیموں کی قدر و اِکرام نہیں کرتےo اور نہ ہی تم مسکینوں (یعنی غریبوں اور محتاجوں) کو کھانا کھلانے کی (معاشرے میں) ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہوo اور وراثت کا سارا مال سمیٹ کر (خود ہی) کھا جاتے ہو (اس میں سے افلاس زدہ لوگوں کا حق نہیں نکالتے)o اور تم مال و دولت سے حد درجہ محبت رکھتے ہوo یقیناً جب زمین پاش پاش کر کے ریزہ ریزہ کر دی جائے گیo اور آپ کا رب جلوہ فرما ہو گا اور فرشتے قطار در قطار (اس کے حضور) حاضر ہوں گےo اور اس دن دوزخ پیش کی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آجائے گی مگر (اب) اسے نصیحت کہاں (فائدہ مند) ہو گیo‘‘

۸۔ یَقُوْلُ اَهْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًاo اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗٓ اَحَدٌo اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ o وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ o وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ o فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَo(۲)

’’وہ (بڑے فخر سے) کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال خرچ کیا ہےo کیا وہ

(۱) الفجر، ۸۹: ۱۵۔ ۲۳

(۲) البلد، ۹۰: ۶۔ ۱۱

یہ خیال کرتا ہے کہ اسے (یہ فضول خرچیاں کرتے ہوئے) کسی نے نہیں دیکھا○ کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں نہیں بنائیں؟○ اور (اسے) ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے)؟○ اور ہم نے اسے (خیر و شر کے) دو نمایاں راستے (بھی) دکھا دیئے○ وہ تو (دینِ حق اور عملِ خیر کی) دشوار گزار گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا○‘‘

۹۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ○ (۱)

’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم اس میں سے (راہِ خدا میں) خرچ کرو جو تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے تو کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں کیا ہم اس (غریب) شخص کو کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو (خود ہی) کھلا دیتا۔ تم تو کھلی گمراہی میں ہی (مبتلا) ہو گئے ہو○‘‘

۱۰۔ اٰمِنُوْا بِاللهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ○ (۲)

’’اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ اور اس (مال و دولت) میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں اپنا نائب (و امین) بنایا ہے، پس تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے خرچ کیا اُن کے لئے بہت بڑا اجر ہے○‘‘

۱۱۔ وَاعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ط اِنَّ اللهَ لَا

(۱) یٰسٓ، ۳۶: ۴۷

(۲) الحدید، ۵۷: ۷

يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا۝ ۙالَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ وَ يَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَيَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا۝ وَالَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَمَنۡ يَّكُنِ الشَّيۡطٰنُ لَهٗ قَرِيۡنًا فَسَآءَ قَرِيۡنًا۝ وَمَاذَا عَلَيۡهِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمۡ عَلِيۡمًا۝(۱)

’’اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے) اور نزدیکی ہمسائے اور اجنبی پڑوسی اور ہم مجلس اور مسافر (سے)، اور جن کے تم مالک ہو چکے ہو، (ان سے نیکی کیا کرو)، بیشک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو تکبّر کرنے والا (مغرور) فخر کرنے والا (خود بین) ہو۝ جو لوگ (خود بھی) بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو (بھی) بخل کا حکم دیتے ہیں اور اس (نعمت) کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہے، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۝ اور جو لوگ اپنے مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یومِ آخرت پر، اور شیطان جس کا بھی ساتھی ہو گیا تو وہ برا ساتھی ہے۝ اور ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا تھا اس میں سے (اسکی راہ میں) خرچ کرتے اور اللہ ان (کے حال) سے خوب واقف ہے۝‘‘

۱۲۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا

(۱) النساء، ۴: ۳۶۔۳۹

بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ط وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○[۱]

”اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہو گی اور (کافروں کے لئے) نہ کوئی دوستی (کارآمد) ہو گی اور نہ (کوئی) سفارش، اور یہ کفار ہی ظالم ہیں ○“

۱۳۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ط عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ط اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ط سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○[۲]

”(یہ) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور (اپنے کفر و نفاق کی شدت کے باعث) اسی قابل ہیں کہ وہ ان حدود و احکام سے جاہل رہیں جو اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) پر نازل فرمائے ہیں اور اللہ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے ○ اور ان دیہاتی گنواروں میں سے وہ شخص (بھی) ہے جو اس (مال) کو تاوان قرار دیتا ہے جسے وہ (راہِ خدا میں) خرچ کرتا ہے اور تم پر زمانہ کی گردشوں (یعنی مصائب و آلام) کا انتظار کرتا رہتا ہے، (بلا و مصیبت کی) بری گردش انہی پر ہے، اور اللہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے ○ اور بادیہ نشینوں میں (ہی) وہ شخص (بھی) ہے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۵۴

(۲) التوبۃ، ۹: ۹۷۔ ۹۹

ہے اور جو کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرتا ہے اسے اللہ کے حضور تقرب اور رسول (ﷺ) کی (رحمت بھری) دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتا ہے، سن لو، بیشک وہ ان کے لئے باعث قربِ الٰہی ہے، جلد ہی اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل فرما دے گا۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے٥‘‘

۱۴۔ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ نَفَقَةً صَغِيۡرَةً وَّ لَا كَبِيۡرَةً وَّلَا يَقۡطَعُوۡنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمۡ لِيَجۡزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحۡسَنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ٥(۱)

’’اور نہ یہ کہ وہ (مجاہدین) تھوڑا خرچہ کرتے ہیں اور نہ بڑا اور نہ (ہی) کسی میدان کو (راہِ خدا میں) طے کرتے ہیں مگر ان کے لئے (یہ سب صرف وسفر) لکھ دیا جاتا ہے تاکہ اللہ انہیں (ہر اس عمل کی) بہتر جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے٥‘‘

۱۵۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الۡخَبِيۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِيۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِيۡهِ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ٥(۲)

’’اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا کرو اور اس میں سے گندے مال کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کا ارادہ مت کرو کہ (اگر وہی تمہیں دیا جائے تو) تم خود اسے ہرگز نہ لو سوائے اس کے کہ تم اس میں چشم پوشی کرلو، اور جان لو کہ بیشک اللہ بے نیاز لائقِ ہر حمد ہے٥‘‘

۱۶۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَاجَيۡتُمُ الرَّسُوۡلَ فَقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىۡ نَجۡوٰٮكُمۡ

(۱) التوبۃ، ۹: ۱۲۱

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۶۷

صَدَقَةً ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○[۱]

اے ایمان والو! جب تم رسول (ﷺ) سے کوئی راز کی بات تنہائی میں عرض کرنا چاہو تو اپنی رازدارانہ بات کہنے سے پہلے کچھ صدقہ وخیرات کرلیا کرو، یہ (عمل) تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ تر ہے، پھر اگر (خیرات کے لئے) کچھ نہ پاؤ تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ○‘‘

۱۷۔ وَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ○[۲]

’’اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجتمندوں) کا حق مقرر تھا ○‘‘

۱۸۔ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○[۳]

’’اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے ○ مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا ○‘‘

۱۹۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللهِ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○[۴]

’’پس آپ قرابت دار کو اس کا حق ادا کرتے رہیں اور محتاج اور مسافر کو (ان کا حق)، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا مندی کے طالب ہیں، اور وہی لوگ مراد پانے والے ہیں ○‘‘

(۱) المجادلۃ، ۵۸: ۱۲
(۲) الذاریات، ۵۱: ۱۹
(۳) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵
(۴) الروم، ۳۰: ۳۸

۲۰۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ○[۱]

’’اور قرابتداروں کو انکا حق ادا کرو اور محتاجوں اور مسافروں کو بھی (دو) اور (اپنا مال) فضول خرچی سے مت اڑاؤ ○‘‘

۱۳۔ ارتکازِ دولت کی حیثیت

اگر کوئی شخص اپنے مملوکہ اموال کی آمدنی اور منافع اس خیال سے کہ یہ میری ذاتی ملکیت ہے صرف اپنی ضروریات اور آسائشوں تک رکھے اور ان سے دوسروں کو فائدہ نہ اٹھانے دے یعنی دوسرے مستحقین کے شرعاً تسلیم شدہ حقوق پورے نہ کرے تو اسے دولت کا جمع کرنا یا ارتکاز و اکتناز کہا جائے گا اور یہ امر شریعت میں حرام بلکہ باعثِ عذابِ جہنم ہے باوجود اس کے کہ اس نے وہ ساری دولت اپنے جائز ملکیتی ذرائع سے کمائی ہے۔

۱۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ○[۲]

’’اور جو لوگ سونا اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیں ○ جس دن اس (سونے، چاندی اور مال) پر دوزخ کی آگ میں تاپ دی جائے گی پھر اس (تپے ہوئے مال) سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور ان سے کہا جائے گا) کہ یہ وہی (مال) ہے جو تم نے اپنی

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۶

(۲) التوبۃ، ۹: ۳۴، ۳۵

جانوں (کے مفاد) کے لئے جمع کیا تھا سوتم (اس مال کا) مزہ چکھو جسے تم جمع کرتے رہے تھےo‘‘

۲۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ.(۱)

’’تاکہ (سارا مال صرف) تمہارے مال داروں کے درمیان ہی نہ گردش کرتا رہے (بلکہ معاشرے کے تمام طبقات میں گردش کرے)۔‘‘

۳۔ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗo یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗo کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِo وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْحُطَمَۃُo نَارُ اللهِ الْمُوْقَدَۃُo الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِo اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌo فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍo(۲)

’’(خرابی و تباہی ہے اس شخص کے لئے) جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھتا ہےo وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کی دولت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گیo ہرگز نہیں! وہ ضرور **حطمہ** (یعنی چورا چورا کردینے والی آگ) میں پھینک دیا جائے گاo اور آپ کیا سمجھے ہیں کہ **حطمہ** (چورا چورا کردینے والی آگ) کیا ہے؟o (یہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہےo جو دلوں پر (اپنی اذیت کے ساتھ) چڑھ جائے گیo بیشک وہ (آگ) ان لوگوں پر ہر طرف سے بند کر دی جائے گیo (بھڑکتے شعلوں کے) لمبے لمبے ستونوں میں (اور ان لوگوں کے لئے کوئی راہِ فرار نہ رہے گی)o‘‘

بنا بریں احتکار کو باعثِ عذاب اور محتکر کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔

الغرض اسلام کا تصورِ ملکیت اپنے معنی و مفہوم اور روح کے اعتبار سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے اور اسلام کے معاشی نظام کی وہ خشتِ اوّل ہے جو اس کی پوری

(۱) الحشر، ۵۹: ۷

(۲) الهمزة، ۱۰۴: ۲۔ ۹

ساخت و تشکیل کو دنیا کے دیگر معاشی نظامات سے ممتاز و ممیّز کرتی ہے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضمانت فراہم کرنے میں تیقن کے ساتھ سرفہرست ہے۔

تحدیدِ ملکیت (Limitation of Ownership)

اسلام انفرادی اور اجتماعی حقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس میں نظم و ضبط اور اس کے غلط استعمال کو روکنے کی غرض سے چند حدود و قیود لگاتا ہے۔ خصوصی طور پر اگر کسی معاشرے میں معاشی ناہمواری اس حد تک بڑھ جائے کہ غرباء کا استحصال شروع ہو جائے اور اس حد تک پہنچ جائے کہ ان کے لیے زندگی گزارنا دوبھر ہو جائے تو اسلامک اسٹیٹ کے صاحبانِ اقتدار کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے تحدیدِ ملکیت کریں۔ اسلامی حکومت اصحابِ ثروت کو اس امر پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ شریعت کے عائد کردہ حقوق ادا نہ کرنے کی صورت میں مقررہ حد سے زیادہ ملکیت نہ رکھیں اور اسلامی اسٹیٹ کا فرض ہے کہ وہ حالات و واقعات کے تناظر میں ملکیت کی حدود مقرر کرے اس حقیقت کا ثبوت ہمیں درج ذیل احادیثِ نبوی ﷺ سے بھی ملتا ہے:

۱۔ من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان عنده فضل زاد فليعد به على من لا زاد له قال: فذكر أصناف المال ما ذكر حتى رأينا أنه لا حق لأحد منا في فضل.(۱)

’’جس کے پاس زائد سواری ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے اس شخص

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب اللقطة، باب استحباب المؤاساة بفضول المال، ۳: ۱۳۵۴، رقم: ۱۷۲۸

۲۔ أبو داود، السنن، كتاب الزكاة، باب في حقوق المال، ۲: ۱۲۵، رقم: ۱۶۶۳

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۳۴، رقم: ۱۱۳۱۱

۴۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۴: ۱۸۲، رقم: ۷۵۷۱

کو لوٹا دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس زائد ساز و سامان ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے اس شخص کو لوٹا دے جس کے پاس سامان نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مختلف اصناف کا ذکر فرمایا حتی کہ ہم سمجھے کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد اشیاء اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق نہیں۔‘‘

۲۔ دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

لا تمنعوا فضل الماء لتمنعوا به فضل الكلأ. (۱)

’’فالتو پانی مت روکو اس غرض سے کہ فالتو گھاس روک سکو۔‘‘

عصرِ حاضر میں کئی مواقع پر بعض حضرات نے حکومت کی طرف سے تحدیدِ ملکیت کرنے پر اعتراضات کیے ہیں اپنے مؤقف کے حق میں انہوں نے کچھ آیاتِ قرآنی کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ان آیات کے باب میں ان کی پیش کردہ توضیح اور استدلال مغالطوں پر مبنی ہے۔ ذیل میں ہم ان کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والوں کے دلائل اور ان کا ردّ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں تحدیدِ ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔ اپنے اس مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں ذیل میں ہم ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کا رد بھی پیش کرتے ہیں تاکہ حقیقت آشکار ہو سکے اور عامۃ الناس کو

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب المساقاة، باب من قال إن صاحب الماء أحق بالماء، ۲: ۸۳۰، رقم: ۲۲۲۶

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب المساقاة، باب تحريم فضل بيع الماء الذي يكون بالفلاة ويحتاج إليه لراعي الكلأ وتحريم منع بذله وتحريم بيع ضراب الفحل، ۳: ۱۱۹۸، رقم: ۱۵۶۶

مسئلے کا صحیح ادراک حاصل ہو:

دلیل نمبر ا

ملکیت کی عدم تحدید کے ضمن میں وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ط كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○[۱]

''اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا (جاندار) نہیں ہے مگر (یہ کہ) اس کا رزق اللہ (کے ذمۂ کرم) پر ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو (بھی) جانتا ہے، ہر بات کتابِ روشن (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے○''

استدلال

تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والے افراد اس آیت کریمہ سے اپنے مؤقف کا استدلال اس طرح کرتے ہیں: ''چونکہ رزق کی فراہمی کا کام مذکورہ آیتِ کریمہ کے مطابق اللہ رب العزت نے اپنے ذمۂ کرم پر لے رکھا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ وہ ہر ایک کو رزق فراہم کرے اور اسی کی مرضی اور اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے اور جتنا چاہے رزق عطا فرمائے۔ اس کے دیئے ہوئے مال اور رزق میں کسی قسم کی حد قائم کرنا اس کے منشاء اور فیصلہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس آیت مبارکہ کی رو سے تحدیدِ ملکیت جائز نہیں ہے۔''

استدلال کا رد/جواب

مذکورہ بالا نظریہ کے حامل افراد کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اس آیتِ کریمہ

(۱) هود، ۱۱: ۶

میں بنیادی بات جو بیان ہوئی ہے وہ ہے ''وعدۂ رزق''۔ بنیادی کام رزق فراہم کرنا ہے۔ گویا یہ آیت وعدۂ رزق کی فراہمی پر دلالت کرتی ہے۔ تحدیدِ ملکیت اس آیت کا موضوع ہی نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت کا بنیادی موضوع رزق کی فراہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس وعدہ کی تکمیل اسلامی حکومت (Islamic State) سے کراتا ہے۔ گویا یہ ذمہ داری نیابتاً اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر کسی کو رزق فراہم کرنے کے مواقع پیدا کرے۔ اس منشائے الٰہی کی تکمیل کے لئے State اپنا کردار ادا کرنے کی مجاز ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب رزق فراہم کرنے اور اس منشائے ایزدی کی تکمیل State کی ذمہ داری ہے تو اس تکمیل کیلئے حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اگر ملک میں دولت کی تقسیم غیر متوازن ہو اور بعض کو بنیادی رزق بھی نہ مل رہا ہو اور بعض بے حد و حساب دولت کے مالک ہوں اور غیر متوازن تقسیم (Unbalanced Division) جب اس حد تک بڑھ گئی ہو کہ تقسیم کرنا اور تحدید کرنا ناگزیر اور ناروا ہو گیا ہو تو اس تقسیم میں توازن (Balance) پیدا کرنا حکومت (State) کی ذمہ داری اور اختیار ہے۔ اس ذمہ داری کے تحت اسے تحدید کرنے کا حق بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

دلیل نمبر ۲

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝(۱)

''اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے (دنیا و آخرت کے رنج و غم سے) نکلنے کی راہ پیدا فرما دیتا ہے ۝ اور اسے ایسی جگہ سے رِزق عطا فرماتا ہے جہاں

(۱) الطلاق، ۶۵: ۲، ۳

سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ (اللہ) اسے کافی ہے، بیشک اللہ اپنا کام پورا کر لینے والا ہے، بیشک اللہ نے ہر شے کے لئے اندازہ مقرر فرما رکھا ہے o‘‘

استدلال

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ مطلقہ عورت کو ایسے ایسے طریقوں اور ایسی ایسی جگہوں سے رزق فراہم کرے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتی۔ گمان نہ کر سکنے کا مطلب ہے کہ اتنا زیادہ رزق عطا فرما دے گا کہ جس کا حساب ہی نہ کیا جا سکے۔ یوں بے گماں دینے کا مطلب ہے بے حساب دینا۔ اس لئے عورت کو چاہیے کہ وہ اللہ پر توکل کرے جو اللہ مطلقہ عورت کو بے حساب رزق دے سکتا ہے وہ تمام بنی نوع انسان کو بھی بے حدو حساب رزق فراہم کر سکتا ہے لہٰذا جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے۔ اور اس کے دیئے ہوئے پر حد قائم کرنا اس کے منشاء اور توکل کے خلاف ہے۔

رد/ جواب

اس آیت میں عورت کو طلاق کے وقت توکل علیٰ اللہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ سے یہ استدلال کرنا کہ وہ کسی کو دے یا نہ دے یا کسی کو زیادہ دے اور کسی کو کم دے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہی نہیں ہے اس لیے اس آیت سے یہ مفہوم نکالنا سراسر غلط ہے۔

مذکورہ آیت سے استدلال کرتے وقت بے گمان کو بے حساب کے معنی میں لینا بھی درست نہیں ہے۔ یہاں لفظ بے گمان کے ذریعہ توکل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے نہ کہ بے حساب کے معنی و مفہوم مراد لئے گئے ہیں۔ اس طرح محولہ بالا آیت کا مفہوم تحدیدِ ملکیت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، چنانچہ اس کو تحدیدِ ملکیت کی بحث میں بطور دلیل پیش کرنا ہی غلط ہے۔

دلیل نمبر۳

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ.[1]

’’اور مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل مت کرو۔ ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی (دیں گے)‘‘۔

استدلال

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی دیں گے۔ رزق دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ حکومت کا یا کسی دوسرے شخص کا کام نہیں ہے۔ چونکہ کام اللہ کا ہے اس لیے اس کی مرضی کسی کو کم دے یا زیادہ دے۔ اس میں شکوہ کرنے، تحدید کرنے یا اس میں مداخلت کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔

رد/ جواب

اللہ رب العزت نے جب فرما دیا کہ ہم رزق دیتے ہیں تمہیں بھی اور انہیں بھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا منشاء یہ ہے کہ سب کو رزق ملے۔ اب اللہ کے اس منشاء ہی کی تکمیل کے لئے نظامِ ریاست میں حکومت (State) قائم ہوتی ہے۔ نظام الحقوق اور نظام الفرائض پر عمل درآمد کرانا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ کا حکم آ گیا کہ نماز پڑھو۔ اب نظامِ صلوٰۃ کی تنفیذ اسلامی State کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اللہ کا حکم آ گیا کہ سود حرام ہے۔ اب نظامِ معیشت میں سود کی حرمت کو Establish کرنا State کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اللہ کا حکم آ گیا کہ زنا حرام ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کی سزا (حد) بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سزا کون دے گا؟ اللہ نے خود آ کر تو یہ حد نہیں لگانی لہٰذا یہ حد لگانے کا فریضہ State

(۱) الانعام، ۶: ۱۵۱

سرانجام دے گی۔ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کی رضا مندی حکم بن جاتی ہے اور اس حکم کی تنفیذ State کی ذمہ داری (Responsibility) قرار پاتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد آیت کا صحیح مفہوم کچھ یوں ہو گا کہ ہم نے یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ تم سب کو اور ان کو بھی رزق بہم پہنچایا جائے۔ ہمارے اس منشاء کی تکمیل حکومت (State) کی ذمہ داری ہے۔ گویا سب کو رزق فراہم کرنا حکومت (State) ہی کی ذمہ داری ہے۔ اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس منشائے ایزدی کی تکمیل میں جو رکاوٹیں، مشکلات اور مسائل در پیش ہوں ان کو بھی دور کرے۔ ان رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ دولت کی غیر متوازن تقسیم بھی ہے۔ اس تقسیم کو توازن میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحدیدِ ملکیت کے جائز اختیار کو استعمال کرے تاکہ ہر کسی کو رزق فراہم کرنے میں آسانی ہو۔

دلیل نمبر ۴

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُo (۱)

”اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی روزی (اپنے ساتھ) نہیں اٹھائے پھرتے اللہ انہیں بھی رزق عطا کرتا ہے اور تمہیں بھی، اور وہ خوب سننے والا جاننے والا ہےo“

استدلال

زمین پر بسنے والے تمام جانوروں کو اللہ تعالیٰ اس حالت میں بھی رزق فراہم کر دیتا ہے جب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کو بھی رزق

(۱) العنکبوت، ۲۹: ۶۰

فراہم کرتا ہے۔ اس آیت میں جانوروں کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ جس طرح جانوروں کو رزق دیتا ہے اسی طرح انسانوں کو بھی رزق دینے والا وہی ہے۔ اس کی مرضی ہے کہ جس کو چاہے زیادہ دے اور جس کو چاہے کم دے۔ اس طرح حدِ ملکیت کی نفی ہو جاتی ہے۔

رد/ جواب

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی مثال بیان فرمائی ہے کہ اللہ ان کو جس طرح رزق دیتا ہے تمہیں بھی فراہم کرے گا۔ اس مثال پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ رزق دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام جانوروں کے لیے رزق کے یکساں مواقع پیدا فرمائے ہیں مثلاً ایک جنگل میں اگر دو شیر ہیں تو دونوں کے لیے شکار بھی وہیں پیدا فرما دیا۔ اسی طرح تمام انسانوں کے لیے بھی رزق کے مواقع یکسر پیدا فرمائے لیکن اگر کسی وجہ سے ان مواقع میں توازن برقرار نہ رہا ہو تو ان میں توازن پیدا کرنے کے لئے حکومت (State) اپنا کردار ادا کرے گی جو تحدیدِ ملکیت کے قانون کے نفاذ/عمل کا آئینہ دار ہے۔

دلیل نمبر ۵

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝[1]

”(اے حبیب! یوں) عرض کیجئے: اے اللہ! سلطنت کے مالک! تُو جسے چاہے

(۱) آل عمران، ۳: ۲۶، ۲۷

سلطنت عطا فرما دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور تُو جسے چاہے عزت عطا فرما دے اور جسے چاہے ذلّت دے، ساری بھلائی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے، بیشک تُو ہر چیز پر بڑی قدرت والا ہے ○ تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تُو ہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے (اپنی نوازشات سے) بہرہ اندوز کرتا ہے○''

استدلال

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ اللہ ہی مالک الملک ہے۔ تمام کائنات اور اس کے تمام ذرائع اور وسائل کا وہی مالک ہے اور جسے وہ چاہتا ہے یہ وسائل اور ذرائع عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور یہ رزق بھی بے حساب ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے رزق دینے میں حساب و کتاب کی تحدید نہیں رکھی تو تحدید کرنا اللہ کی مرضی اور قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے۔

رد/ جواب

مذکورہ آیت میں بغیر حساب کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی بھی حساب و کتاب نہ رکھے۔ اس طرح حکومت (State) کو بھی کوئی اختیار نہیں کہ وہ حساب و کتاب رکھنے کا انتظام وانصرام کرے۔ بغیر حساب کا یہ مفہوم بالکل غلط ہے۔ اگر یہ مفہوم لیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ محاصل (Taxes) کے سارے محکمے ختم کرنے ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ Revenue کے سارے معاملات بھی ختم کرنے ہوں گے جو نظامِ حکومت چلانے میں اختلال کا باعث ہوں گے۔

اگر بغیر حساب کا مطلب یہ لیا جائے کہ حساب کتاب ہی نہ رکھا جائے تو خود

احکامِ خداوندی میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات میں حساب کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نیکیوں اور برائیوں کا Record کراماً کاتبین کے ذریعے اعمالِ صالحہ اور اعمالِ سوء میں جزء و سزا کا حساب کتاب اور سب سے بڑھ کر یوم الحساب کا انعقاد حساب کتاب رکھنے کے دلائل ہیں۔ عملی زندگی میں مثال کے طور پر زکوٰۃ کو لیں تو اس کا تو سارے کا سارا نظام حساب و کتاب پر ہی مشتمل ہے اس طرح ان دلائل سے مختلف شعبوں میں تحدیدِ ملکیت کا عنصر ثابت ہوتا ہے۔

”**بغیر حساب**“ کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ اللہ بندے کے ساتھ کوئی حساب و کتاب کا معاملہ نہیں کرتا یا اللہ بندے کو جتنا بھی عطا کر دے اس کا بدلہ نہیں مانگتا۔ اللہ پر دینے میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ State کو کوئی حق ہی نہیں ہے کہ وہ حساب و کتاب رکھے۔ جب دینے میں کوئی قدغن نہیں تو مفہوم مخالف کی رو سے لینے پر بھی کوئی قدغن نہیں۔ اس میں Nationalization کا تصور ہے۔ یعنی جو دے سکتا ہے وہ Nationalize بھی کر سکتا ہے۔ آیتِ کریمہ کا پہلا حصہ بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے:

تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ. (۱)

”اللہ جسے چاہتا ہے ملک دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے واپس لے بھی لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے عزت چھین کر ذلت دے دیتا ہے۔“

آیت کے اس حصہ کی رو سے جب دے سکتا ہے تو واپس بھی لے سکتا ہے۔ یہی حال رزق اور مال و دولت کا ہے کہ جب اللہ دے سکتا ہے تو واپس بھی لے سکتا ہے۔ واپسی کا کام اللہ کے منشاء کی تکمیل کے لیے State کر سکتی ہے، اسی طرح اگر اللہ پر

(۱) آل عمران، ۳: ۲۶

دینے میں کوئی قدغن نہیں تو اسلامی اسٹیٹ پر اس کے منشاء کی تکمیل کے لئے واپس لینے میں بھی کوئی قدغن نہیں ہے۔ State کا مال واپس لینا تحدید ہی کی صورت ہے۔ اس طرح تحدیدِ ملکیت جائز ہے۔

دلیل نمبر ۶

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰـكُمْ ط اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○[1]

’’اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجات میں بلند کیا تاکہ وہ ان (چیزوں) میں تمہیں آزمائے جو اس نے تمہیں (امانتاً) عطا کر رکھی ہیں۔ بیشک آپ کا رب (عذاب کے حقداروں کو) جلد سزا دینے والا ہے اور بیشک وہ (مغفرت کے امیدواروں کو) بڑا بخشنے والا اور بے حد رحم فرمانے والا ہے○‘‘

استدلال

اس آیت میں ﴿وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ (اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجات میں بلند کیا) کے الفاظ اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ اللہ نے ہی مال و اختیارات میں بعض کو بعض پر فضیلت دی یعنی بعض کو بے حد و حساب رزق دیا اور بعض کو کم۔ یہ تقسیم مِنْ جَانبِ اللہ ہے۔ اس لئے اس تقسیم میں ردو بدل کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ اس تقسیم میں اگر اس نے کسی کو بے حد و حساب رزق عطا کر دیا ہے تو State کو اس پر حد عائد کرنے کا کیا حق ہے؟ لہٰذا تحدیدِ ملکیت کی نفی اس آیتِ کریمہ سے بھی ثابت ہے۔

---

(۱) الانعام، ۶: ۱۶۵

رد/ جواب

تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والے کا سوال ہے کہ State کو کیا حق ہے کہ اللہ کی تقسیم اور عطا میں حد مقرر کرے؟ اس کا جواب بھی اسی آیت میں موجود ہے۔ آیت میں موجود الفاظ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ فِيمَا آتٰكُمْ﴾ (تا کہ جو کچھ تمہیں دیا اس میں تمہیں آزمائے) نے State کو یہ حق دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مال دے کر آزماتا ہے کہ جو مال اس بندے کو دیا گیا ہے کیا وہ اس مال کے حقوق ادا کر رہا ہے؟ اگر مال کے حقوق کی ادائیگی میں پورا نہیں اتر رہا تو State کی ذمہ داری ہے کہ وہ مال واپس لے لے۔ جب دولت کا صحیح مقصد پورا نہ ہو رہا ہو یا دوسروں کی حق تلفی ہو رہی ہو اور ضرر کا احتمال واضح ہو رہا ہو تو State کو اختیار ہے کہ وہ Limitations عائد کرے کیونکہ یہ حکم لِيَبْلُوَكُمْ فِيمَآ اٰتٰكُمْ کے تحت آتا ہے اور یہی تحدیدِ ملکیت ہے۔

دلیل نمبر ۷

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ.(۱)

”اور اللہ نے تم میں سے بعض پر رزق (کے درجات) میں فضیلت دی ہے۔“

استدلال

اس آیتِ کریمہ میں اللہ رب العزت نے واضح اعلان فرما دیا ہے کہ اس نے بعض لوگوں کو رزق کے معاملہ میں بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔ اس فضیلت و افضلیت میں کسی دوسرے شخص یا State کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ وہ خدا کے دیئے ہوئے مال میں تحدید کا قانون لاگو کرے۔

(۱) النحل، ۱۶: ۷۱

رد/ جواب

مذکورہ بالا آیتِ مبارکہ کو تحدیدِ ملکیت کے منافی نظریہ میں بطور دلیل پیش کرنے والے اس آیت کو مکمل طور پر بیان نہیں کرتے۔ ذیل میں مکمل آیت اور اس کا ترجمہ ذکر کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ کا صحیح ادراک ممکن ہو سکے۔

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ ۚ فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِہِمۡ عَلٰی مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَہُمۡ فِیۡہِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ ○[1]

”اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق (کے درجات) میں فضیلت دی ہے (تاکہ وہ تمہیں حکمِ انفاق کے ذریعے آزمائے)، مگر جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنی دولت (کے کچھ حصہ کو بھی) اپنے زیرِ دست لوگوں پر نہیں لوٹاتے (یعنی خرچ نہیں کرتے) حالانکہ وہ سب اس میں (بنیادی ضروریات کی حد تک) برابر ہیں، تو کیا وہ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں○“

اس آیت میں واضح حکم ہے کہ صاحبِ ثروت لوگ اپنی دولت کو اپنے زیردست اور خستہ حال لوگوں کو لوٹا دیں۔ آیت میں ”رآدّی (لوٹانا)“ کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مال غریبوں کا حق ہے اگر یہ لوگ ان کا حق اپنی مرضی سے نہیں دیتے تو حکومت (State) کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان لوگوں سے غریبوں کا حق وصول کر کے ان تک پہنچائیں۔

دلیل نمبر ۸

اَ ہُمۡ یَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّکَ ؕ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَیۡنَہُمۡ مَّعِیۡشَتَہُمۡ فِی

(۱) النحل، ۱۶: ۷۱

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○[1]

’’کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمتِ (خاصہ یعنی نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ دنیاوی زندگی میں (تو) ان کو روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور آپ کے رب کی رحمت بدرجہا اس (دنیوی مال و متاع) سے بہتر ہے جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں○‘‘

استدلال

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ رب العزت نے دنیاوی زندگی کا ایک ایسا نظام بیان فرمایا ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ وہ نظام کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیاوی زندگی کو گزارنے کے لئے روزی اور رزق کو تمام لوگوں میں تقسیم فرمایا۔ اس تقسیم میں اس نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی۔ پھر فضیلت عطا کرنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ امیر لوگ غریب لوگوں سے خدمت اور کام لیں۔ اس طرح یہ نظامِ زندگی چلتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے نظامِ زندگی کو قائم رکھنے کے لیے روزی کی تقسیم کو بھی اس طرح رکھا کہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اب اگر تحدید کے نام پر اس تقسیم میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے گا، لہٰذا نظامِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے تحدیدِ ملکیت ناجائز اور غلط ہے۔

ردّ / جواب

مذکورہ بالا نظریہ کے حامل افراد کو اس آیت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ اس آیت کے جس لفظ کے ترجمہ میں مغالطہ ہوا ہے وہ ہے ’’سُخْرِيًّا‘‘ جس کا ترجمہ

(۱) الزخرف، ۴۳: ۳۲

انہوں نے ’’خدمت لینا‘‘ کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس لفظ کے حقیقی معانی و مفاہیم بیان کرتے ہیں تاکہ اس کا مطلب واضح ہو جائے۔

لفظ سخریا اپنی بناوٹ کے لحاظ سے ’’س۔ خ۔ ر‘‘ سے مشتق ہے۔ ثلاثی مجرد میں باب سَمِعَ یَسْمَعُ سے سَخِرَ یَسْخَرُ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اپنی اسی بناوٹ سے سورۃ التوبہ کی درج ذیل آیت میں استعمال ہوا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللهُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌo(۱)

’’جو لوگ برضا و رغبت خیرات دینے والے مؤمنوں پر (ان کے) صدقات میں (ریاکاری و مجبوری کا) الزام لگاتے ہیں اور ان (نادار مسلمانوں) پر بھی (عیب لگاتے ہیں) جو اپنی محنت و مشقت کے سوا (کچھ زیادہ مقدور) نہیں پاتے سو یہ (ان کے جذبۂ انفاق کا بھی) مذاق اڑاتے ہیں، اللہ انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہےo‘‘

اس آیت میں ’یَسْخَرُوْنَ‘ مضارع اور ’’سَخِرَ‘‘ ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ سخر کا لغوی معنی ہے ’’مذاق اڑانا، تمسخر کرنا‘‘ وغیرہ۔ لسان العرب میں ہے:

وبه سَخْرًا وسَخَرًا وَمَسْخَرًا و سُخْرًا وسُخْرَةً و سِخْرِيًّا و سُخْرِيًّا وسُخْرِيَّةً: هزیء به.(۲)

’’سخر سے ہی سَخْرًا، سَخَرًا، مَسْخَرًا، سُخْرًا، سُخْرَةً، سِخْرِيًّا، سُخْرِيًّا اور سُخْرِيَّةً (یہ تمام الفاظ) بنتے ہیں (جن کا مطلب ہے) مذاق اڑانا۔‘‘

(۱) التوبة، ۹: ۷۹

(۲) ابن منظور إفريقي، لسان العرب، ۴: ۳۵۲

اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں بھی استعمال ہوا ہے:

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ○ (۱)

''اور بیشک آپ سے پہلے (بھی) رسولوں کے ساتھ مذاق کیا جاتا رہا۔ پھر ان میں سے مسخرہ پن کرنے والوں کو (حق کے) اسی (عذاب) نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے○''

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○ (۲)

''جو لوگ برضا و رغبت خیرات دینے والے مومنوں پر (ان کے) صدقات میں (ریاکاری و مجبوری کا) الزام لگاتے ہیں اور ان (نادار مسلمانوں) پر بھی (عیب لگاتے ہیں) جو اپنی محنت و مشقت کے سوا (کچھ زیادہ مقدور) نہیں پاتے سو یہ (ان کے جذبۂ انفاق کا بھی) مذاق اڑاتے ہیں، اللہ انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے○''

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ○ (۳)

''اور نوح (علیہ السلام) کشتی بناتے رہے اور جب بھی ان کی قوم کے سردار اُن کے پاس سے گزرتے ان کا مذاق اڑاتے۔ نوح (علیہ السلام) (انہیں جواباً) کہتے: اگر

(۱) الانعام، ۶: ۱۰

(۲) التوبۃ، ۹: ۷۹

(۳) ہود، ۱۱: ۳۸

(آج) تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو (کل) ہم بھی تم سے تمسخر کریں گے جیسے تم تمسخر کر رہے ہوo''

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا.(۱)

''کافروں کے لئے دنیا کی زندگی خوب آراستہ کر دی گئی ہے اور وہ ایمان والوں سے تمسخر کرتے ہیں۔''

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَo(۲)

''بلکہ آپ تعجب فرماتے ہیں اور وہ مذاق اڑاتے ہیںo''

اب ذیل میں سِخْرِيًّا کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس کا مطلب بھی تمسخر کرنا اور مذاق اڑانا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَo(۳)

''تو تم ان کا تمسخر کیا کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے تمہیں میری یاد بھی بھلا دی اور تم (صرف) ان کی تضحیک ہی کرتے رہتے تھےo''

اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُo(۴)

''کیا ہم ان کا (ناحق) مذاق اڑاتے تھے یا ہماری آنکھیں انہیں (پہچاننے) سے چوک گئی تھیں (یہ عمّار، خبّاب، صُہیب، بلال اور سلمان رضی اللہ عنہم جیسے فقراء اور درویش تھے)o''

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۱۲

(۲) الصافات، ۳۷: ۱۲

(۳) المؤمنون، ۲۳: ۱۱۰

(۴) ص، ۳۸: ۶۳

ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے زیر بحث آیت کا اگر درج ذیل ترجمہ کیا جائے تو آیت کا مفہوم واضح ہونے کے ساتھ ساتھ زیرِ بحث مسئلہ کا صحیح حل پیش کرے گا۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا:

’’کیا آپ کے رب کی رحمتِ (نبوّت) کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم اِن کے درمیان دنیوی زندگی میں ان کے (اسبابِ) معیشت کو تقسیم کرتے ہیں اور ہم ہی ان میں سے بعض کو بعض پر (وسائل و دولت میں) درجات کی فوقیت دیتے ہیں (کیا ہم یہ اس لئے کرتے ہیں) کہ ان میں سے بعض (جو امیر ہیں) بعض (غریبوں) کا مذاق اڑائیں اور آپ کے رب کی رحمت اس (دولت) سے بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے (اور گھمنڈ کرتے) ہیں o‘‘

اس ترجمہ کی رو سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ زیرِ بحث آیت کا مضمون تحدیدِ ملکیت کے منافی ہرگز نہیں ہے بلکہ تحدیدِ ملکیت کے حق میں ہے۔ اگر امراء اپنی دولت کے بل بوتے پر غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں تو اسلامی حکومت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ان سے ایسی دولت چھین لے جس پر وہ گھمنڈ کرتے ہیں اور غرباء کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ایک اور تحقیق کے مطابق:

سخر سے باب تفضیل ’’سَخَّرَ یُسَخِّرُ تَسْخِیْرًا‘‘ بنتا ہے جس کا مطلب ہے ’’مسخر کرنا، تسخیر کرنا‘‘۔ یہ لفظ اپنے معنی میں جبری محنت کو سموئے ہوئے ہے۔ لسان العرب میں ہے:

سَخَّرَ یُسَخِّرُ سُخْرِیًّا: کلّفه ما لا يريد وقهره.[1]

’’سَخَّرَ یُسَخِّرُ سُخْرِیًّا کا مطلب ہے کسی کو ایسے کام کا مکلّف بنانا اور ایسے

(۱) ابن منظور افريقي، لسان العرب، ۴: ۳۵۳

کام پر مجبور کرنا جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔‘‘

اس معنی کی رو سے زیرِ بحث آیت کا مضمون کچھ یوں بنے گا کہ ہم نے یہ تقسیم اس لیے کی کہ امیر غریبوں سے زبردستی خدمت (Forced Services) اور جبری محنت (Compelled Labour) لیں؟ ہمارا مقصد اس تقسیم کا یہ ہرگز نہیں تھا کہ غریبوں کا استحصال کیا جائے اور غربت کی وجہ سے ان کا مذاق اڑایا جائے۔ اگر امیر طبقہ غریبوں کا استحصال کرنے لگے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ دخل اندازی کر کے غریب عوام کو ان کے حقوق دلوائے اور ان کی عزتِ نفس بحال کرے۔ اس مقصد کے لیے اس کو اگر تحدیدِ ملکیت کا اصول نافذ کرنا پڑے تو یہ قرینِ مصلحت اور جائز تصور ہوگا۔

بحث کا ماحاصل

مذکورہ بالا تمام آیات سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشی تعلیمات کے تحت ’’تحدیدِ ملکیت‘‘ جائز ہے اور اسلامی مملکت حالات و واقعات کے تناظر میں تحدیدِ ملکیت کرنے کی مجاز ہے۔

انسان اور کائنات

انسان آج بھی کتاب کائنات کے مطالعہ میں سرگرم ہے اور اپنی تحقیق و جستجو میں مشغول رہتا ہے۔ اب تک جو ترقی ہوئی وہ اس کائنات کی مخلوقات میں غور و فکر کرنے اور اس عالم طبیعت کے علل و معلولات پر آگاہ ہونے ہی کی مرہون منت ہے۔ آج اِنسان کی یہی کوشش ہے کہ حتی المقدور عالم طبیعت کے تاریک گوشوں کو اپنے علم و تحقیق کے نور سے روشن کرے اور کائنات کے نا معلوم اسرار و رموز کے چہرے سے نقاب اُلٹ دے۔ تاکہ اس ترقی و کمال کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھائے اور نو بہ نو کامیابیاں اس کا مقدر بن جائیں۔ اب اگر کوئی سوال کرے کہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ کئے بغیر کتاب خلقت کا مطالعہ کرنا اور حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس کا مطالعہ کرنا۔ ان دونوں میں کیا فرق

ہے؟ بالفاظ دیگر عالم کائنات میں غور و فکر کرتے ہوئے اسرار گیتی کی واقفیت پانا تو بلندی اور ترقی کا موجب ہے، کیا ایمان باللہ کے ساتھ ترقی اور بغیر ایمان باللہ کے ترقی میں باہم فرق ہے؟ اگر فرق ہے تو یہ فرق فقط نفسیاتی پہلو رکھتا ہے یا عملاً انسانی زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالق کی طرف توجہ کرتے ہوئے مخلوق کا مطالعہ اس عالم ہستی کے حکیمانہ نظام کی توجیہ میں علمی واقعیت پسندی ہے اور مخلوقات عالم کے خالق کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے فائدہ اُٹھانا اس پیدا کرنے والے خالق کے حق میں انسانی اور اخلاقی حق پسندی ہے۔ لیکن ان دونوں معنوی پہلوؤں سے منہ پھیرنا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہوئے ترقی کرنا ایک صحیح اور بے عیب ترقی ہے اور انسانی زندگی پر دو طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ان دونوں جہتوں کا خلاصہ ہم ذیل میں بیان کئے دیتے ہیں۔

اول: ایک مسلمان انسان جو تمام ارضی و سماوی موجودات کو مخلوق و مملوک خدا مانتا ہے۔ وہ اپنے لئے لازم جانتا ہے کہ ہمیشہ اس ذات حق کی اطاعت کرے اور اپنے تمام معمولات زندگی میں بلاقید و شرط اس کا مطیع رہے۔ وہ اپنی حدود سے آگاہ ہوتا ہے اور اپنے خالق و مالک کی ملکیت میں اس کی دی ہوئی اجازت کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ وہ اپنی خداداد طاقتوں کو لوگوں کی خدمت میں صرف کرتا ہے اور اپنی توانائیاں راہ ظلم و جرم میں خرچ نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ جائز اقتصادی ذریعہ اختیار کرتا ہے اور چوری یا دیگر بری حرکتوں سے پرہیز کرتا ہے۔ ایسا انسان کسی روز اپنی علمی تحقیق و تلاش کے ذریعے ایٹم کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اِسے بھی خداوند عالم کی دی ہوئی اجازت کے مطابق اِستعمال کرتا ہے۔ مثلاً بیماریوں کا علاج کرنے، شہروں میں روشنی مہیا کرنے، بحری جہازوں کو چلانے، ہوائی جہازوں کو اُڑانے، کرّوں کو متحرک رکھنے، غرض یہ کہ وہ اس قوت کو ایسے اُمور میں صرف کرتا ہے جن سے لوگوں کو رفاہ اور آسائش حاصل ہو۔ وہ ایٹمی توانائی کو خالق کی رضا کے خلاف آبادیوں کو تباہ کرنے، اجتماعی قتل و غارت بپا کرنے، بچوں،

بوڑھوں، مردوں، عورتوں، بیماروں، تندرستوں سب کو یکبارگی نابود کرنے میں ہرگز اِستعمال نہیں کرتا۔ غیر مسلم جارحیت پسند طبقہ جو کچھ بھی کرے گا وہ اِس کے برعکس کرے گا۔

اسلام کا تصوّرِ عبادت

عبادت کے لغوی معنی عابد کا اپنے معبود کے سامنے تضرع و تذلل کرتے ہوئے اس کی اطاعت کرنا ہے۔ قرآن حکیم نے سب انسانوں کو پروردگار عالم کی عبادت و بندگی کی دعوت دی اور ان پر فرض عائد کیا ہے کہ وہ اس مقدس عمل کو بجا لائیں۔ عجیب بات ہے کہ اِسلام کی اس آسمانی کتاب نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اس کے خالق ہونے سے مربوط کیا اور لوگوں کو عبادت خدا کی دعوت دیتے وقت اس عالم کائنات کی خلقت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ درحقیقت وہ اس یاد دہانی میں اللہ کی عبادت کے علل و اسباب کی توجیہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُo(۱)

’’فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بیشک تو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہےo‘‘

یہ ایک حقیقت ہے کہ اِنسان جتنی بھی ترقی کر لے نظامِ کائنات کی تہہ در تہہ حکمتوں کو کاملاً نہیں سمجھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے اور واضح بتایا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی بندگی کے لئے کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَo(۲)

---

(۱) البقرۃ، ۲: ۳۲

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۱

’’اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو (بھی) جو تم سے پیشتر تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤo‘‘

ایک دوسرے مقام پر یہی نکتہ یوں بیان ہوا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌo[1]

’’یہی (اللہ) تمہارا پروردِگار ہے اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں (وہی) ہر چیز کا خالق ہے پس تم اسی کی عبادت کیا کرو اور وہ ہر چیز پرنگہبان ہے۔‘‘

اس نکتے کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ اِسلام میں عبادت فقط چند فرائض کو انجام دینے تک محدود نہیں بلکہ اس لفظ کے معنی میں بہت وسعت ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ اور مملوک اور بعنوان عبادت اس کا فریضہ ہے کہ اپنی ترقی یافتہ علمی اور فکری صلاحیتوں کو فقط مشروع اور جائز اُمور میں صرف کرے۔ لیکن ہر ایسی راہ جو خداوندِعظیم کی پسندیدہ نہیں وہ ان صلاحیتوں کو اس میں بروئے کار نہ لائے اور خود کو رب العزت کی سزاؤں کا مستحق نہ بنائے۔ ایک مومن فرد کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ عبادت کی نیت سے معاشی اُمور میں مصروفِ عمل ہو۔ وہ اپنی محنت و کاوش کے ساتھ دولت حاصل کرے، باعزت زندگی گزارے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مستحق اجر و ثواب قرار پائے۔ چونکہ وہ مومن اپنے آپ کو حق تعالیٰ کا مملوک اور اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت سمجھتا ہے لٰہذا وہ پابند ہے کہ اپنے سرمائے سے صرف جائز منافع حاصل کرے، اسے ناروا اُمور میں خرچ نہ کرے اور اپنے آپ کو پروردگار عالم کی ناراضی کا مستحق نہ بنائے۔

خلاصہ یہ کہ اِسلام میں عبادت ایسی چیز ہے جو ایک طرف سے لوگوں کو عقلی، علمی، فکری، روحانی، اخلاقی، معاشی، اجتماعی اور دیگر تمام مدارج کے اعتبار سے متحرک اور

(۱) الانعام، ۶: ۱۰۲

فعال بناتی ہے۔ دوسری طرف وہ ترقی کو اطاعت پروردگار کی چاردیواری کے اندر محدود کر دیتی ہے، یعنی وہ ترقی کو معاشرے کی سعادت و مصلحت کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ عبادت یہ اجازت نہیں دیتی کہ تمام مادی یا معنوی سرمائے کو غیر صحیح اور ممنوع مقامات پر کام میں لایا جائے۔ یہ عبادت کا ایک جامع مفہوم ہے اور اس سے بے عیب ترقی ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی اس آیت شریفہ کا بھی یہی مطلب ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِo [۱]

''اور میں نے جنّات اور انسانوں کو صرف اسی لئے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی اختیار کریںo''

دورِ حاضر کے انسان نے علمی تحقیقات اور اسرار آفرینش کی اطلاعات میں عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اس راستے میں بلند ترین مدارج تک جا پہنچا ہے۔ اس نے عقل و دانش کی طاقت کے ذریعے عالم طبیعت پر غلبہ پا لیا ہے اور زمین کی اشیاء کو مسخر کر لیا ہے۔ آج کے انسان نے مشینری اور صنعت کی طاقت سے مختلف عناصر طبیعت کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور زیادہ آسائش مہیا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود یہ ترقی اور یہ کامیابی اس کی خوش بختی اور سعادت کا موجب نہیں بن سکتی اور اس کے لئے قلبی اور فکری اطمینان مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

انسان کے عدمِ سکون اور اضطراب کی وجہ

آج کے انسان کی زندگی بے چینی، اضطراب اور دیگر گونا گوں مصائب و آلام سے پُر نظر آتی ہے۔ جنگ و خونریزی، قتل و غارت، جارحیت اور سپر پاور کا کمزوروں پر جبر وتسلط ایسے اُمور ہیں جن کے سبب انسان رنج وغم، بے سکونی و بے اطمینانی کا پیکر بن گیا

(۱) الذاریات، ۵۱: ۵۶

ہے اورتقریباً تمام اقوام بالواسطہ یا بلاواسطہ ان مصیبتوں سے دوچار دکھائی دیتی ہیں۔ان تمام مصائب کی بنیاد علم و دانش کی کمی نہیں اور نہ ہی مال و ثروت یا صنعت وحرفت کی قلت ہے۔ بلکہ ان تمام جرائم و مظالم کا سرچشمہ ایمان کی کمی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونے کے احساس کا فقدان ہے۔اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (۱)

”اور جس نے میرے ذکر (یعنی میری یاد اور نصیحت) سے روگردانی کی تو اس کے لئے دنیاوی معاش (بھی) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے قیامت کے دن (بھی) اندھا اٹھائیں گے○“

اس سے بڑھ کر اور کیا تنگی ہوسکتی ہے کہ اس جہان کی زیادہ تر ترقی یافتہ اقوام زندگی کے عالی ترین وسائل کی مالک ہیں اور بہترین نعمتیں ان کو حاصل ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ بے اطمینانی اور بے سکونی میں زندگی بسر کرتی ہیں، قلب کو غم اور خوف سے امان نہیں۔ اغواء، قتل، خودکشی، چوری، ڈاکہ زنی، ناکامی، شکست اور اس طرح کے دیگر مصائب اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے ہیں۔ اب نوبت بایں جا رسید کہ وہ لوگ چند گھنٹے آرام کی نیند سونے کے لئے بھی خواب آور گولیوں کی مدد کے محتاج ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ تلخیاں اور سختیاں صرف اس لئے ہیں کہ آج کے انسان نے اپنے خالق و مالک سے منہ موڑ لیا ہے اور وہ خود کو اس کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا۔ اس دنیا کے انسانوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انکار کر کے خواہش نفس کی غیر مشروط بندگی اختیار کر بیٹھے ہیں۔ جاہ طلبی، برتری کی تلاش، شہوت وغضب کی کشش اور دولت کی طرف میلان نے ان کو اس طرح اپنا غلام بنا لیا ہے کہ اب وہ لذائذ

(۱) طٰہٰ، ۲۰: ۱۲۴

و خواہشات کو سیر کرنے کے لئے کسی قسم کی خیانت کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی نفسانی چاہتوں کے حصول میں ہر انسان دشمن حرکت اور ہر گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اپنی علمی اور صنعتی پیش رفت کی وجہ سے جو ترقی و کمال انہیں نصیب ہوا تھا، وہ اپنی پوری درخشندگی اور وسعت کے باوجود ایک عیب دار ترقی، بے راہ روی اور خود سری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ ایک ایسی ترقی ہے جو اپنی تمام توانائیوں سمیت حیوانی لذائذ و شہوت کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ اس میں ایمان و حقیقت، حق و فضیلت، انصاف و عدالت اور اس قسم کے دیگر تمام انسانی اخلاقی خصائل و کمالات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

سعادت کا بنیادی رکن امن و امان کا قائم رہنا ہے

اِنسانی زندگی میں سعادت کا اساسی رُکن امن و امان کا قائم رہنا ہے، کیونکہ امن کے ماحول ہی میں مختلف علمی، اقتصادی، صنعتی، اجتماعی اور اخلاقی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ امن ہی کے سائے میں عوامی استعدادیں صحیح سمت میں آگے بڑھتی ہیں اور معاشرہ ترقی کی راہیں طے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے اور دین اِسلام کے پیروکار ہمیشہ ایمان کے سائے میں امن تلاش کرتے ہیں۔ جب دین و ایمان کا سرمایہ موجود ہو تو امن اور اطمینان قلب خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مومن افراد میں سے کوئی بھی کسی دوسرے فرد پر تجاوز کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس امر کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ (۱)

”جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو (شرک کے) ظلم کے ساتھ نہیں ملایا انہی لوگوں کے لئے امن (یعنی اخروی بے خوفی) ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں ○“

---

(۱) الانعام، ۶: ۸۲

پھر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جب تک فرد اور قوم اپنے آپ کو نہ بدلے اُس وقت تک آسمانی فیصلے بھی اُس کے لئے مقدر ساز نہیں ہوتے۔ نری خالی اُمیدوں سے تبدیلی ممکن نہیں بلکہ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے بدلنا پڑتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (۱)

''بیشک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔''

اگر انسان خواہش نفس کی پرستش کو چھوڑ دیں اور خدا پرست بن جائیں اگر وہ اپنے لذائذ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ڈھال لیں اور انہیں خوشنودی خدا اور بھلائی کی حدود میں پابند کر دیں تو یقیناً وہ حیوانی پستی سے نکل کر انسانی بلندی کو پہنچ جائیں گے۔ اس وقت ان کی زندگی صلح وصفائی، امن وآرام اور خوش بختی وسعادت کا محور بن جائے گی۔

ایک ایماندار اور خدا پرست انسان اپنے سمیت پورے جہان کو پروردگار حکیم و دانا کی مخلوق تسلیم کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہوتا ہے کہ اس کا آغاز فیض خداوندی کے ذریعے ہوا اور اس کا انجام بھی اس ہستی کے حضور میں ہوگا۔ ارشاد ہوا:

وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَo (۲)

''اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا ہے اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گےo''

یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا منکر بھی عملاً انکار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰىo (۳)

''اور یہ کہ (بالآخر سب کو) آپ کے رب ہی کی طرف پہنچنا ہےo''

(۱) الرعد، ۱۳: ۱۱

(۲) حم السجدۃ، ۴۱: ۲۱

(۳) النجم، ۵۳: ۴۲

ایک مادہ پرست انسان اپنے سمیت سارے جہان کو ایک مادی پیداوار اور طبیعت جیسی اندھی اور بہری شئ کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اتفاقی حادثے کے ذریعے پیدا ہونے والے علل و معلولات کے توسط سے وجود میں آ گیا ہے۔ وہ اس جہان میں چند روز زندگی گزارتا ہے پھر موت آتی ہے تو اس کی کتاب زندگی مکمل طور پر بند ہو جاتی ہے اور اس کا قصہ تمام ہو جاتا ہے۔

آیت الکرسی میں اِس غلط طرزِ فکر کی اصلاح کی گئی ہے اور نظامِ کائنات کی طرف اشارہ کر کے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان کسی بھی چیز کا حقیقی مالک نہیں ہے، سب کچھ اُسی مالک کا عطا کردہ ہے، لہٰذا جب سب کچھ اُسی مالک کا عطا کردہ ہے تو پھر انسان کو بھی اُس کی مرضی کے آگے سرِتسلیم خم کر دینا چاہیے۔

www.MinhajBooks.com

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ کا معنی

’’کون ایسا شخص ہے جو اُس کے حضور اُس کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے۔‘‘

قرآنِ حکیم نے مشرکین کی جہاں بت پرستی کی مذمت کی اور شرک کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور اِنسان کو غیر خدا کی پرستش سے نجات دلانے کا درس دیا وہاں اُن کے موہوم اور خود ساختہ شرکیہ دلائل کے بھی بخیئے اُدھیڑ کر رکھ دیئے، کیونکہ مشرکین بت پرستی کے لئے قابل قبول منطقی توجیہہ کرنے کی کوشش کیا کرتے اور اِس سلسلے میں وہ موہوم شفاعت کا سہارا لیا کرتے اور کہتے کہ ہم اِن بتوں کو بارگاہِ الٰہی میں اپنا شفیع بناتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَاللهِ○ (۱)

’’اور (مشرکین) اللہ کے سوا ان (بتوں) کو پوجتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور (اپنی باطل پوجا کے جواز میں) کہتے ہیں کہ یہ (بت) اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں○‘‘

مشرکین اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے بے اثر موجودات کی عبادت کرتے جو نہ اُنہیں نقصان پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ اُنہیں نفع پہنچا سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔

---

(۱) یونس، ۱۰: ۱۸

شافع و مشفوع دونوں ملکیتِ خدا ہیں

''من ذَ الّذِیْ یَشْفَعُ عِندہٗ اِلّا بِاِذنِہٖ'' کے کلمات کے ذریعے پوری شدّت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے، کون ہے جو بارگاہِ الٰہی میں اُس کے اذن و اجازت کے بغیر شفاعت کرنے کی قدرت رکھتا ہو؟ اس سے واضح ہوا کہ شفاعت کرنے والا اور جس کی شفاعت کی جا رہی ہے ہر دو اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ امرِ شفاعت جو معبود و عبد اور خالق و مخلوق کے مابین ایک قسم کا خصوصی رابطہ ہے۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اُسی کے اذن و اجازت پر موقوف ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مخلوق کو کسی دوسری مخلوق کے لئے بارگاہِ الٰہی میں شفیع قرار دے دے اور کوئی بھی اِس کی اجازت کے بغیر شفاعت کا حق نہیں رکھتا۔ مشرکین کو سمجھایا جا رہا ہے کہ تم کس قدر نادان اور احمق ہو جو یہ خیال رکھے ہوئے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ''سفارش و شفاعت'' کے لئے کوئی باقاعدہ اور باضابطہ طریقہ اور نظام نہیں ہے بلکہ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ جسے چاہو اپنی مرضی سے عبادت کے لئے منتخب کر لو اور پھر اُسی کو اپنا شفیع اور سفارشی بھی بنا لو اور اپنے زعم باطل میں کہتے رہو کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں ہماری سفارش کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ اِس جملے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر شفاعت باذن اللہ کی جائے تو وہ صحیح اور مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہو گی۔

نفی و اثبات کی حکمت

''من ذَا الّذِیْ یَشْفَعُ عِندہٗ اِلّا بِاِذنِہٖ'' کا یہ جملہ نفی اور اثبات دونوں پر مشتمل ہے۔ ایک طرف ایسے تمام شفعاء کی شفاعت کی نفی کی جا رہی ہے جو خود ساختہ اور اِنسانوں کی جہالت کی پیداوار ہیں کہ اِنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن و اجازت نہیں ہے۔ اس لئے ان کی سفارش و شفاعت کی نفی کر دی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ جملہ اُس شفاعت و سفارش کا اِثبات کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اذن و اجازت سے واقع اور قائم ہے ایسی

شفاعت و سفارش باذن اللہ ہے اور عقیدہ توحید کے عین مطابق ہے۔ قیامت میں شفاعت کا مستحق ہونا ایک مسلّمہ، مجمع علیہ اور متفق علیہ مسئلہ ہے۔ تاہم بروزِ قیامت بارگاہِ الٰہی میں جو شفاعت اور سفارش ہوگی اُس میں اور ہماری دنیا میں اِنسانوں کی دوسرے اِنسانوں کے ہاں شفاعت اور سفارش کرنے میں نمایاں فرق ہے۔

دنیاوی سفارش اور عقیدہ شفاعت کے مابین فرق

چند نمایاں فرق مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دنیا میں شفیع کے لئے اپنی شفاعت اور سفارش کے امر میں فرماں روا سے اجازت لینا ضروری نہیں کہ جس کے ہاں شفاعت و سفارش کرنا ہوتی ہے کہ وہ اُس کی طرف سے باقاعدہ مجاز ہو لیکن قیامت کے دن یہ قطعی اور لازمی شرط ہے کہ شفاعت کرنے والے کو خالق و مالک کی طرف سے اذن و اجازت حاصل ہو صرف اور صرف مجازِ شفیع و سفارش ہی بارگاہِ مولا میں شفاعت و سفارش کا حق رکھتا ہے اور اُس کی اجازت کے بغیر کسی کو حقِ سفارش حاصل نہ ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے:

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهُ قَوْلًا ○[۱]

”اس دن سفارش سود مند نہ ہوگی سوائے اس شخص (کی سفارش) کے جسے (خدائے) رحمٰن نے اذن (و اجازت) دے دی ہے اور جس کی بات سے وہ راضی ہو گیا ہے (جیسا کہ انبیاء و مرسلین، اولیاء، متقین، معصوم بچوں اور دیگر کئی بندوں کا شفاعت کرنا ثابت ہے)○“

قرآن حکیم میں کہیں بھی مطلقاً شفاعت کی نفی نہیں ہوئی بلکہ بغیر اذنِ الٰہی کے نفی ہوئی ہے۔ اس لئے باذن الٰہی شفاعت پر یقین رکھنا قطعی امر ہے۔ اس کا انکار کرنا کفر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

(۱) طٰہ، ۲۰: ۱۰۹

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهُ.[۱]

''اور اس کی بارگاہ میں شفاعت نفع نہ دے گی سوائے جس کے حق میں اس نے اِذن دیا ہو گاo''

۲۔ ممکن ہے کہ اِس دنیا میں ہر قسم کے مجرموں اور گناہگاروں کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع پہنچا دے اور وہ حکّام کی سزا سے بچ جائیں۔ لیکن بروزِ قیامت صرف وہی مجرم اور گنہ گار شفاعت و سفارش سے نفع اُٹھائیں گے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اِن کے بارے میں اپنے شفعاء کی سفارش و شفاعت کرنے پر راضی ہو گا۔ لہٰذا جو لوگ اِس دنیا میں شرک کرتے ہوئے مریں گے۔ اِن کا گناہ نا قابل معافی ہے اور وہ کبھی بھی شفاعت کے قابل نہ بن سکیں گے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح بیان کیا ہے:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى.[۲]

''اور وہ (اس کے حضور) سفارش بھی نہیں کرتے مگر اس کے لئے (کرتے ہیں) جس سے وہ خوش ہو گیا ہو۔''

مشرکین کے بارے میں واضح نفی کی گئی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ.[۳]

''بیشک اللہ اس (بات) کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور جو (گناہ) اس سے نیچے ہے جس کے لئے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔''

---

(۱) السباء ۳۴: ۲۳

(۲) الأنبیاء ۲۱: ۲۸

(۳) النساء ۴: ۱۱۶

وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى ○(۱)

’’اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں (کہ کفّار و مشرکین اُن کی عبادت کرتے اور ان سے شفاعت کی امید رکھتے ہیں) جن کی شفاعت کچھ کام نہیں آئے گی مگر اس کے بعد کہ اللہ جسے چاہتا ہے اور پسند فرماتا ہے○‘‘

۳۔ دنیا میں تو یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سفارشی و شفیع اپنے فرماں روا کو اپنی شفاعت و سفارش کے ذریعے بھڑکائے اور اِس سے ایک ظالمانہ اور ناحق اقدام کرائے مثلاً کوئی اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے حاکم کے ہاں سفارش کرائے اور اِس ذریعے سے اپنے دشمن کو بے گناہ شکنجے اور عذاب کا شکار کرا دے، یا اگر وہ گناہگار اور مجرم کی سزا میں اپنی سفارش کے ساتھ اضافہ کرا دے اور خلافِ حق و انصاف اُس کو زیادہ سزا دلوائیں، لیکن قیامت کے دن مقبولانِ بارگاہِ الٰہی جو شفاعت و سفارش کریں گے وہ عملِ انصاف کے مطابق اور حق پر پوری اُترتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی سفارش و شفاعت سے گنہگاروں کو جو عفو و معافی اور مغفرت حاصل ہوگی وہ کسی بھی دوسرے شخص کے معمولی سے معمولی حق کے ضائع ہونے کا باعث نہیں بنے گی۔ حضرت سیدنا علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے:

مَنْ كَذَّبَ بِالشَّفَاعَةِ لَمْ يَنَلْهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ.(۲)

’’جس نے شفاعت کو جھٹلایا قیامت کے دن وہ اسے حاصل نہیں ہوگی۔‘‘

متفق علیہ احادیث سے ثابت ہے کہ مومنین، صالحین، شہداء اور فرشتوں کو بھی اذنِ شفاعت حاصل ہوگا اور بروزِ قیامت شفاعت کریں گے۔ لیکن ہم اللہ تعالیٰ کو دنیوی شفاعت کے اُن تمام نقائص سے پاک اور منزہ جانتے ہیں جو ہمارے معاشرتی ماحول کی

(۱) النجم، ۵۳: ۲۶

(۲) قضاعي، مسند الشهاب، ۱: ۲۴۸، رقم: ۳۹۹

سفارش و شفاعت میں پائے جاتے ہیں۔حق شفاعت ایک امتیازی امر اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا اُسے یہ حق عطا کر دے گا۔ اِس امتیازی امر کو خصوصی نوازش کے لفظ شفاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شفاعت کو دُعا کے معنی پر بھی حمل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شفیع بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کی دعا کو قبول کرتے ہوئے گنہگار کو بخش دیتا ہے۔

شفاعت ارادۂ الٰہی کے منافی نہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ شفیع کبھی بھی ذاتِ الٰہی پر اثر انداز نہیں ہوتا اور وہ علم یا ارادہ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا بلکہ شفیع کا اثر اُس گنہگار پر ہوتا ہے جو علم و ارادہ الٰہی کا موضوع قرار پایا ہوتا ہے۔ پس وہ اِس کی حالت اور کیفیت میں وہ تبدیلی کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں معلوم ہے۔ اِس کو بطور مثال یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک گنہگار بغیر شفیع کے ہے اور ایک گنہگار کا شفیع اُس کے ساتھ ہے۔ اِن دونوں کی الگ الگ کیفیت ہے اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ جب ایک شفیع کسی گنہگار کے ساتھ ہو تو اِس سے معلوم میں تبدیلی آتی ہے اور علم خدا میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ پس مرادِ الٰہی میں تبدیلی ہوتی ہے اور ارادہ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اِس نکتہ کو سمجھنے کے لئے توبہ کے تصور کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔

توبہ اور شفاعت

توبہ کرنے سے ایک توبہ کرنے والے کی کیفیت اور اُس کی پاکیزگی کے عمل میں جو تاثیر ظاہر ہوتی ہے، اِس کی طرف توجہ کرنے سے اِس تاثیر کی حقیقت بھی روشن ہو جائے گی جو شفیع کی طرف سے ایک گنہگار پر مرتب ہوتی ہے۔توبہ کا مفہوم اور مطلب یہ ہے کہ ایک گنہگار اپنے غلط راستے سے واپس لوٹ آئے اور اللہ تعالیٰ کی پسند کے خلاف جو کام کرتا رہا ہے اِس پر پشیمان ہو جائے۔ وہ اپنے سابقہ کردار کے بارے میں خالق و مالک

www.MinhajBooks.com

سے عفو و درگذر کی درخواست کرے اور آئندہ کے لئے عزم مصمم کرے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق عمل کیا کرے گا۔ اگر کسی شخص کی اِس طرح کی توبہ قبول ہو جائے تو وہ شخص گناہوں کی غلاظت و گندگی سے پاک ہو جاتا ہے۔ توبہ اور شفاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی سزا سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ ایک گنہگار شخص اپنی توبہ کے ساتھ نہ علمِ خدا میں اور نہ ہی ارادۂ الٰہی میں تبدیلی لاتا ہے، بلکہ توبہ کے ذریعے وہ اپنے آپ کو اور اپنی صفات تبدیل کر لیتا ہے۔ توبہ سے پہلے گنہگار شخص ایک خودسر اور بدکردار شخص ہوتا ہے جو اوامرِ الٰہی سے کنی کتراتا رہتا ہے۔ اُس نے پہلے بھی گناہ کا ارتکاب کیا ہوتا ہے اور آئندہ کے لئے بھی گناہوں پر برقرار رہنے کا عزم کیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اُس کے تمام برے اعمال اور اُس کی بری نیت پر آگاہ ہوتا ہے۔ پس اِس سے اِس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ عفو و رحمت کا ہو جاتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا ۢ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○(۱)

’’اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ (ان سے شفقتاً) فرمائیں کہ تم پر سلام ہو تمہارے رب نے اپنی ذات (کے ذمّہ کرم) پر رحمت لازم کر لی ہے۔ سو تم میں سے جو شخص نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور (اپنی) اصلاح کر لے تو بیشک وہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے○‘‘

لہٰذا جس طرح موت سے پہلے ایک گنہگار کی توبہ اللہ تعالیٰ پر اثر نہیں ڈالتی اور اُس کے علم و ارادہ کو دِگرگوں نہیں کرتی۔ بلکہ خود اِس گنہگار میں تبدیلی لاتی ہے جو علم و ارادہ الٰہی کا موضوع بن رہا ہوتا ہے۔ وہ توبہ اُس کو سزا کے مستحق ہونے کی طرف سے رحمتِ

(۱) الانعام، ٦: ۵۴

خداوندی کے استحقاق کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ بعینہٖ اِسی طرح قیامت کے دن ایک مجرم کے حق میں کسی شفیع کی شفاعت بھی اللہ تعالیٰ کے علم وارادہ پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ گنہگار کی کیفیت کو بدل دیتی ہے اور عفوو درگذرا ور رحمتِ خداوندی کے قابل بنا دیتی ہے۔

دعا، اِستغفار اور عقیدۂ شفاعت

دعا اور اِستغفار سے مراد بارگاہِ الٰہی میں بندے کا اِقرارِ ذلت ونکبت اور اللہ تعالیٰ سے عفو و درگذر کی درخواست کرنا ہے۔ گنہگاروں کے لئے دعا کا اثر بھی توبہ کی طرح کا ہوتا ہے کہ دعا کرنے والا ذاتِ واجب الوجود پر اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی اِس کے علم و ارادہ میں تبدیلی لاتا ہے۔ بلکہ گنہگار کی حالت و کیفیت میں انقلاب پیدا کرتا ہے اور اُسے رحمتِ خداوندی کے لائق بنا دیتا ہے۔ اِسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک گنہگار شخص دعا و اِستغفار کے بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت و کرم کا مورد اور سزاوار نہیں ہوتا، لیکن جب دعا و اِستغفار اِس کے ساتھ ہو جاتے ہیں تو علمِ الٰہی کا متعلق بدل جاتا ہے۔ اِس کے بدلے میں اب وہ شخص سزا وارِ عنایتِ ربانی ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور جود و عطا اُس کے شاملِ حال ہو جاتا ہے۔ اِسی کو قرآن حکیم نے یوں بیان کیا ہے:

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّىْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ج فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ○ (۱)

’’فرما دیجئے: میرے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں اگر تم (اس کی) عبادت نہ کرو، پس واقعی تم نے (اسے) جھٹلایا ہے تو اب یہ (جھٹلانا تمہارے لئے) دائمی عذاب بنا رہے گا۔‘‘

اس آیت کے مفہوم کو بالفاظِ دیگر یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے: کہہ دو کہ تمہاری

(۱) الفرقان، ۲۵: ۷۷

دعا یعنی تضرع و زاری نہ ہوتی تو تم بارگاہِ خداوندی میں کوئی وزن اور کوئی وقعت نہ رکھتے اور سزاوار رحمت و عنایت الٰہی بھی نہ ہو سکتے۔

اس آیت سے واضح ہوا کہ دعا لوگوں پر اپنا اثر دکھاتی ہے اور بارگاہِ الٰہی میں اِن کی حیثیت، قدر و منزلت اور وُقعت کو تبدیل کر دیتی ہے۔ جو لوگ دعا و اِستغفار نہیں کرتے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور جود و عطا کے سزاوار بھی نہیں ٹھہرتے اور بارگاہِ الٰہی میں اِن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ لیکن یہی بندگانِ خدا جب دعا کے ساتھ لب ہلاتے ہیں اور اپنی عبودیت اور ذلت کا اظہار کرتے ہیں پھر وہ قدر و قیمت والے ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت و نوازشات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ قیامت کے دن اذن و اجازت یافتہ شفعاء کی شفاعت و سفارش اللہ تعالیٰ کے ازلی ارادہ کے طفیل میں ہے۔ بروزِ قیامت شفاعت کے تحقق پر پوری اُمت کا اجماع ہے، لیکن متقدّمین و متاخرین کی آراء میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ شفاعت کی خصوصیات اور کم و کیف کے بارے میں ہے اصلاً نہیں ہے۔

مشرکین کا جذبہ اور اُس کا محرّک

مشرکین کا بتوں کی پوجا و پرستش کرنے اور عبادت میں شرک کرنے کے بارے میں قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر تصریح آئی ہے۔ لیکن دو آیات ایسی ہیں جن میں غیرخدا کی عبادت کی طرف مشرکین کو مائل کرنے والی چیز خود اُن مشرکین کی زبانی یہی بارگاہِ الٰہی میں شفاعت اور اُس کے ہاں زیادہ قربت حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔ ارشاد ہوا:

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ط وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ م مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ.(۱)

(۱) الزمر، ۳۹: ۳

”(لوگوں سے کہہ دیں) سن لو طاعت و بندگی خالصۃً اللہ ہی کے لئے ہے، اور جن (کفّار) نے اللہ کے سوا (بتوں کو) دوست بنا رکھا ہے، وہ (اپنی بُت پرستی کے جھوٹے جواز کے لئے یہ کہتے ہیں کہ) ہم اُن کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرّب بنا دیں، بے شک اللہ اُن کے درمیان اس چیز کا فیصلہ فرما دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔“

مشرکین کے شرک کا معیار

عبادت میں شرک کا معیار غیر اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ ایسی تمام آیات جن میں أتعبدون، **ماذا تعبدون، ولما تعبدون، ما تعبدون، اِنما تعبدون** وغیرہ آیا ہے۔ اِن میں شرک درعبادت کی نفی کے ساتھ ساتھ اُس ناجائز عبادت کے محرک کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ بت ہمارے شفعآء ہیں یعنی اِن بتوں کی پرستش کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ بارگاہِ الٰہی میں ہماری شفاعت کریں۔ اسی طرح کی دوسری آیات میں مشرکین کا یہ طرزِ عمل بیان ہوا ہے کہ ”ہم اُن کی عبادت نہیں کرتے مگر اِس لئے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب کریں۔“

اِس سے واضح ہوا کہ مشرکین کے شرک کی علت صرف غیر خدا کی عبادت ہے اب یہ مفہوم اخذ کرنا کہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں شفیع ماننے اور اِن کو بارگاہِ الٰہی کے قرب کا ذریعہ تسلیم کرنے والے اعتقاد و نظریۂ کو بھی اِن کے شرک میں دخل ہے۔ یہ نہایت بھونڈا اور باطل استدلال ہے۔ بلکہ اِن کا یہ احمقانہ اعتقاد تو مشرکین کی نادانی اور فکری نارسائی کی دلیل ہے۔ اِسے یوں سمجھا جائے کہ مشرکین کا غیر خدا کی عبادت کرنا ایک نکتہ ہے اور غیر خدا کی عبادت کا محرک ایک دوسرا نکتہ ہے۔ لیکن یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جو چیز باعثِ شرک بنتی ہے، اِنسان کو مشرکین کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے اور دائمی عذاب کا سزاوار ٹھہراتی ہے، وہ غیر خدا کی عبادت ہے نہ کہ اُس کا وہ محرک جو اُس شخص کو اُس غلط عبادت پر آمادہ کرتا ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ جو کوئی شخص شفاعت کے حصول کے

لئے بتوں کی پرستش کرتا ہے وہ اِس اعتبار سے مشرک ہے کہ اُس نے غیر خدا کی عبادت کی اور اِس لحاظ سے نادان ہے کہ اِس نے ایک جامد و ساکت اور بے اثر موجود کو شفاعت کے لئے منتخب کرلیا۔ تقرب الٰہی کے لئے بتوں کی پرستش کرنے والا اِس لحاظ سے بھی مشرک ہے کہ اِس نے سرے سے عقیدہ توحید کی حقانیت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ قرآنِ حکیم نے ایک اور سبب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ لوگ اپنے آباء کی تقلید میں بتوں کی پوجا پاٹ کرتے تھے۔ لہٰذا اِس لحاظ سے وہ مشرک ہوئے کہ ایک تو بتوں کی عبادت کرتے اور پھر اِس غلط روش میں اپنے آباء کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ کسی بھی اِنسان کو کسی ارضی یا سماوی شے کی عبادت کی طرف مائل اور تحریک کرنے والے عوامل متعدد ہو سکتے ہیں مثلاً تعصب، قومیت، خوف، طمع، شفاعت، تقرب اور اِس کی مثل دیگر کئی اُمور ہیں، لہٰذا جو کوئی بھی اِن عوامل میں سے کسی ایک کی تاثیر میں آکر غیر خدا کی عبادت کرنے لگے وہ مشرک ہے اور اُس کے شرک کا سبب اور علت اُس کا غیر خدا کی عبادت کرنا ہے نہ کہ وہ سبب اور عامل جن کی وجہ سے وہ اِس ناروا پرستش و عبادت کی طرف آیا ہے۔

باطل طرزِ فکر کی اصلاح

ایسی تمام آیات جن میں مشرکین نے اپنی غلط پرستش کی توجیہ کی اور کہا کہ ہم بتوں کی عبادت اِس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالٰی کے ہاں شفیع اور مقرّب ہیں۔ ایسی آیات کے پیش نظر بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ جو کوئی اِنسان یا کسی شے سے اللہ تعالٰی کے ہاں شفاعت طلب کرے وہ مشرک ہے۔ اِس لئے کہ اِن مشرکین نے بھی اِسی امر کو اپنے عمل شرک کی علت قرار دیا ہے۔ لیکن وہ اِس امر سے غافل رہے کہ مشرکین کے شرک کی علّت بتوں سے شفاعت کی توقع کرنا نہیں بلکہ اِن کے شرک کا موجب غیر خدا کی عبادت اور بتوں کی پرستش کرنا ہے۔

ثبوتِ شرک کے لئے نفئ توحید کی بالصراحت ضرورت ہوتی ہے

توحید اور شرک کی مذکورہ بالا تقسیم کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ شرک کے ثبوت کے لئے توحید کی بالصراحت نفی لازم ہے کیونکہ شرک ایک واضح اور معین شرعی اصطلاح ہے جسے عمومی رنگ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شرک کا حتمی اور قطعی فیصلہ کرنے کے لئے یہ تعیّن کرنا ضروری ہے کہ جس اَمر کو شرک کا نام دیا جا رہا ہے اُس کا اُلٹ عینِ توحید ہے۔ شرک کوئی ایسی ٹوپی نہیں جسے اپنی صوابدید کے مطابق جس کے سر پر چاہیں رکھ دیں۔ توحید اور شرک دو متقابل اور دو متضاد چیزیں ہیں یعنی ایک کی نفی کرنے سے دوسرے کا اِثبات ہوگا۔ شرک ثابت کرنے کے لئے توحید کی نفی کرنا ہوگی اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ تعیّن کرنا بھی لازمی ہوگا کہ شرک کا توحید کے مقابلے میں کون سا درجہ ہے۔ آیا یہ شرک، شرک فی الربوبیت ہے یا شرک فی الالوہیت یا شرک فی التحریم۔

اگر شرک فی الربوبیت ہے تو اِس کا تعین کر کے یہ واضح کیا جائے گا کہ یہ مندرجہ ذیل اقسام میں سے شرک کی کون سی قسم ہے: شرک فی الذات ہے یا شرک فی الصفات، شرک فی الافعال ہے یا شرک فی الاسماء۔ جو شخص کسی پر شرک کا فتویٰ صادر کرے لیکن وہ مدعی، شرک کی قسم کا بالصراحت تعین نہ کر سکے کہ جس سے توحید کی کسی قسم کی نفی اور تضاد کو ثابت کیا جا سکے تو ایسے شخص کا الزامِ شرک باطل تصور کیا جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اقسامِ توحید کے باب میں عبادت کا کسی بھی معنی میں اللہ تعالیٰ کے غیر کے لئے ثبوت بلا استثناء مجازی اور حقیقی، ہر دو معنی کے اعتبار سے شرک ہے۔ البتہ مشترک صفت کا غیر اللہ کے لئے اِستعمال مجازاً جائز ہے۔ حقیقی معنی میں اُس صفت کا اِثبات صرف اللہ تعالیٰ کے لئے جائز ہے مخلوق کے لئے جائز نہیں۔ عطائی معنی میں کسی مشترک صفت کا مخلوق کے لئے ثبوت تب شرک بنتا ہے جب وہ حق، مخلوق کے لئے اُسی طرح ثابت کیا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کے لئے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ شرک کی تخصیص، شرک کی وضاحت، تعریف اور اقسام کی صحیح معرفت کی متقاضی ہے۔

جب بھی شرک کی بحث ہوگی تو توحید فی الربوبیت، توحید فی الالوہیت اور توحید فی التحریم کی نفی اور اِن کا تضاد ثابت کرنا ہوگا۔ اِن تین صورتوں کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں کہ جس سے شرک ثابت ہو سکے۔

مبادیاتِ الٰہیات کو بغور سمجھنے کی ضرورت ہے

عقیدۂ توحید اور حقیقتِ شرک کو جاننے کے لئے ایمان کے باب میں الٰہیات کی مبادیات اور تکنیکی اُمور کو شرح صدر سے سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ عقیدۂ توحید اور حقیقتِ شرک کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ کسی چیز کا مثبت پہلو توحید اور اُس کا منفی پہلو شرک ہے مثلاً اگر ہم دن کو مثبت پہلو کہیں تو اُس کا منفی پہلو رات ہوگا۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دن، ظہر اور عصر باہم متضاد چیزیں ہیں کیونکہ اِن میں تضاد کی کوئی کیفیت پائی ہی نہیں جاتی۔ اِسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ رات، عشاء اور نصف شب متضاد صورتیں ہیں اِس لئے کہ اِن میں بھی تضاد نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

تضاد کے تعیّن کا منہاج

اس تناظر میں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ کن چیزوں میں تضاد کارفرما ہے اور کن چیزوں میں نہیں جیسے:

۱۔ رات اور دن دو متضاد حقیقتیں ہیں جن کا تضاد بالکل واضح ہے اور ان میں کسی قسم کا التباس اور ابہام نہیں پایا جاتا۔

۲۔ شیرینی اور مٹھاس کا الٹ اور متضاد ترشی اور کڑواہٹ ہے۔

۳۔ روشنی اور تاریکی ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ سبز رنگ کی روشنی اور سرخ رنگ کی روشنی ایک دوسرے کی متضاد ہے۔

۴۔ تضاد کی ایک اور مثال نر اور مادہ کی ہے جب ہم تذکیر اور تانیث کی بات کرتے ہیں تو کوئی صاحبِ عقل و ہوش یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ مذکر اور بھائی میں یا مونث اور ماں میں کوئی تضاد ہے۔

ان مثالوں سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ دو چیزوں کی حقیقت اور ماہیت جاننے کے لیے ان کے درمیان درجہ بندی اور حد بندی کی خصوصیت کا تعیّن ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے آگاہ نہیں تو پھر کسی چیز کی حد بندی اور اس کے متضاد کو جاننا ممکن نہیں۔

توحید اور شرک کے تعیّن کا منہاج

اعتقادی و علمی مباحث کے ادراک کے لئے ضروری ہے کہ نفس مسئلہ کو الگ الگ کر کے اس کا تجزیہ کیا جائے لہٰذا اس خاص منہجِ تحقیق کے لئے مندرجہ ذیل اصطلاحات کو ازبر کر لینا ضروری ہے:

۱۔ تعیّن

اس اصطلاح میں مخصوص، مقرر اور معیّن ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسے مطلق ہستی کے مقابلے میں کسی غیر مطلق ہستی اور وجود کا ہونا۔ ہم ایک مخصوص چیز کو زیرِ بحث لاتے ہوئے کسی موضوع، شئے یا تصور کو اپنا ہدف بنا کر اس کی تخصیص کا کوئی پیمانہ وضع کرتے ہیں۔ تعیّن کی اصطلاح ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی موضوع یا مضمون کے صحیح تشخص کا پتہ چلانا مقصود ہو۔

www.MinhajBooks.com

۲۔ تضمّن

یہ اصطلاح اس وقت بروئے کار لائی جاتی ہے جب کسی چیز، خیال یا مضمون کے ان عناصرِ ترکیبی کو دریافت کرنا ضروری ہوتا ہے جو اس میں اصلاً موجود ہوں اور اس کا

اطلاق اس کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر کیا جائے تاکہ اس کے تمام مشمولات کا احاطہ ہو سکے۔ اگر کوئی پہلو اس کے دائرے (scope) سے باہر نہ ہو تو یہ تضمنات گویا اس کے اجزاء ہیں جو اس کی جامعیت کے وصف کو تسلسل عطا کرتے ہیں۔

۳۔ حدودِ صحت

اس اصطلاح کے ذریعے اس امر کو دریافت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ کسی موضوع کی صحت کے حدود کیا ہیں؟ اس کا آغاز کس مقام سے ہوتا ہے؟ اور کہاں جا کر ختم ہوتا ہے؟ اس سے آگے کن مماثل اور نئے موضوعات کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ یہ حدود دراصل کسی موضوع کے معنوی اطلاقات کی صحت اور عدمِ صحت کو متعین کرنے کے ساتھ اسے ایک دائرے میں محدود کر کے کسی کمی بیشی سے محفوظ رکھتی ہیں۔

۴۔ امتیاز

اس اصطلاح سے ہم دو مماثل چیزوں اور تصورات کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے نہ صرف مثبت طریقے سے اصل موضوع کی نشان دہی ہو بلکہ دیگر مماثل موضوعات سے اسے ممتاز بھی کیا جا سکے۔ یعنی کوئی ایسی تخصیص ہونی چاہیے جو اس کے وجود کی نشان دہی کرے اور اس کے مفہوم کو دوسروں سے نمایاں کر کے اسے الگ طور پر دیکھنے کی استعداد پیدا کر دے۔ یہ خصوصیت نہ صرف کسی چیز کو قطعیت کا درجہ عطا کرتی ہے بلکہ اس کے اور دوسری چیزوں کے درمیان کوئی التباس اور ابہام باقی نہیں رہنے دیتی: مثلاً مختلف انسانوں اور جانوروں میں ملتی جلتی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور کچھ چیزوں میں غیر مماثل خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان کے درمیان خط امتیاز قائم کیا جائے اور ان کے فرق کو جاننے کا کوئی پیمانہ ہو جس سے ان میں تمیز کی جا سکے۔

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ دو ملتی جلتی یعنی مماثل چیزوں میں بھی کوئی نہ کوئی فرق ضرور نکل آتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مماثلت رکھنے والی دو چیزوں میں فرق

معلوم کرنے کے لئے ان میں عدمِ مماثلت رکھنے والی باتوں کا پتا چلایا جائے۔ اس کی مثال دو جڑواں بہنوں سے دی جا سکتی ہے کہ گہری مشابہت و مماثلت کی بنا پر دیکھنے والا ان میں امتیاز نہیں کر پاتا لیکن ان کی ماں سے پوچھا جائے تو وہ آپ کو سینکڑوں مختلف چیزیں بتائے گی اور کہے گی کہ یہ دونوں ایک جیسی ہرگز نہیں۔ پس اگر صرف مماثلت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس سے ذہنی انتشار جنم لے گا۔ اس لئے ان چیزوں پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے جو عدمِ مماثلت رکھتی ہیں۔ اس طرح فکری و ذہنی خلجان سے بچا جا سکتا ہے۔ جڑواں بہنوں کی مثال کو مدِنظر رکھیں تو ماں ان کے درمیان فرق بتاتے ہوئے کہتی ہے کہ ان میں وجہِ امتیاز ان کی آنکھیں ہیں۔ ایک کی آنکھیں بڑی اور دوسری کی چھوٹی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دانتوں کی ساخت میں بھی فرق ہے۔ ان کی عادات بھی ایک جیسی نہیں۔ ایک زیادہ چالاک ہے اور دوسری سادہ مزاج وغیرہ۔ پس اگر آپ دو علیحدہ وجود رکھنے والی حقیقتوں اور اکائیوں میں موجود عدم مماثلت رکھنے والے پہلوؤں سے آگاہ ہیں تو آپ کو ان کے درمیان پایا جانے والا فرق معلوم ہو جائے گا۔ جب تک آپ چیزوں کے امتیازی تشخص کو نہیں جانیں گے آپ کسی چیز کی تخصیص حتمی طور پر نہیں کر سکتے۔ اس لئے کسی چیز کی صحت اور عدمِ صحت کی حدود اور اس کے درست اور نادرست ہونے کے فرق کو جاننے کیلئے چیزوں کی حدود اور ممانعت کو جاننا ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر آپ کسی چیز کی تخصیص نہیں کر سکتے۔

توحید اور شرک میں بُعد المشرقین

توحید اور شرک دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ توحید ایک سمت میں ہے تو شرک اس کی دوسری سمت میں ہے۔ اگر کوئی توحید کی مخالف سمت میں جائے گا تبھی وہ شرک کا مرتکب ہوگا۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے کہ کسی چیز کو شرک Declare کرنے سے پہلے یہ تعیّن کرنا لازمی ہے کہ توحید کے کس Article، ضابطے اور درجے کی نفی ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے بعض لوگ شریعت کا یہ بنیادی تقاضا سمجھے بغیر بے دریغ شرک کا فتویٰ صادر

کرتے رہتے ہیں اور اپنی فتویٰ بازی سے لوگوں کو مشرک کہنے سے ذرہ بھر نہیں ہچکچاتے۔ وہ ایک طرح سے توحید پر اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ شرک کوئی عمومی نہیں بلکہ خصوصی تصور (Specific Concept) ہے۔ شرک محض گناہ، بدعقیدگی اور غلط بات نہیں بلکہ کفر کا ارتکاب ہے، حتیٰ کہ بدعت کو بھی شرک کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر کوئی چیز حرام ہے تب بھی آپ اسے شرک نہیں کہہ سکتے۔ شرک ہونے کے لئے لازمی ہے کہ وہ صریحاً عقیدۂ توحید کی نفی ہو۔ شرک کا مرتکب محض حرام و ناجائز کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ یکسر ایمان سے خارج اور کافر ہو جاتا ہے۔ شرک کا معاملہ انتہائی گھمبیر اور پیچیدہ ہے۔ اسے کبھی عمومی اور معمولی انداز سے نہیں لینا چاہیے ورنہ خود عقیدۂ توحید مذاق اور کھیل بن جائے گا۔

عبادت اور دُعا میں فرق

قرآن حکیم میں مشرکین کے عمل اور اِن کی بے راہ روی اور کج روی کو دو مادوں اور دو کلمات یعنی ''عبادت'' اور ''دعوت'' سے تعبیر کیا ہے۔ اِسلام کے نزدیک غیر خدا کی عبادت اور پرستش جہاں ہو اور جس شکل میں ہو وہ شرک صریح و جلی ہے اور ناممکن و محال ہے کہ غیر خدا کی عبادت متحقق ہو اور وہ قرآن و اِسلام میں شرک نہ قرار پائے۔ وہی مومن مسلمان موحدِ حقیقی ہے جو کبھی بھی غیر خدا کی عبادت نہ کرے اور عبادت میں کسی شخص یا کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ بنائے۔ مستحقِ عبادت فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور یہی کلمہ توحید ہے اور اِسی کا بیان آیت الکرسی میں ہو رہا ہے، لیکن دعوت یعنی پکارنا غیر خدا کو عبادتِ غیر خدا کی طرح ہر جگہ اور ہر شکل میں شرک صریح و جلی قرار نہیں دیا گیا بلکہ یہ پکارنے والے پر منحصر ہے کہ اِس نے کیوں پکارا ہے! پس اگر کوئی غیر خدا کو شریکِ خدا قرار دے اور پھر اِس کو توحید کے مراتب میں ایک مرتبہ کے عنوان سے پکارے۔ جبکہ ہر مرتبہ توحید اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واجب الوجود سے مختص ہے تو وہاں یہ کہنا چاہیے کہ یہ دعوت یعنی پکار ایک مشرکانہ عمل ہے اور پکارنے والے کے شرک کا اظہار ہے۔ لیکن اگر دعوت

یعنی پکار شانِ توحید اور مراتبِ توحید سے منسلک و مربوط نہ ہو تو پھر اِس کے صحیح یا غلط ہونے کی تحقیق اُس کے اپنے متعلقہ عنوان کے لحاظ سے انجام پائے گی۔ قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر ''دعوت یعنی پکار'' کے مادے کو مختلف صورتوں اور شکلوں میں اِستعمال کیا گیا ہے۔ اِن میں سے بعض دعوتیں یعنی پکاریں مشرکانہ ہیں اور دعا مانگنے والے کے شرک کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر کوئی شخص غیر خدا کو ''اِلٰہ'' مانے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں شریک اور معبود تسلیم کرتے ہوئے پکارے تو یہ نداء و دعا مشرکانہ ہے اور دعا کرنے والا شرک درعبادت کے حکم میں آجاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ○[1]

''اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش کرتا ہے اس کے پاس اس کی کوئی سند نہیں ہے سو اس کا حساب اس کے رب ہی کے پاس ہے۔ بیشک کافر لوگ فلاح نہیں پائیں گے○''

اس مضمون پر چند ایک آیات ملاحظہ کیجئے:

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ○[2]

''فرمادیجئے کہ مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان (جھوٹے معبودوں) کی عبادت کروں جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو۔ فرمادیجئے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کرسکتا اگر ایسے ہو تو میں یقیناً بہک جاؤں اور میں ہدایت یافتہ لوگوں سے (بھی) نہ رہوں (جو کہ ناممکن ہے)○''

(۱) المؤمنون، ۲۳: ۱۱۷

(۲) الانعام، ۶: ۵۶

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَـلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًاo[(۱)]

''اور یہ کہ سجدہ گاہیں اللہ کے لئے (مخصوص) ہیں، سو اللہ کے ساتھ کسی اور کی پرستش مت کیا کروo''

وَالَّذِیْنَ لاَ یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ.[(۲)]

''اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے۔''

اِن تمام آیات میں دو نکتے قابل توجہ ہیں:

۱۔ یہ کہ اِن سب میں دعوت کے مادے کو مختلف شکلوں میں اِستعمال کیا گیا ہے۔ یدعُ، تدعون، تدعُوا، یدعُونَ

۲۔ دعوت کا متعلق کسی کو معبود بنانا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ بعض دیگر موجودات کو معبود بنانا اور عبادت کے لائق سمجھنا۔

اِس قسم کی دعوت اور دُعا شرک در عبادت ہے۔ اگر کوئی اِنسان غیر خدا کو ذات واجب الوجود کے مقابلے میں اصلی قدرت کا مالک اور اِس جہان کا نظام چلانے میں مستقل ارادہ رکھنے والا تسلیم کرے اور اُس کو اُس وحدہٗ لاشریک کی ربوبیت میں شریک مان کر پکارے تو یہ دعا یعنی پکار مشرکانہ ہوگی اور یہ پکارنے والا، دعا مانگنے والا شرکِ فعلی کا مرتکب ہوگا۔ قرآنِ حکیم نے اِس قسم کی دُعا کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَo[(۳)]

''اور جن (بتوں) کو تم اس کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری مدد کرنے پر کوئی قدرت

(۱) الجن، ۷۲: ۱۸

(۲) الفرقان، ۲۵: ۶۸

(۳) الأعراف، ۷: ۱۹۷

نہیں رکھتے اور نہ ہی اپنے آپ کی مدد کر سکتے ہیں o‘‘

غیر خدا کی عبادت ہر جگہ شرک کی دلیل ہے۔ لیکن غیر خدا کی دعوت ہر جگہ شرک کے معنی میں نہیں، کیونکہ ’’عبادت‘‘ کا معنی ہے پرستش کرنا اور ذات واجب الوجود کے علاوہ کوئی شخص یا کوئی چیز قابل عبادت نہیں ہوسکتی۔ لیکن ’’دعوت‘‘ کا معنی ہے پکارنا اور یہ صرف اِس صورت میں شرک کی دلیل بنتی ہے جہاں اُس کا تعلق توحید کی ضِد سے ہو۔ اگر دعوت یعنی پکار کا موضوع اور اُس کا متعلق توحید کے خلاف نہ ہو تو وہ شرک و توحید کی بحث سے خارج ہوگی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگ اپنی اجتماعی زندگی میں ہمیشہ ایک دوسرے کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں اور مدد کے لئے یہ بلانا اور پکارنا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اِنسان کی اجتماعی زندگی کا سلسلہ اِس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ قرآنِ حکیم میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں ’’عبادت‘‘ کا لفظ غیر خدا کی پرستش کے معنی میں اِستعمال کیا گیا ہو اور قرآنِ حکیم نے اِس کو اللہ تعالیٰ سے شرک قرار نہ دیا ہو۔ لیکن ’’دعوت‘‘ کا لفظ غیر خدا کو پکارنے کے معنی میں خود قرآنِ حکیم میں اِستعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ز قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ط فَلَمَّا جَآءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ لا قَالَ لَا تَخَفْ قف نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ o (۱)

’’پھر (تھوڑی دیر بعد) ان کے پاس ان دونوں میں سے ایک (لڑکی) آئی جو شرم و حیاء (کے انداز) سے چل رہی تھی۔ اس نے کہا: میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ وہ آپ کو اس (محنت) کا معاوضہ دیں جو آپ نے ہمارے لئے (بکریوں کو) پانی پلایا ہے۔ سو جب موسیٰ (علیہ السلام) ان (لڑکیوں کے والد شعیب علیہ السلام) کے پاس آئے اور ان سے (پچھلے) واقعات بیان کئے تو انہوں نے کہا: آپ خوف نہ کریں آپ نے ظالم قوم سے نجات پا لی ہے۔‘‘

(۱) القصص، ۲۸: ۲۵

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا.(۱)

”(اے مسلمانو!) تم رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کی مثل قرار نہ دو۔“

اِن آیات میں ”دعوت“ کے مادے سے **یدعوک، یدعوکم، ندعُ** اور **دُعا** اِستعمال ہوئے ہیں۔ ان جیسی تمام آیات میں غیر خدا کو پکارنا مراد ہے اور کسی ایسی ایک آیت کا بھی شرک و توحید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے ہماری مطبوعہ کتاب ”کتاب التوحید“ کا مطالعہ کیا جائے۔ تاہم چند ضروری اور اہم نکات کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

قرآن حکیم میں لفظِ دُعا کے معانی

لفظِ دُعا، دَعْوٌ یا دَعْوَةٌ سے مشتق ہے، جس کا لغوی معنی بلانا یا دعا کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں لفظ دُعا تین مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ دُعا بمعنی دعوت

۲۔ دعا بمعنی التجا

۳۔ دُعا بمعنی عبادت

اب ہم بالترتیب مذکورہ بالا تینوں معانی کی مثالیں قرآنِ حکیم سے پیش کرتے ہیں:

۱۔ دُعا بمعنی دعوت

دُعا کا پہلا اور معروف معنی دعوت دینا یعنی بُلانا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

۱۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ قف عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط

(۱) النور، ۲۴: ۶۳

وَسُبْحٰنَ اللهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○[۱]

''(اے حبیبِ مکرم!) فرما دیجئے: یہی میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر (قائم) ہوں، میں (بھی) اور وہ شخص بھی جس نے میری اتباع کی، اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

ایک دوسرے مقام پر دُعا بمعنی دعوت دینا یوں استعمال ہوا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

۲۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔[۲]

''(اے رسولِ معظّم!) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے۔''

مندرجہ ذیل آیات میں دُعا بمعنی دعوت دینا کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

۳۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ۔[۳]

''اور ہم نے انہیں (دوزخیوں کا) پیشوا بنا دیا کہ (وہ لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔''

۴۔ وَيٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ○[۴]

''اور اے میری قوم! مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلاتے ہو۔''

www.MinhajBooks.com

(۱) یوسف، ۱۲: ۱۰۸

(۲) النحل، ۱۶: ۱۲۵

(۳) القصص، ۲۸: ۴۱

(۴) المؤمن، ۴۰: ۴۱

۵۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَo[۱]

’’اور اس شخص سے زیادہ خوش گفتار کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے: بیشک میں (اللہ ﷻ اور رسول ﷺ کے) فرمانبرداروں میں سے ہوں۔‘‘

۶۔ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ۔[۲]

’’مشرکوں پر بہت ہی گراں ہے (وہ توحید کی بات) جس کی طرف آپ انہیں بلا رہے ہیں۔‘‘

۷۔ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ۔[۳]

’’یاد رکھو تم وہ لوگ ہو جنہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔‘‘

۸۔ مزید ارشاد ہوا:

وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ ج وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَo[۴]

’’اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ رسول (ﷺ) تمہیں بلا رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور بیشک (اللہ) تم سے مضبوط عہد لے چکا ہے، اگر تم ایمان لانے والے ہو۔‘‘

(۱) حم السجدۃ، ۴۱: ۳۳
(۲) الشوریٰ، ۴۲: ۱۳
(۳) محمد، ۴۷: ۳۸
(۴) الحدید، ۵۷: ۸

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی میں دعا بمعنی دعوت اِستعمال ہوا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی شان میں بیان ہوا ہے کہ آپ ﷺ داعی الی اللہ ہیں اور مخلوقِ خدا کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

۲۔ دُعا بمعنی التجا

دَعَا یَدْعُو کا دوسرا اطلاق پکارنا ہے یعنی بعض جگہ دعا یدعو دعا کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کے حضور اس کے عاجز بندے دعا کرتے ہیں اور وہ ان دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں جب کوئی سائل اپنے ہاتھ اٹھا کر مانگتا ہے تو اس وقت التجا کی صورت میں دعا عبادت شمار ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ.[۱]

’’اور تمہارے رب نے فرمایا ہے تم لوگ مجھ سے دعا کیا کرو میں ضرور قبول کروں گا۔‘‘

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

(ادعونی) وحدونی قال رسول اللہ ﷺ: الدعاء ھو العبادۃ۔[۲]

’’صرف مجھ ہی سے دعا کرو، حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: دُعا عبادت ہے۔‘‘

اس حدیثِ پاک کی رو سے وہ دُعا شرک ہے جو غیر اللہ سے ہو اور بطورِ عبادت ہو لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ محض پکارنا ہرگز عبادت نہیں۔

ذاتِ باری تعالیٰ حقیقی معین و مغیث اور مددگار ہے۔ قرآن مجید میں سیدنا

(۱) المؤمن، ۴۰:۶۰

(۲) شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر

www.MinhajBooks.com

آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی اکرم سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کئی انبیاء علیھم السلام کی وہ دعائیں مذکور ہیں جنہیں باری تعالیٰ نے شرفِ قبولیت سے نوازا۔ اسی طرح سابقہ اُمم کے لوگوں کا مختلف احوال میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا ذکر بھی قرآن مجید میں ملتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جن آیاتِ مبارکہ میں دَعَا یَدْعُوْ بمعنی ''دعا'' استعمال ہوا ہے ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ۔(۱)

''اسی جگہ زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی۔''

۲۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝(۲)

''آپ (ان کافروں سے) فرمائیے: ذرا یہ تو بتاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا تم پر قیامت آ پہنچے تو کیا (اس وقت عذاب سے بچنے کے لئے) اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو۔ (ایسا ہرگز ممکن نہیں) بلکہ تم (اب بھی) اسی (اللہ) کو ہی پکارتے ہو پھر اگر وہ چاہے تو ان (مصیبتوں) کو دور فرما دیتا ہے جن کے لئے تم (اسے) پکارتے ہو اور (اس وقت) تم ان (بتوں) کو بھول جاتے ہو جنہیں (اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہو۔''

۳۔ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا.(۳)

''ارشاد ہوا: بے شک تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی، سوتم دونوں ثابت رہنا۔''

---

(۱) آل عمران، ۳:۳۸

(۲) الانعام، ۶:۴۰۔ ۴۱

(۳) یونس، ۱۰:۸۹

۴۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔(۱)

’’فرما دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جس نام سے بھی پکارتے ہو (سب) اچھے نام اسی کے ہیں۔‘‘

۵۔ وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ.(۲)

’’اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو اسی کی طرف رجوع کرتے ہوئے پکارتا ہے پھر جب (اللہ) اُسے اپنی جانب سے کوئی نعمت بخش دیتا ہے تو وہ اُس (تکلیف) کو بھول جاتا ہے جس کے لئے وہ پہلے دعا کیا کرتا تھا۔‘‘

۶۔ لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ز وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ ○(۳)

’’انسان بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتا اور اگر اسے برائی پہنچ جاتی ہے تو بہت ہی مایوس، آس اور امید توڑ بیٹھنے والا ہو جاتا ہے۔‘‘

۷۔ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ○(۴)

’’اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعا کرنیوالا ہو جاتا ہے۔‘‘

۸۔ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ○(۵)

www.MinhajBooks.com

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷:۱۱۰

(۲) الزمر، ۳۹:۸

(۳) حم السجدہ، ۴۱:۴۹

(۴) حم السجدۃ، ۴۱:۵۱

(۵) القمر، ۵۴:۱۰

”سو انہوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میں (اپنی قوم کے مظالم سے) عاجز ہوں پس تو انتقام لے۔“

مذکورہ بالا تمام آیات میں دعا کا معنی یہ ہے کہ اللہ رب العزت کو حقیقی معین و مغیث جان کر اُسی سے ہی دُعا کی جائے بلاشک و ریب وہی مجیب الدعوات ہے۔ اس معنی میں غیر اللہ کو پکارنا شرک ہے۔

۳۔ دُعا بمعنی عبادت

محاورۂ قرآنی میں یہ بات بڑی عام اور متداول ہے کہ جہاں عبادت کا معنی مراد ہو وہاں قرآن یدعون کا استعمال کرتا ہے اور عموماً جہاں ”دعا“ من دون اللہ یامع اللہ کے ساتھ استعمال ہو، وہاں عبادت مراد ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس معنی کے حوالے سے کثیر آیات وارد ہوئی ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ۔(۱)

”اور آپ ان (شکستہ دل اور خستہ حال) لوگوں کو (اپنی صحبت و قربت سے) دور نہ کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کو صرف اس کی رضا چاہتے ہوئے پکارتے رہتے ہیں۔“

۲۔ قُلْ اِنِّیْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ۔(۲)

”فرما دیجئے کہ مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان (جھوٹے معبودوں) کی عبادت کروں جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو۔“

۳۔ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا۔(۳)

(۱) الانعام، ۶:۵۲
(۲) الانعام، ۶:۵۶
(۳) الانعام، ۶:۷۱

''فرما دیجئے: کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیز کی عبادت کریں جو ہمیں نہ (تو) نفع پہنچا سکے اور نہ (ہی) ہمیں نقصان دے سکے۔''

۴۔ **اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔**[۱]

''بے شک جن (بتوں) کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ بھی تمہاری ہی طرح (اللہ کے) مملوک ہیں۔''

۵۔ **فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ شَيْءٍ۔**[۲]

''سو ان کے وہ جھوٹے معبود جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے ان کے کچھ کام نہ آئے۔''

۶۔ **رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ۔**[۳]

''اے ہمارے رب! یہی ہمارے شریک تھے جن کی ہم تجھے چھوڑ کر پرستش کرتے تھے۔''

۷۔ **لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا○**[۴]

''ہم اس کے سوا ہرگز کسی (جھوٹے) معبود کی پرستش نہیں کریں گے (اگر ایسا کریں تو) اس وقت ہم ضرور حق سے ہٹی ہوئی بات کریں گے۔''

۸۔ **يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ط ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ○ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ط لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَ لَبِئْسَ الْعَشِيْرُ○**[۵]

(۱) الاعراف، ۷:۱۹۴
(۲) هود، ۱۱:۱۰۱
(۳) النحل، ۱۶:۸۶
(۴) الكهف، ۱۸:۱۴
(۵) الحج، ۲۲:۱۲۔۱۳

www.MinhajBooks.com

”وہ (شخص) اللہ کو چھوڑ کر اس (بت) کی عبادت کرتا ہے جو نہ اسے نقصان پہنچا سکے اور نہ ہی اسے نفع پہنچا سکے، یہی تو (بہت) دور کی گمراہی ہے۔ وہ اسے پوجتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، وہ کیا ہی برا مددگار ہے اور کیا ہی برا ساتھی ہے۔“

۹۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ۔[۱]

”بیشک جن (بتوں) کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ ہرگز ایک مکھی (بھی) پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ وہ سب اس (کام) کیلئے جمع ہوجائیں۔“

۱۰۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ.[۲]

”اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش کرتا ہے اس کے پاس اس کی کوئی سند نہیں ہے۔“

۱۱۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ.[۳]

”اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی پوجا نہیں کرتے اور نہ (ہی) کسی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جسے بغیر حق مارنا اللہ نے حرام فرمایا ہے اور نہ (ہی) بدکاری کرتے ہیں۔“

۱۲۔ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○ مِنْ دُوْنِ اللهِ ط قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا.[۴]

---

(۱) الحج، ۲۲:۷۳

(۲) المؤمنون: ۲۳:۱۱۷

(۳) الفرقان، ۲۵:۶۸

(۴) المؤمن، ۴۰:۷۳۔ ۷۴

''پھر ان سے کہا جائے گا: کہاں ہیں وہ (بت) جنہیں تم شریک ٹھہراتے تھے۔ اللہ کے سوا، وہ کہیں گے: وہ ہم سے گم ہوگئے بلکہ ہم تو پہلے کسی چیز کی پرستش نہیں کرتے تھے۔''

۱۳۔ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ.[۱]

''اور وہ سب (بت) اُن سے غائب ہو جائیں گے جن کی وہ پہلے پوجا کرتے تھے۔''

۱۴۔ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ.[۲]

''اور جن کی یہ (کافر لوگ) اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں وہ (تو) شفاعت کا (کوئی) اختیار نہیں رکھتے۔''

مندرجہ بالا تمام آیاتِ مبارکہ کے ایسے مقامات میں جہاں دُعا کا معنی عبادت ہے وہاں اس سے مراد بتوں کی عبادت لی گئی ہے۔ عبادت کے معنی میں دعا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لئے جائز نہیں جیسا کہ کفار و مشرکین بتوں کی عبادت کرتے تھے لیکن اس مفہوم کو انبیاء اور اولیاء عظام کو توسلاً پکارنے پر منطبق کرنا صریحاً منشاء قرآن کی خلاف ورزی ہے۔ ایسے مقامات پر جمہور مفسرینِ کرام نے بھی دعا، یدعو سے عبادت مراد لیا ہے محض پکارنا نہیں

مقربینِ بارگاہِ الٰہی کی شفاعت حق ہے

بعض لوگوں نے جوشِ توحید میں آ کر اِن آیات میں غیر خدا کو پکارنا سو فیصد غیر خدا کی عبادت کرنے کے مساوی قرار دے کر سخت ٹھوکر کھائی اور ملتِ اِسلامیہ کے اتحاد کو سخت نقصان پہنچایا۔ ملائکہ، انبیاء، صالحین، شہداء اور مقربینِ بارگاہِ الٰہی کو شفیع باذن اللہ

(۱) حم السجدہ، ۴۱:۴۸

(۲) الزخرف، ۴۳:۸۶

ماننے کو شرک قرار دینا بہت بڑا مغالطہ ہے اور اِس آیت سے استدلال پکڑنا بھی غلط ہے۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (۱)

’’اور جن کی یہ (کافر لوگ) اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں وہ (تو) شفاعت کا (کوئی) اختیار نہیں رکھتے مگر (ان کے برعکس شفاعت کا اختیار ان کو حاصل ہے) جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ اسے (یقین کے ساتھ) جانتے بھی تھے ○‘‘

اِن جیسی دوسری آیات سے بھی خود ساختہ مفہوم اخذ کر کے انحراف حق کی راہ اِختیار کی جاتی رہی ہے۔ حالانکہ اِس آیت میں واضح ہے کہ ملائکہ، انبیاء، صالحین اور شہداء حق ہیں۔ حق و توحید کی شہادت پوری آگاہی و بصیرت کے ساتھ دیتے ہیں۔ اس لئے وہ اِس آیت کا مصداق اُتم ہیں۔ یہ آیت دو اہم نکات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

(۱) ایک لوگوں کا شفعآء سے شفاعت کی درخواست کرنا۔

(۲) اور دوسرا شفعآء کا شفاعت کی صلاحیت رکھنا۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے شفاعت طلب کرنے کے مسئلہ پر بلاواسطہ کوئی بات نہیں کی اور صریحاً نفی یا اثبات نہیں کیا۔ تاہم آیت میں شفعآء کی صلاحیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ غیر خدا سے شفاعت طلب کرنا اِس لحاظ سے غیر صحیح ہے کہ مشرکین کے شفعآء، بت، درخت اور حیوان وغیرہ کی قسم سے ہیں جو شفاعت کا حق نہیں رکھتے اور شفاعت کے مالک نہیں ہیں۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ شہادتِ توحید دینے والوں اور اپنے اِس اقرار میں بصیرت و آگاہی کو اساس بنانے والوں کو اِس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے یعنی یہ طبقہ حق شفاعت رکھتا ہے اور اِس میں شک نہیں کہ اِن صفات کا مصداقِ اتم ملائکہ، انبیاء، شہدا اور صالحین ہیں۔

(۱) الزخرف، ۴۳: ۸۶

آیت کا صحیح مفہوم

عہد جاہلیت میں لوگ مختلف قسم کی اشیاء کو اپنا شفیع بناتے تھے۔ کچھ لوگ بت، درخت اور حیوان کو سفارشی بناتے اور بعض لوگ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عُزیر علیہ السلام اور ملائکہ کو شفیع بناتے اور اُن سے شفاعت کی درخواست کرتے۔ اِسلام نے اِن کے اِس عقیدہ پر دو لحاظ سے روشنی ڈالی ہے۔ ایک یہ کہ کیا غیر خدا سے شفاعت طلب کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ لوگوں نے جنہیں شفیع بنا رکھا ہے وہ شفاعت کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ پہلا سوال دوسرے سوال سے مربوط اور منسلک ہے یعنی شفاعت طلب کرنے کی صحت و عدمِ صحت شفیع کی صلاحیت و عدمِ طلب کرنے پر تبصرہ نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے سوال کا جواب دیا ہے اور لوگوں کے شفعآء کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک گروہ شفاعت کی صلاحیت رکھنے والا اور دوسرا صلاحیت نہ رکھنے والا۔ پہلے گروہ کے بارے میں فرمایا:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ.(۱)

”وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جنہیں شفاعت کے لئے پکارتے ہیں، وہ شفاعت کے مالک نہیں ہیں اور حق شفاعت نہیں رکھتے۔“

آیت کا یہ جزو واضح لوگوں کو سمجھا رہا ہے کہ تمہارے منتخب کردہ یہ شعفآء جو جمادات، نباتات، حیوانات اور اِنسان ہیں۔ یہ شفاعت کے مالک نہیں اور نہ ہی بارگاہِ الٰہی میں شفاعت کر سکتے ہیں۔ نیز بالواسطہ انہیں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ اِس قسم کے موجودات سے شفاعت طلب کرنا ایک لغو اور بے ہودہ عمل ہے۔ مثلاً یہ ایسے ہی ہے کہ ایک شخص کسی اَن پڑھ اور عام شخص سے درخواست کرے کہ وہ اُسے فزکس اور کیمسٹری پڑھائے۔ لیکن دوسرے گروہ کا تذکرہ اِستثناء کی صورت میں کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

(۱) الزخرف، ۴۳:۸۶

اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ○[۱]

”جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ اسے (یقین کے ساتھ) جانتے بھی تھے○“

آیت کا یہ جزو بلاواسطہ سمجھا رہا ہے کہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی شفاعت یافتہ ہیں اور حقِ شفاعت رکھتے ہیں۔ اِس سے ثابت ہوا کہ لوگوں کا مقبولانِ بارگاہِ الٰہی سے شفاعت و سفارش کی درخواست کرنا باطل اور بے ہودہ نہیں ہے۔ اگر اولیاء سے شفاعت طلب کرنا خدا سے شرک ہوتا تو اللہ تعالیٰ شہداءِ حق کو حقِ شفاعت نہ دیتا اور اِن سے شفاعت طلب کرنے کو منع کر دیتا اور صریحاً کہہ دیتا کہ تمہارا مقبولان بارگاہِ الٰہی سے شفاعت طلب کرنا مشرکانہ عمل ہے۔ آیت کے متن میں ”یدعون“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ شفاعت کے حکم کی ضرورت اِس معاشرے کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ مردانِ خدا اور شہداءِ حق کی شفاعت میں بھی محلِ شفاعت کا قابلِ شفاعت ہونا شرط ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى.[۲]

”اور وہ (اس کے حضور) سفارش بھی نہیں کرتے مگر اس کے لئے (کرتے ہیں) جس سے وہ خوش ہو گیا ہو۔“

آیات کا اصل منشاء یہ ہے کہ مشرکین غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں

جو بات اِن آیات کی تیز دھار نوک کا نشانہ ہے اور جس کی اللہ تعالیٰ نے صریحاً اطلاع بھی دی، وہ یہ کہ مشرکین غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک قول کی خبر بھی دے دی ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفیع ہیں۔ گویا مشرکین اپنے معبودانِ باطلہ کے بارے میں اپنے زعم میں ایک وہم پالے ہوئے تھے کہ

(۱) الزخرف، ۴۳: ۸۶

(۲) الأنبیاء، ۲۱: ۲۸

اِن کی عبادت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بُت بارگاہِ الٰہی میں اِن کی شفاعت کریں گے۔ مسئلہ شفاعت کو جو مشرکین کا مقولہ ہے اِس کو اللہ تعالیٰ نے کسی مقام پر بھی اِن کی عبادت پر عطف نہیں کیا۔ کیونکہ ادبی لحاظ سے ہر معطوف، معطوف علیہ کا غیر ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں وہ آیات جو مشرکین کے بارے میں آئی ہیں، اِن میں غیر خدا کی عبادت کا نام تو لیا ہے لیکن شفاعت کا نام تک نہیں لیا۔

قُل لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا.[1]

’’فرما دیجئے: سب شفاعت (کا اِذن) اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔‘‘

یہ آیت اُن لوگوں کے عقائد کے رد میں ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ بارگاہِ الٰہی میں شفاعت کرنا ایک بے قاعدہ اور غیر منظّم معاملہ ہے یعنی ہر ایک اپنی طبعی خواہش کے مطابق جسے چاہے شفیع بنا لے کہ اگر چاہے تو ایک بے اثر اور غیر مستحق کو اپنا شفیع بنا لے۔ یہ آیت اُن لوگوں کے رد میں نہیں کہ جو اُن مقبولان سے شفاعت چاہتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا اور انہیں اپنی بارگاہ میں شفاعت کرنے کا اذن واجازت دے رکھی ہے کیونکہ ایسی شفاعت طلب کرنا اِس آیت کے منافی نہیں۔ اب ہم قدرے تفصیل کے ساتھ شفاعت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہیں۔

www.MinhajBooks.com

(۱) الزُمر، ۳۹: ۴۴

مسئلہ شفاعت کی شرعی حیثیت

شفاعت جمہور مسلمانوں کا وہ عقیدہ ہے جو متعدد قرآنی آیات متواتر احادیث اور اجماعِ اُمت سے قطعی طور پر ثابت ہے۔ اس پر ایمان رکھنا ضروریات دین میں شامل ہے۔ شفاعت کے وجود کا مطلقاً انکار صریح کفر ہے۔ شفاعت کا منکر مسلّماتِ دینی کا منکر ہے اور اس کے انکار کو اس کی ازلی بدبختی شقاوت اور حرماں نصیبی پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔ علمائے اُمت نے شفاعت کی تین اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ شفاعت بالاذن

۲۔ شفاعت بالوجاہت

۳۔ شفاعت بالمحبت

عامۃ المسلمین مندرجہ بالا اقسام میں شفاعت کی ہر قسم کی مقبولیت کے قائل ہیں۔ قطعِ نظر اس سے کہ اس کا تعلق صغیرہ گناہوں کی بخشش و مغفرت سے ہے یا عذاب کی تخفیف سے یا بلندی درجات سے۔ شفاعت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو یہ اعزاز اور مقام ارزانی عطا فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے اذن سے اس کے گنہگار بندوں کی شفاعت کریں اور اس کی ذاتِ کریمانہ اپنے بے پایاں فضل و کرم سے ان کی شفاعت قبول فرمائے۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ روزِ محشر حساب و کتاب جلدی شروع فرمائے گا اور گنہگار بندوں کی بخشش و مغفرت فرما کر ان کو اپنی رضا اور جنت عطا فرمائے گا۔

شفاعت اور تصورِ بخشش و مغفرت

یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ شفاعت اللہ رب العزت کا اپنے گنہگار بندوں پر خاص انعام و اکرام ہے۔ اُمت مسلمہ پر اللہ رب العزت کا یہ بے پایاں احسان ہے کہ اس نے اس میں وہ جلیل القدر اور بلند پایہ اور عظیم المرتبت رسول بھیجا روز قیامت شفاعت عظمیٰ کا اعزاز حضور نبی اکرم ﷺ کو ہی بخشا جائے گا۔ مزید یہ کہ آپ ﷺ کی وجہ سے اللہ رب العزت آپ ﷺ کی اُمت کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ. (۱)

’’تاکہ آپ کی خاطر اللہ آپ کی امّت (کے اُن تمام افراد) کی اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے۔‘‘

یہ حقیقت نفس الامر ہے کہ خالق کائنات نے نوع انسانی کی تخلیق کے بعد اس کے جوہر میں نیکی و بدی اور اچھائی برائی کی صلاحیتیں ودیعت کر دیں اور دونوں راستوں کی نشاندہی کے بعد اسے بخوبی باور کرا دیا گیا کہ اگر وہ نیکی اور اچھائی کی راہ پر چلے گا تو اسے جنت جو رضائے الٰہی کا مقام ہے سے نوازا جائے گا بصورتِ دیگر عدوان، سرکشی و بغاوت کی روش اختیار کی تو اس کا آخری ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ مزید برآں اس پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ انسان کا مقصود حیات انسانِ مرتضٰی بننا ہے، اس مقصد کے لئے لازم تھا کہ اس کے سامنے اتباع کے لئے کوئی قابل عمل نمونہ ہو چنانچہ اس مقصد وحید کی تکمیل کی خاطر بعثت انبیاء و رسل علیہم السلام کے سلسلے کا آغاز کیا گیا جس کی آخری کڑی حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہے۔

(۱) الفتح، ۴۸: ۲

www.MinhajBooks.com

بخشش و مغفرت کا مرکز و محور ذات مصطفیٰ ﷺ ہے

اُمت مسلمہ کی بخشش و مغفرت کا انحصار نسبت رسول ﷺ کے استحکام پر ہے اور اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ اہل عصیاں کی مغفرت کا مرکز و محور حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات والا صفات ہے اور اس نسبت کو پختہ کئے بغیر اِسلام بخشش و مغفرت کا کوئی تصور پیش نہیں کرتا۔ آپ ﷺ کو وما ارسلنک اِلّا رحمۃ للعالمین کی خلعت فاخرہ سے نواز کر اس کائنات ارضی میں مبعوث کیا گیا۔ آپ ﷺ کی رحمتیں اور شفقتیں اُمت مسلمہ پر لاتناہی ہیں۔ آپ ﷺ کی شان رحمت کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی گنہگار اُمتی بخشش کا پروانہ حاصل کرنا چاہے تو قرآن کریم کے مطابق اسے درِ مصطفیٰ ﷺ پر آکر اپنے گناہوں کا اعتراف کرکے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی ہوگی۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا○ (۱)

”اور اے حبیب اگر وہ لوگ جنہوں نے خود اپنے آپ پر آپ ﷺ کی نافرمانی کرکے ظلم کیا تھا آپ کے پاس نادم ہو کر آتے پھر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول یعنی آپ بھی ان کے لئے معافی طلب فرماتے تو یہ لوگ اللہ کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی روشنی میں بخشش و مغفرت کا تصور

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جب کسی سے خطا ہو جاتی تو وہ توبہ کرتے وقت توبہ کی نسبت اللہ کی طرف بھی کرتے اور حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف بھی۔ اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک تصویر دار قالین خریدا اور جب

(۱) النساء، ۴: ۶۴

حضور نبی اکرم ﷺ نے اسے دیکھا تو اپنے قدم مبارک اس پر نہ رکھے بلکہ دروازے پر ہی کھڑے رہے، اُم المومنین نے چہرہ انور پر ناراضی کے آثار پائے تو عرض کرنے لگیں۔

یا رسول اللہ أتوب إلی اللہ وإلی رسولہ ﷺ ماذا أذنبت۔(۱)

''یا رسول اللہ! میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ عالیہ میں توبہ کرتی ہوں مجھ سے کیا خطا ہوئی۔''

طبرانی میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک مجلس میں بیٹھے مسئلہ جبر و قدر پر بحث کر رہے تھے، ان میں حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ روح الامین جبرائیل علیہ السلام نے آقائے دوجہاں ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اپنے غلاموں کے پاس تشریف لے جایئے کہ اُنہوں نے نئی راہ اختیار کر لی ہے۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ اچانک ہی خلاف معمول تشریف لائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سمجھ گئے کہ کوئی ایسی نئی بات ضرور ہوئی ہوگی جس نے آقا ﷺ کو مضطرب کر دیا ہے، حدیث مبارکہ کے الفاظ اس طرح ہیں:

وخرج علیہم ملتمعا لونہ متوردۃ وجنتاہ کأنّما تفقأ بحب الرمان الحامض فنھضوا إلی رسول اللہ ﷺ حاسرین أذرعھم ترعد أکفھم وأذرعھم فقالوا: تبنا إلی اللہ ورسولہٗ۔(۲)

''حضور نبی اکرم ﷺ صحابہ کے پاس تشریف لائے اس طرح کہ چہرہ انور کا رنگ شدّت جلال سے سرخ تھا جیسے کہ رخساروں پر ترش سرخ انار کے دانے

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب البیوع، باب التجارۃ فیما یکرہ لبسہ للرجال والنساء، ۲: ۷۴۲، رقم: ۱۹۹۹

(۲) طبرانی، المعجم الکبیر، ۲: ۹۵، رقم: ۱۴۲۳

نچوڑ دیئے گئے ہوں، صحابہ کرام یہ دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اس حال میں کہ وہ اپنی زرہیں کھول رہے تھے اور ان کے ہاتھ اور بازو شدت خوف سے کانپ رہے تھے پھر یوں عرض کناں ہوئے۔ ہم اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں ان کی طرف توبہ کرتے ہیں۔‘‘

ان روایات سے مترشح ہے کہ بخشش و مغفرت کا محور و مرکز حضور شافی یوم النشور ﷺ کی ذات ہے اور صحابہ کرام ﷺ کا عمل بھی ان کے اس عقیدے کی نشاندہی کرتا ہے کہ توبہ و استغفار محض اللہ تعالیٰ سے کافی نہیں، کیونکہ رد کا امکان بہرحال غالب رہتا ہے جبکہ جو شخص اپنے آقا ﷺ پر کامل ایمان رکھتے ہوئے محبت بھرے انداز میں اور عقیدۃً معافی و بخشش حضور ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے مانگے اور حضور ﷺ سے عرض کرے کہ آقا آپ ﷺ ’’میرے گناہوں کو بخشوا دیجئے‘‘ اور حضور ﷺ اپنے اس گنہگار اُمتی کے لئے اللہ کی بارگاہ میں دست دعا بلند کر دیں تو وہ استغفار کبھی رد نہیں ہوسکتی۔

شفاعت اور دعا کا باہمی تعلق

شفاعت دراصل دعا ہی کا دوسرا نام ہے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ سے اپنی ذات کے لئے اور اپنے اعزاء و اقارب اور عامۃ الناس کے لئے دعا کرے۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ عالیہ میں دعا قبول ہوتی ہے۔ لیکن یہ طے شدہ اَمر ہے کہ حضرات انبیاء کرام و صالحین مومنین اور عامۃ الناس کی دعائیں مقبولیت کی کمی و زیادتی کے اعتبار سے برابر اور ہم پلہ نہیں ہوسکتیں۔ انبیاء کرام، اولیاء عظام اور صالحین مؤمنین کی دعائیں بلا شبہ بدبخت، بدکار فاسق و فاجر اور کافروں کی دعاؤں سے زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا:

وَ صَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّهُمۡ.(۱)

---

(۱) التوبۃ، ۹: ۱۰۳

''اور ان کے حق میں دعا فرمائیں، بیشک آپ کی دعا ان کے لئے (باعثِ) تسکین ہے۔''

اور حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لا یردّ القضاء إلّا الدعاء. (1)

''قضا کو صرف دعا ٹال سکتی ہے۔''

لٰہذا جب مقربانِ الٰہی میں سے کوئی بارگاہِ الٰہی میں دستِ دعا بلند کرے اور کسی ایسے شخص کی شفاعت کرے جس کی شفاعت سے حکم ممانعت وارد نہ ہوا ہو تو اس کی شفاعت مقبول ہوگی اور یہ شفاعت دنیا میں بھی جائز ہے اور آخرت میں بھی۔

شفاعت پر بعض بے بنیاد اعتراضات کا بطلان

بعض لوگ حضور نبی اکرم ﷺ سے دنیا میں شفاعت طلب کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں جبکہ بعض لوگ تو اس عمل کو نعوذ باللہ شرک اور گمراہی کا درجہ دے دیتے ہیں اور بطور دلیل ان آیات کو پیش کرتے ہیں جو مشرکین اور بتوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ خصوصاً یہ آیت مبارکہ بطور استدلال پیش کی جاتی ہے۔

قُل لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (2)

''فرما دیجئے: سب شفاعت (کا اِذن) اللہ ہی کے اختیار میں ہے (جو اس نے اپنے مقرّبین کے لئے مخصوص کر رکھا ہے)، آسمانوں اور زمین کی سلطنت بھی

---

(1) ترمذی، السنن، کتاب القدر، باب ما جاء لا یرد القدر إلّا الدعاء، ۴: ۴۴۸، رقم: ۲۱۳۹

(2) الزمر، ۳۹: ۴۴

اسی کی ہے، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے o"

اس بارے میں چند بنیادی باتیں ذہن نشین کرنا ضروری ہیں۔

(۱) شفاعت اللہ کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کفار و مشرکین جسے چاہیں اسے شفیع نہیں بنا سکتے بلکہ شفاعت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جسے وہ چاہے اذن شفاعت عطا فرماتا ہے اور جسے چاہے اس سے روک دیتا ہے۔

(۲) یہ کہ اللہ خود کسی کی شفاعت فرمانے والا نہیں بلکہ وہ مغفرت فرمانے والا اور مالک شفاعت ہے۔ شفیع کی شفاعت کے قبول اور رد کا اختیار صرف اسے حاصل ہے۔

(۳) اگر کوئی اعتراض کرے کہ بروزِ قیامت عین موقع پر اذن شفاعت دیا جائے گا، اس سے قبل تو یہ حق کسی کو نہیں ملا ہے اور اس سے پہلے کسی کا حق شفاعت ماننا شرک ہوگا تو یہ اعتراض بالکل لغو اور باطل ہے۔ اس لئے کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ شرک جزوی ہو یا کلی، ایک لمحے کے لئے ہو یا عمر بھر کے لئے، اس دنیا میں ہو یا قیامت کے دن، تمام صورتوں میں شرک ہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ساری زندگی تو شرک رہے اور جب اس پر جزا و سزا کا وقت آئے تو جائز ہو جائے۔ شرک اس دنیا میں بھی شرک ہے اور آخرت میں بھی یہ کسی وقت بھی درست نہیں ہو سکتا۔

(۴) اسی طرح جو اَمر کفار و مشرکین کے لئے ممنوع ہو جیسے شفاعت کفار و مشرکین کے حق میں قبول نہیں کی جائے گی مومنین اور متقین کے حق میں قبول ہو شرک نہیں ہو سکتا۔

(۵) اسی طرح جو اَمر غیر مأذون کے لئے ممنوع ہو اور مأذون کے لئے جائز اور ثابت ہو وہ کبھی بھی شرک نہیں ہو سکتا۔

شفاعت کے عدمِ جواز کے غلط استدلال کا بطلان

جو لوگ مذکورہ آیت کریمہ سے دنیا میں شفاعت کے عدمِ جواز کا اِستدلال لاتے ہیں مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر ان کا دعویٰ باطل اور لغو ہے۔

(۱) قرآن و حدیث میں کوئی نص ایسی وارد نہیں ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ سے دنیا میں طلب شفاعت پر ممانعت کرتی ہو۔

(۲) ملکیت عطا کی منافی نہیں ہوتی آیت مذکورہ سے یہ چیز ثابت ہے کہ اللہ رب العزت کا کسی چیز کا مالک ہونا اس چیز کے منافی نہیں کہ اگر وہ کسی اور کو دینا چاہے تو نہیں دے سکتا۔ وہ مالک الملک ہے جس کو چاہتا ہے ملک و بادشاہت دے دیتا ہے۔ جس سے چاہے لے لیتا ہے اس ضمن میں چند ارشادات ربانی اس اَمر پر دلالت کرتے ہیں جو اللہ پاک نے اپنی صفت مالک الملک کے باب میں خود بیان فرمایا ہے۔

لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ. (۱)

''اسی کی ساری بادشاہت ہے اور اسی کے لئے ساری تعریف ہے۔''

اِسی مضمون کو کہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے ملک وسلطنت عطا کر دیتا ہے ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے:

تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ. (۲)

''تو جسے چاہے سلطنت عطا فرما دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔''

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا. (۳)

---

(۱) التغابن، ۶۴: ۱

(۲) آلِ عمران، ۳: ۲۶

(۳) فاطر، ۳۵: ۱۰

www.MinhajBooks.com

’’جو شخص عزّت چاہتا ہے تو اللہ ہی کے لئے ساری عزّت ہے۔‘‘

یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ساری عزت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور وہ یہ عزت عطا فرما دیتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ. (۱)

’’عزّت تو صرف اللہ کے لئے اور اس کے رسول (ﷺ) کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔‘‘

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًاo (۲)

’’(اس دن) لوگ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے (خدائے) رحمٰن سے وعدۂ (شفاعت) لے لیا ہےo‘‘

اس آیہ کریمہ سے یہ ثابت ہے کہ شفاعت کا اصل مالک اللہ ہی ہے جو رحمان ہے اور روزِ قیامت کوئی مالکِ شفاعت نہیں بن سکتا سوائے ان مقبولانِ الٰہی کے جن کو اس سے وعدہ شفاعت مل چکا ہے اس ضمن میں مزید ارشاد فرمایا:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَo (۳)

’’اور جن کی یہ (کافر لوگ) اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں وہ (تو) شفاعت کا (کوئی) اختیار نہیں رکھتے مگر (ان کے برعکس شفاعت کا اختیار ان کو حاصل ہے) جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ اسے (یقین کے ساتھ) جانتے بھی تھےo‘‘

---

(۱) المنافقون، ۸:۶۳

(۲) مریم، ۸۷:۱۹

(۳) الزخرف، ۸۶:۴۳

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شفاعت طلبی

متعدد احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مختلف موقعوں پر جب کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شفاعت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی کسی کو یہ نہیں فرمایا کہ تمہارا مجھ سے شفاعت طلب کرنا شرک ہے اور یہ کہ اپنے اللہ سے طلب کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اس سلسلے میں چند روایات ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یا نبی اللہ! آپ میرے لئے قیامت کے دن شفاعت فرمائیے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''أنا فاعل'' میں شفاعت کروں گا۔ امام ترمذی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔[1]

۲۔ سواد بن قارب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بصورتِ اشعار یوں عرض گزار ہوئے:

فأشهد أن الله لا ربّ غيره
وأنّک مأمون علی کل غائب

(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی رب نہیں اور ہر غائب کے بارے میں آپ امانتدار ہیں۔)

وأنّک أدنی المرسلين وسيلة
إلی الله يا بن الأکرمين الأطايب

(۱) ترمذی، السنن، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب ما جاء في شأن الصراط، ۵: ۶۲۱، رقم: ۲۴۳۳

(اور آپ مرسلین میں سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہونے کی بناء پر اس کی بارگاہ میں میرا وسیلہ ہیں اے پاک بزرگ لوگوں کی اولاد۔)

یہاں تک کہ انہوں نے یہ کہا:

وكن لي شفيعًا يوم لا ذو شفاعة
سواک بمغن عن سواد بن قارب(۱)

(سو آپ میرے سفارشی ہو جائیں جس میں کوئی سفارشی نہ ہو گا آپ کے سوا جو سواد بن قارب کے کام آنے والا ہو۔)

۳۔ حضرت مازن بن العضوب جب مسلمان ہو کر آئے تو اُنہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے شفاعت طلب کی اور یہ اشعار پڑھے:

إليک رسول الله خبت مطيتي
تجوب الفيافي من عمان إلى العرج

(یا رسول اللہ! میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں اس حال میں کہ میری سواری عمان سے عرج تک کے میدان قطع کرتی آئی ہے۔)

لتشفع لي ياخير من وطیء الحصى
فيغفر لي ربي فأرجع بالفلج(۲)

(۱) ۱۔ طبراني، المعجم الكبير، ۷: ۹۴، رقم: ۶۴۷۵
۲۔ فتح الباری، ۷: ۱۸۰
۳۔ هيثمي، مجمع الزوائد، ۸: ۲۵۰
۴۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۲: ۲۵۱

(۲) ۱۔ طبراني، المعجم الكبير، ۲۰: ۳۳۸، رقم: ۷۹۹
۲۔ هيثمي، مجمع الزوائد، ۸: ۲۴۸
۳۔ أبو نعيم، دلائل النبوة: ۷۷

(تاکہ آپ میرے لئے شفاعت کریں اور وہ بہترین ذات جو کنکریوں پر چلنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ سو میرا رب مجھے معاف کر دے تاکہ میں کامیاب لوٹ جاؤں۔)

۴۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ نے ان ۷۰ ہزار لوگوں کا ذکر فرمایا جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے تو حضرت عکاشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اللہ پاک سے میرے لئے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ پاک مجھے بھی ان میں شامل فرما لیں تو آپ نے فوراً بغیر کسی توقف کے فرمایا ''أنت منهم'' کہ تم انہی لوگوں میں سے ہو۔(۱)

یہ جملہ روایات حضور نبی اکرم ﷺ سے دنیا میں طلب شفاعت کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض وہ ہیں کہ جنہوں نے واضح طور پر ''اشفع لی'' کی تعیین کے ساتھ شفاعت طلب کی یا دخول جنت کو بعض نے طلب کیا اور کسی نے یہ طلب کیا کہ وہ اوّلین و سابقین میں سے ہو جائے۔ کسی نے طلب کیا کہ وہ حوض والوں میں سے ہو جائے، کسی نے جنت میں پڑوس اور معیت کو طلب کیا۔

کسی روایت میں نہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے کسی کو بھی یہ فرمایا ہو کہ یہ سوال و طلب کرنا حرام ہے یا ابھی طلب کرنا جائز نہیں، یا ابھی وقت نہیں آیا اور تم لوگ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ پاک شفاعت کی اجازت دے دیں۔ حالانکہ یہ جملہ اُمور شفاعت عظمیٰ کے بعد وارد ہوں گے اور یہ سب طلب شفاعت کے معنی ہی ہیں۔ خود نبی اکرم ﷺ نے ان سب کو اس کی بشارت دی اور وعدہ فرمایا کہ ان کے دلوں کی تسکین ہو

www.MinhajBooks.com

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الرقاق، باب يدخل الجنة سبعون ألفا بغير حساب، ۵: ۲۳۹۶، رقم: ۶۱۷۶

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الإيمان، باب الدليل على دخول طوائف من المسلمين الجنة بغير حساب ولا عذاب، ۱: ۱۹۷، رقم: ۲۱۶

گئی اور آنکھوں کو ٹھنڈک مل گئی۔ حاشاوکلا اگر یہ ممنوع تھا تو حضور نبی اکرم ﷺ نے مداہنت یا مدارات میں اس کا حکم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان نہ فرمایا۔ حالانکہ حضور نبی اکرم ﷺ کو حق بات میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی پروا نہ تھی۔ آپ تو حق بات اور اُصول دین سے دلوں کو جوڑتے تھے اور نفوس کو خوش کیا کرتے تھے اور ہر قسم کے نفاق و باطل سے بہت ہی دور تھے۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ سے دنیا میں آخرت سے قبل طلب شفاعت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقتاً رسول اللہ ﷺ کی شفاعت یا قیامت کے دن اپنے مقام پر بھی حاصل ہوگی اور اس کے بعد اللہ پاک تمام شفاعت کرنے والوں کو شفاعت کی اجازت دے گا۔

شفاعت کا مادۂ اشتقاق اور اس کا مفہوم

لفظ شفاعت ''شفع'' سے مشتق ہے۔

لفظ شفع کا مفہوم بیان کرتے ہوئے امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

الشفع ضم الشئ إلی مثله.(۱)

''کسی ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملانے کو شفع کہتے ہیں۔''

قرآن مجید میں ''شفع'' کا لفظ جوڑے اور ''وتر'' کا لفظ طاق کے لئے اِستعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ○(۲)

''اور جفت کی قَسم اور طاق کی قَسم ○''

(۱) أصفهاني، المفردات فی غریب القرآن: ۲۶۳

(۲) الفجر، ۸۹: ۳

لفظ شفع کے اطلاقات

شفع کا یہ مفہوم کئی تصورات کو واضح کرنے کے لئے اِستعمال ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے لفظ شفع کی شرح میں اس کے مختلف اطلاقات رقم کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کے متضاد لفظ وتر کا مفہوم بھی بیان کیا ہے۔ ہم ان میں سے یہاں صرف دو کا ذکر کریں گے۔

قیل الشفع المخلوقات من حیث انها مرکبات.(۱)

تمام مخلوقات پر بھی شفع کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ تمام مخلوقات مرکب ہیں یعنی کم از کم دو پر مشتمل ہیں۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ○(۲)

''اور ہم نے ہر چیز سے دو جوڑے پیدا فرمائے تا کہ تم دھیان کرو اور سمجھو○''

اس کے مقابلے میں فرد تنہا ذات باری تعالیٰ ہے جو کہ ہر اعتبار سے وحدت کی حامل ہے اور وہ ایسی وحدت ہے جس پر کسی اعتبار سے جوڑے کا تصور قائم نہیں کیا جا سکتا۔

یوم النحر: اسی طرح یوم نحر قربانی کے دن پر بھی شفع کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ قربانی کے ایام تین ہیں یعنی پہلے دن کے بعد متصلاً اسی طرح کے مزید دو دن ہوتے ہیں اور اس کے مقابلے میں یوم عرفہ حج وتر ہے کیونکہ وہ ایک معین دن ہے اور اس کے بعد کوئی دوسرا دن ایسا نہیں جس کو یوم عرفہ میں شمار کیا جائے۔ ان دو مذکورہ بالا استعمالات کی روشنی

---

(۱) راغب اصفہانی، المفردات: ۲۶۳

(۲) الذاریات، ۵۱: ۴۹

میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شفع کے لئے زوج اور جوڑے کا تصور لازم ہے کیونکہ ایک چیز کو اس جیسی دوری چیز کے ساتھ ملانے کو شفع کہتے ہیں اور اس کو ملانے کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم دو چیزیں ہوں جنہیں ملایا جائے۔ امام راغب اصفہانیؒ کے بیان کردہ اِستعمالات بھی اس پر شاہد عادل ہیں۔

مفہوم شفاعت

لفظ شفع میں ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ شفاعت کا مفہوم بھی بالکل واضح ہوجاتا ہے کیونکہ لفظ ''شفع'' لفظ ''شفاعت'' کے لئے اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس میں شفع کے مفہوم کے ساتھ ساتھ قدرے زیادتی کامفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ شفاعت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

والشفاعة الإنضمام إلی آخر ناصرا له وسائلاً عنه.(۱)

کسی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ اس طرح ملا لینا کہ دوسری چیز اس کی مدد کرے اور پہلی اس سے سوال کرے یہی شفاعت ہے۔

لفظ شفیع میں تو مطلقاً ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانے کا ذکر تھا۔ لیکن اس میں ایک کا دوسرے کی مدد و نصرت کرنے اور دوسرے کے سائل و ملتجی ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ اس کی تصریح ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

وأکثر ما یستعمل فی إنضمام من هو أعلیٰ حرمة ومرتبة إلی من هو أدنی.(۲)

(۱) راغب اصفہانی، المفردات: ۲۶۳

(۲) راغب أصفهانی، المفردات فی غریب القرآن: ۲۶۳

''اور لفظ شفاعت کو اکثر مرتبہ و مقام میں بلند درجے کی چیز کے ساتھ ملانے میں اِستعمال کیا جاتا ہے یعنی ایک کمزور ہو دوسرا طاقتور، ایک ادنیٰ ہو دوسرا اعلیٰ۔''

ان کو آپس میں اس طرح ملا دینا کہ کم حیثیت والا زیادہ حیثیت والے سے التجا وسوال کرنے والا بن جائے اور زیادہ حیثیت والا کم کی مدد کرنے والا ہو جائے۔

شفاعت کی اقسام

شفاعت کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں:

۱۔ شفاعت فی الدنیا

۲۔ شفاعت فی الاخرۃ

۱۔ شفاعت فی الدنیا

اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں کسی کی شفاعت کی جائے جسے ہم عرفِ عام میں ''سفارش'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ چیز درست ہے اور قرآن حکیم سے نصِ قطعی کے طور پر ثابت ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ جہالت کی بناء پر کہتے ہیں کہ سفارش کا اِسلام میں کوئی وجود نہیں، اس دنیا میں نہ آخرت میں اور جو لوگ سفارش کرتے ہیں وہ غلط کرتے ہیں ان کی اس غلط فہمی کی بنیاد اس اَمر پر ہے کہ ہمارے اس دور میں اکثر و بیشتر سفارش غلط مقاصد اور ناجائز کاموں کیلئے ہوتی ہے۔ بڑے لوگ ڈاکوؤں، سمگلروں وغیرہ کی سفارش کرتے ہیں۔ نظام کی اس خرابی کے سبب لوگوں کے اذہان میں یہ غلط تصور جڑ پکڑ گیا ہے کہ شاید سفارش کرنا

فی نفسہٖ ناجائز عمل ہے اور اِسلام جیسے عادلانہ نظام میں اس شفاعت یا سفارش کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دنیا کے اس غلط نظام کو دیکھ کر اُنہوں نے بزعم خویش یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ اس کا اطلاق قیامت کے دن پر بھی ہوگا اور وہاں کوئی سفارش وغیرہ نہیں ہوگی کیونکہ وہاں تو عدل کی کارفرمائی ہوگی اور ہر ایک کو اس کے عمل کی پوری پوری جزاء وسزا ملے گی۔ یہ تصور محض غلط فہمی پر مبنی ہے جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ قرآن حکیم نے دنیا اور آخرت دونوں میں شفاعت کا ذکر کیا ہے اور اس کا حق و صائب ہونا بیان فرمایا ہے۔

شفاعت فی الدنیا کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَاۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَاؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًاo(۱)

’’جو شخص کوئی نیک سفارش کرے تو اس کے لئے اس کے ثواب سے حصہ مقرر ہے اور جو شخص کوئی بری سفارش کرے اس کے لئے اس کے عذاب سے حصہ مقرر ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شفاعت یا سفارش دنیا میں جائز بھی ہے اور ناجائز بھی، یہ چیز بھی معلوم ہوگئی کہ دنیا میں اچھی سفارش پر اچھا اجر ملے گا جبکہ غلط اور بری سفارش کرنے پر اس قدر سزا بھی ملے گی۔ لہٰذا مذکورہ بالا غلط فہمی کا ازالہ اس آیتِ قرآنی سے بخوبی ہو جاتا ہے جبکہ معترضین کا اس پر اعتراض اس کے غلط اِستعمال کی وجہ سے تھا، قرآن نے دونوں چیزوں کو جدا جدا بیان فرما دیا ہے اس لئے غلط سفارش کی بناء پر درست سفارش کا انکار عدل کے منافی ہے۔

۲۔ شفاعت فی الآخرۃ

جس طرح دنیا میں شفاعت جائز ہے اس طرح آخرت میں بھی جائز ہے۔

(۱) النساء، ۴: ۸۵

اس کی دو اقسام ہیں:

۱۔ شفاعت کبریٰ

۲۔ شفاعت صغریٰ

اول الذکر شفاعت کبریٰ حضور ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ ہی خاص ہے۔ اس کا بیان آیہ کریمہ میں ہے:

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○[1]

’’یقیناً آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا (یعنی وہ مقامِ شفاعتِ عظمیٰ جہاں جملہ اوّلین و آخرین آپ کی طرف رجوع اور آپ کی حمد کریں گے)○‘‘

مقامِ محمود وہ مقام ہے جہاں آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے اور اللہ اور اس کی جملہ مخلوق آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہوگی۔ اللہ اللہ! کیا رفیع الشان مقام ہوگا جب شانِ محمدیت کا پورا پورا ظہور ہوگا اور جہاں جملہ اولیں و آخریں بمع خالق کائنات کے ثنائے محمد ﷺ کر رہے ہوں گے۔ (اللھم ارزقنا شفاعتہ یوم القیامۃ)

مقامِ محمود، مقامِ شفاعت ہے

قرآن حکیم میں بیان کردہ مقام محمود سے مراد مقام شفاعت ہی ہے اس پر حضور ﷺ کی احادیث مبارکہ اور مفسرین کرام کی بہت ساری تصریحات شاہدِ عادل ہیں:

۱۔ عن آدم بن علي قال: سمعت ابن عمر رضي الله عنه يقول: إن الناس يصيرون يوم القيامة جثي كل أمة تتبع نبيها يقولون: يا فلان اشفع يا فلان اشفع حتى تنتهي الشفاعة إلى النبي ﷺ فذلک يوم يبعثه

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷:۷۹

اللہ المقام المحمود.[1]

”آدم بن علیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں بے شک لوگ روز قیامت چلیں گے، ہر اُمت اپنے نبی کو تلاش کرے گی، وہ کہہ رہے ہوں گے اے فلاں تو ہماری شفاعت کر، اے فلاں تو ہماری شفاعت کر یہاں تک کہ شفاعت کی انتہاء نبی مکرم ﷺ پر ہو گی پس یہ وہ دن ہو گا جس دن اللہ تعالیٰ حضور نبی اکرم ﷺ کو مقام محمود عطا فرمائے گا۔“

فائدہ: اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ شفاعت کی غایت اولیٰ اور انتہاء حضور ﷺ کی ذات گرامی پر ہو گی یعنی اس سے بڑھ کر کوئی اور شفاعت نہ ہو گی یہی شفاعت کبریٰ ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِي قَوْلِهِ ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ سُئِلَ عَنْهَا قَالَ: هِيَ الشَّفَاعَةُ.[2]

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول مبارک: ”عسیٰ أن یبعثک ربّک مقاماً محموداً“ کے بارے میں فرمایا، یا اس کے بارے میں آپ سے سوال کیا گیا حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ

(۱) ۱۔ بخاري، الصحیح، کتاب التفسیر، باب سورہ بنی اسرائیل، ۴:۱۷۴۸، رقم: ۴۴۴۱
۲۔ ترمذی، السنن، کتاب التفسیر عن رسول اللہ ﷺ، باب من سورۃ بنی اسرائیل، ۵: ۳۰۸، رقم: ۳۱۳۷
۳۔ بیھقي، السنن الکبریٰ، ۶: ۳۸۱، رقم: ۴۲۹۵

(۲) ۱۔ ترمذي، السنن، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ، باب ومن سورۃ بني اسرائیل، ۵: ۳۰۳، رقم: ۳۱۳۷
۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳: ۵۹
۳۔ سیوطي، الدر المنثور، ۸: ۵۴۳

شفاعت ہے۔“

امام ترمذیؒ کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے مقام محمود کے حوالے سے دیگر ائمہ احادیث نے جو روایات نقل کی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا كان يوم القيامة مد الله الأرض مد الأديم حتى لا يكون لبشر من الناس إلا موضع قدميه فأكون أول من يدعى و جبريل عن يمين الرحمٰن تبارک و تعالیٰ والله مارآه قبلها فأقول: أي رب! إن هذا أخبرني أنک أرسلتهٗ إلي فيقول الله ﷻ: صدق ثم اشفع فأقول: يارب! عبادک عبدوک في أطراف الأرض و هو المقام المحمود. (۱)

جب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سطح زمین کو اتنا کم کر دے گا کہ آدمی کے لئے فقط اپنے پاؤں رکھنے کے لئے جگہ باقی رہے گی۔ سو میں پہلا آدمی ہوں گا جس کو بلایا جائے گا اور جبریل امین اللہ کے دائیں طرف ہوں گے۔ اللہ کی قسم میں نے جبریل کو ایسی حالت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پس میں کہوں اے میرے رب! یہ ہے وہ جس نے مجھے خبر دی کہ تو نے اس کو میری طرف بھیجا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس نے سچ کہا۔ پھر میں شفاعت کروں گا عرض کروں گا اے میرے رب تیرے بندے زمین کی ہر جگہ تیری عبادت کرتے تھے اور وہ مقام جہاں کھڑا ہو کر میں شفاعت کروں گا مقامِ محمود ہو گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(۱) هندي، کنز العمال، ۱۴: ۴۰۷، رقم: ۳۹۰۹۴

www.MinhajBooks.com

أن يقيمک ربک مقاما محمودا مقام الشفاعة محمودا يحمدک الأولون والآخرون.[1]

’’آپ ﷺ کے رب کا آپ کو مقام محمود پر کھڑا کرنا مقام شفاعت ہے جس جگہ اولین و آخرین آپ کے لئے محوِ ثناء ہوں گے۔‘‘

امام خازن فرماتے ہیں:

والمقام المحمود هو مقام الشفاعة لأنه يحمده فيه الأولون والآخرون.[2]

’’اور مقام محمود ہی مقام شفاعت ہے کیونکہ اس مقام پر اوّلین و آخرین آپ ﷺ کی تعریف کریں گے۔‘‘

امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں:

يحمدک فيه الأولون والآخرون وهو مقام الشفاعة.[3]

’’مقامِ محمود وہ مقام ہے جس جگہ اوّلین و آخرین آپ ﷺ کی حمد کریں گے اور وہ مقامِ شفاعت ہو گا۔‘‘

مذکورہ بالا تمام تصریحات سے ثابت ہوا کہ مقامِ محمود شفاعت ہی ہے۔

شفاعتِ کبریٰ اور نص قرآنی

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(۱) ابن عباس، تنوير المقباس من تفسير بن عباس: ۲۴۰

(۲) خازن، لباب التأويل في معاني التنزيل، ۲: ۱۷۵

(۳) سيوطی، محلی، جلالين: ۲۹۰

وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰیO(۱)

’’اور آپ کا رب عنقریب آپ کو (اتنا کچھ) عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گےO‘‘

مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے شفاعت کی تمام حدوں کو اُٹھا دیا، فقط ایک حد باقی رکھی اور وہ ہے رضائے مصطفیٰ ﷺ کہ جب حبیب راضی ہو گا اس وقت تک شفاعت کو قبول کرتا رہوں گا اور آپ کے اُمتیوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کرتا رہوں گا:

وسعتیں دی ہیں خدا نے دامن محبوب کو
جرم کھلتے جائیں گے اور وہ چھپاتے جائیں گے

حضور ﷺ کے مندرجہ ذیل ارشادات بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔

ایک دفعہ حضور ﷺ اپنی اُمت کے حق میں دعا کر کے گریہ زاری کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو بارگاہ مصطفوی ﷺ میں بھیجا کہ جا کر میرے محبوب سے پوچھ کہ ان کو کون سی چیز مائل بہ گریہ کر رہی ہے۔ جبریل امین حاضر ہوئے اور پوچھا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بتایا کہ وہ اپنی اُمت کے لئے آنسو بہا رہے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جبریل امین سے فرمایا: اے جبریل! میرے محبوب کے پاس جا اور ان سے کہہ دے:

إنّا سنرضیک في أمّتک ولا نسوءک.(۲)

’’بے شک ہم آپ کو آپ کی اُمت کے حق میں عنقریب راضی کر دیں گے اور آپ کو اس بارے رسوا نہیں کریں گے۔‘‘

(۱) الضحی، ۹۳: ۵

(۲) مسلم، الصحیح، کتاب الایمان، باب دعا النبي ﷺ لأمّته، ۱: ۱۹۱، رقم: ۲۰۲

حضور ﷺ روز قیامت شفاعت فرماتے جائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ندا فرمائے گا اے محمد ﷺ کیا تو راضی ہوگیا اس پر حضور ﷺ جواب دیں گے۔

نعم رضیت. (۱)

’’ہاں میں راضی ہوگیا۔‘‘

امام خازنؒ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

قال ابن عباس هی الشفاعة فی اُمته حتی یرضیٰ. (۲)

’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے مراد آپ ﷺ کا اُمت کے حق میں شفاعت کرنا ہے یہاں تک کہ حضور ﷺ راضی ہو جائیں گے۔‘‘

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

إذا و الله لا أرضی وواحد من أمّتي في النّار. (۳)

’’خدا کی قسم اس وقت تک میں راضی نہ ہوں گا جب تک میرا ایک اُمتی بھی آگ میں ہو۔‘‘

اس سے بڑھ کر شفاعت کا تصور کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ یہی شفاعت کبریٰ ہے کیونکہ اس شفاعت کی انتہاء کی واحد صورت اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی رضا رکھی ہے۔ قرآن حکیم میں اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات ہیں جن سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ محبوبیت و مقربیت کے اس بلند مقام پر فائز ہیں کہ حضور ﷺ کے دل میں جو بھی خواہش پیدا ہوگی اللہ تعالیٰ فوراً اس کو پورا فرما دے گا۔

---

(۱) هندي، كنز العمال، ۱۴: ۶۳۷، رقم: ۳۹۷۵۸

(۲) خازن، لباب التأويل في معاني التنزيل، ۴: ۳۸۶

(۳) قرطبی، الجامع لأحكام القرآن، ۲۰: ۹۴

گزشتہ صفحات میں ہم نے متعدد آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے شفاعت فی الاخرۃ کے حق ہونے کے حوالے سے قوی دلائل پیش کئے بالخصوص حضور شفیع المذنبین شافع یوم النشور ﷺ کے مقام شفاعت عظمیٰ کے بارے میں ہم صحیح روایات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، اب اس کے بعد کوئی راسخ العقیدہ مسلمان کسی طرح بھی انکار کی جرات نہیں کر سکتا۔ قیامت کے روز شفاعت کے نفع بخش ہونے کے لئے مندرجہ ذیل چار شرائط ضروری ہیں۔

۱۔ قدرة الشافع علی الشفاعة: ''شفاعت کرنیوالا شفاعت پر قدرت واختیار رکھتا ہو۔

۲۔ الاذن للشافع: ''شفاعت کرنیوالے کے لئے اذن واجازت بھی ہو۔

۳۔ اسلام المشفوع له: ''جس کے لئے شفاعت کی جائے وہ مسلمان ہو۔

۴۔ الرضا عن المشفوع له ''جس کے لئے شفاعت کی جائے اس کے حق میں اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔

اب ہم ان چار شرائط کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

۱۔ قدرة الشافع علی الشفاعة

آخرت میں مقبولیت شفاعت اور اس کی نفع بخشی کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا شفاعت پر قدرت رکھتا ہو یعنی اگر کسی کو شفاعت کرنے کا اختیار ہی نہیں تو صاف ظاہر ہے وہ شفاعت نہیں کر سکے گا۔

اس بات کی تصریح خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

۱۔ لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا۝ (۱)

(۱) مریم، ۱۹:۸۷

”(اس دن) لوگ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے (خدائے) رحمان سے وعدۂ (شفاعت) لے لیا ہےo“

اس آیت کریمہ میں دو چیزوں کی بڑی واضح نشاندہی کر دی گئی ہے۔

(الف) کفار و مشرکین کے شفاعت کے مالک ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

(ب) وہی شفاعت کریں گے۔ جن کو اللہ تعالیٰ سے وعدہ شفاعت مل چکا ہو

۲۔ وَلاَ يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَo(۱)

”اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا (اپنا رب سمجھ کر) پکارتے ہیں وہ تو سفارش کا (بھی) اختیار نہیں رکھتے ہاں جو حق کی گواہی دیں اور اس کا علم بھی رکھیں (یعنی جو کلمہ شہادت کی حقانیت کا قولاً اقرار کرتے ہوں عملاً بھی اس کی تصدیق کرتے ہوں ان کو سفارش (شفاعت) کی اجازت دی جائیگی)o“

اس آیہ کریمہ میں معبودان باطلہ سے امید شفاعت کی نفی کردی گئی ہے کفار ومشرکین اپنے جن معبودان باطلہ کے بارے میں شفیع ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ قیامت کے روز ہماری شفاعت کریں گے ان سے اللہ تعالیٰ نے شفاعت کی بایں طور نفی فرمائی کہ وہ تو شفاعت کا اختیار ہی نہیں رکھتے اس لئے ان سے امید شفاعت بے جا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں آیات میں پہلے اختیار شفاعت کی نفی اور اثبات دونوں ہیں الا سے پہلے نفی اور اس کے بعد اختیار شفاعت کا اثبات ہے۔

۳۔ ایک اور مقام پر معبود باطلہ سے اختیار شفاعت کی مکمل نفی کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) الزخرف، ۸۶:۴۳

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُفَعَآئَط قُلۡ اَوَلَوۡ كَانُوۡا لَا يَمۡلِكُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّلَا يَعۡقِلُوۡنَ○[1]

’’کیا انہوں نے اللہ کے سوا اور سفارشی بنا لئے ہیں آپ فرما دیجئے اگرچہ یہ سفارشی نہ قدرت ہی رکھتے ہوں اور نہ ہی کچھ سمجھتے ہی ہوں (کیا پھر بھی یہ مجبورِ محض معبود‘ اللہ کے سامنے ان کی سفارش کرسکیں گے؟○‘‘

مذکورہ بالا آیہء کریمہ میں اس امر کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور متنفس کو اختیار شفاعت حاصل نہیں اور جب وہ یہ اختیار ہی نہیں رکھتے تو پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرنا چہ معنی دارد‘ قرآن یہ تصور دل میں جاگزیں کرنا چاہتا ہے کہ شفاعت وہی معتبر اور مقبول ہوگی جس کا اختیار شفیع (شفاعت کرنے والے) کو بارگہ ایزدی سے بخشا گیا ہو لہذا کفار و مشرکین کے معبودان باطلہ خواہ وہ بت ہوں یا انساں شفیع نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اللہ رب العزت کی طرف سے انہیں شفاعت کا کوئی اختیار حاصل نہیں اور یہ اختیار صرف اللہ کے مقرب اور برگزیدہ بندوں کو ازرانی کیا جاتا ہے۔

۲۔ اسلام المشفوع له

شفاعت کی قبولیت کی ایک شرط یہ ہے کہ جس کے حق میں شفاعت کی جارہی ہے وہ مسلمان ہو۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی شفاعت کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد یہی ہے کہ کفار و مشرکین کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ کسی ایک جگہ بھی اہل ایمان کے لئے شفاعت کی نفی نہیں ہوئی۔ اس کی تائید میں ہم قرآن حکیم کی ان آیات کو لا رہے ہیں جن میں شفاعت کی نفی تو ہے مگر وہ صرف کفار و مشرکین کے لئے ہے۔

---

(۱) الزمر، ۳۹:۴۳

نفی شفاعت پر قرآنی آیات اور ان کا حقیقی مفہوم

ا۔ کفار سے شفاعت کا نامقبول ہونا

ا۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ (۱)

''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کی طرف سے کچھ بدلہ نہ دے سکے گی اور نہ اس کی طرف سے (کسی ایسے شخص کی) کوئی سفارش قبول کی جائے گی (جسے اذن الٰہی حاصل نہ ہوگا) اور نہ اس کی طرف سے (جان چھڑانے کے لئے) کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ (امر الٰہی کے خلاف) اس کی امداد کی جاسکے گی۔''

۲۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ (۲)

''اور اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی دوسری جان کی جگہ کوئی بدلہ نہ دے سکے گی اور نہ اس کی طرف سے (اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے) کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اس کو (اذن الٰہی کے بغیر) کوئی سفارش ہی فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ (امر الٰہی کے خلاف) انہیں کوئی مدد دی جاسکے گی۔''

یہ بات غور طلب ہے کہ مذکورہ بالا آیات اور اس طرح کی دیگر تمام آیات جن میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے کی تطبیق قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ سے جن میں شفاعت کا اثبات ہے کس طرح ممکن ہے؟ ہمارے لئے قرآن مجید کی ہر ایک آیت کا ماننا تقاضائے

(۱) البقرۃ، ۲: ۴۸

(۲) البقرۃ، ۲: ۱۲۳

ایمان ہے اور کسی بھی آیت کا انکار کفر ہے۔ آیئے بنظر غائر دیکھیں کہ اس اشکال کا حل کیا ہے؟

قانون تعارض اور بعض مفسرین کی تصریحات

قرآن فہمی کے لئے اس قانون کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔ اس میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جب ایک جیسی آیات بعض امور کے اثبات پر دلالت کرتی ہیں اور کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی وہ نفی کر رہی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نفی و اثبات محض ایک جہت سے ممکن نہیں ورنہ بعض آیات کا انکار لازم آتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ ہم آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے پہلے اس بات کا تعین کریں کہ نفی کس بات کی ہو رہی ہے اور اثبات کس حوالے سے ہے۔

☆ مذکورہ بالا آیات میں اثباتِ شفاعت ان صالح و مقرب مومنین کے لئے ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اذن بھی دے رکھا ہو۔ اور وہ مشفوع لہ سے راضی بھی ہوں۔

☆ اس سے برعکس صورت حال میں جن آیات میں شفاعت کی نفی ہے وہاں نفی کا اطلاق یا تو کفار و مشرکین پر ہوتا ہے یا جہاں مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا قاعدے اور قانون کے حوالے سے بعض مفسرین کی تصریحات بھی اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ یہاں کافروں سے شفاعت کی نفی مراد ہے۔ ثبوت کے طور پر ذیل میں چند مفسرین کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لا تغني نفس كافرة عن نفس كافرة من عذاب الله شيئا. (۱)

(۱) عبد الله بن عباس، تنوير المقباس من تفسير ابن عباس: ۸

www.MinhajBooks.com

’’کوئی کافر نفس کسی دوسرے کافر نفس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکے گا۔‘‘

حضرت ابن عباسؓ نے ’’لا تجزی نفس عن نفس‘‘ سے مراد ہر نفس نہیں لیا بلکہ اس سے مراد نفس کافر لیا ہے اور اس کے بعد ’’ولا یقبل منھا شفاعۃ‘‘ میں بھی ’’ھا‘‘ ضمیر کا مرجع نفس ہونے کی وجہ سے نفس کافر ہی مراد لیا ہے۔

۲۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں جملہ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ:

النفس الکافرۃ لا کل نفس. (۱)

’’لا تجزی نفس عن نفس سے مراد نفس کافر ہے نہ کہ ہر نفس۔‘‘

یعنی ان کے نزدیک بھی لا تقبل منہا شفاعۃ میں ھا ضمیر سے مراد نفس کافر ہی ہے۔

۳۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

ولا یقبل منھا شفاعۃ یعنی من الکافرین. (۲)

’’اور ان سے شفاعت قبول نہیں کی جائے گی اس سے مراد یہ ہے کہ کافروں سے شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔‘‘

۴۔ امام خازنؒ فرماتے ہیں:

و المعنی لا تقبل الشفاعۃ اذا کانت النفس کافرۃ. (۳)

’’اور اس کا معنی یہ ہے کہ جب نفس کافر ہو تو اس کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔‘‘

---

(۱) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱: ۳۷۹

(۲) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱: ۸۹

(۳) خازن، لباب التأویل في معاني التنزیل، ۱: ۴۸

۵۔امام نسفیؒ فرماتے ہیں:

لا تقبل منها شفاعة للكافرة.(۱)

”اس سے شفاعت قبول نہیں کی جائے گی سے مراد یہ ہے کہ نفس کافر سے شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔“

ان اجل مفسرین کرام کی ان منقولہ عبارات کی روشنی میں یہ بات طے ہوگئی کہ مذکورہ آیات قرآنیہ میں کفار سے شفاعت کی نفی مراد ہے نہ کہ مومنین سے۔

۲۔ کفار سے روزِ قیامت دوستی اور شفاعت کی نفی

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ‌ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ○(۲)

”اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور (کافروں کیلئے) نہ کوئی دوستی (کارآمد) ہوگی اور نہ (کوئی) سفارش، اور یہ کفار ہی ظالم ہیں○“

مذکورہ آیت کریمہ میں درج ذیل تین چیزوں کی نفی کی گئی ہے۔

۱۔ خرید وفروخت (لا بيع)

۲۔ دوستی (لا خلة)

۳۔ شفاعت (لا شفاعة)

---

(۱) نسفی، مدارك التزيل وحقائق التأويل، ۱: ۴۷

(۲) البقرة، ۲: ۲۵۴

www.MinhajBooks.com

اب ہم ان تینوں چیزوں پر الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

۱۔ بیع کی نفی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”یَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ“ اس دن کوئی خرید و فروخت نہ ہوگی قرآن حکیم نے کسی دوسرے مقام پر بیع کا اثبات نہیں فرمایا لہٰذا اس آیۃ کریمہ میں مطلق بیع کی نفی مذکور ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا تعلق مومنین سے ہو یا کافرین سے۔ کوئی شخص بھی روز قیامت بیع نہیں کر سکے گا۔

۲۔ دوستی کی نفی

دوسری چیز یہ بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز کوئی دوستی کام نہ آئے گی، لیکن قرآن حکیم میں دوسرے مقام پر خود اللہ تعالیٰ نے اس حکم سے مومنین و متقین کو مستثنیٰ فرمادیا۔

ارشاد ربانی ہے:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ○[1]

”قیامت کے روز گہرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے (کہ وہ ایک دوسرے کی دوستی کا پاس رکھیں گے)“

لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ دوستی جس کی بنیاد تقویٰ پر ہو وہی کام آئے گی اس لئے متقین دنیا و آخرت دونوں جگہ کام آئیں گے۔ جس دوستی کی نفی ہے وہ کفار و مشرکین کی دوستی ہے۔

۳۔ شفاعت کی نفی

تیسری نفی اس مقام پر شفاعت کی ہے لیکن قرآن حکیم نے دیگر بہت سے

(۱) الزخرف، ۴۳:۶۷

مقامات پر اس کا اثبات فرمایا ہے مثلاً اس سے متصل اگلی آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ. (۱)

''کون ایسا شخص ہے جو اس کے حضور اس کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے۔''

اس لئے یہاں شفاعت کی نفی کافروں سے ہے اور اثبات شفاعت کا مومنین کے لئے ہے وہ جنہیں اذن ہو چکا ہے۔

اُسلوبِ آیت سے استدلال

اس آیت کے اسلوب سے بھی اس کے مفہوم کی جہت متعین ہوتی ہے آیت کے آغاز میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا کہہ کر خطاب فرمایا۔ تو یہ اس طرف اشارہ تھا کہ روز قیامت خرید و فروخت کی نفی کے حکم میں مومنین و کفار دونوں شامل ہیں اور پھر وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ کے بعد فرمایا وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور کافر ہی ظالم ہیں) اس میں اس امر کا اشارہ فرمایا کہ یہ دونوں حکم کافروں کے ساتھ خاص ہیں۔

مفسرینِ کرام کی آراء

اس موقع پر ہم چند مفسرین کرام کی آراء پیش کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت مبارکہ کی شرح میں فرماتے ہیں:

لا شفاعة للكفرين. (۲)

''**لا شفاعة** سے مراد یہ ہے کہ کافرین کے لئے شفاعت نہیں ہے۔''

۲۔ علامہ قرطبیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۵۵

(۲) عبد اللہ بن عباس، تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس: ۳٦

ولا شفاعة الا باذن الله. (۱)

”اور شفاعت نہیں مگر اللہ کے اذن سے۔“

۳۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

ولا شفاعة الا باذن الله. (۲)

”اللہ کے اذن کے بغیر شفاعت نہیں۔“

۴۔ علامہ اسماعیل حقیؒ رقمطراز ہیں:

فان الدلائل قائمة على ثبوت الشفاعة للمومنين بعد ان يوذن لهم فيها. (۳)

”مومنین کے لئے اذن شفاعت کے بعد ان کے شفاعت کے کرنے کے ثبوت میں بہت ساری دلیلیں موجود ہیں۔“

۳۔ کفار کے لیے کوئی ولی اور شفیع نہیں

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ج وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ط لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ○ (۴)

”اس کے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی سفارشی اور اگر وہ (جان

(۱) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۳:۲۶۶
(۲) قاضی، ثناء اللہ، تفسیر المظهری، ۱:۳۵۷
(۳) اسماعیل حقی، روح البیان، ۱:۳۹۶
(۴) الأنعام، ۶:۷۰

اپنے گناہوں کا) پورا پورا بدلہ (یعنی معاوضہ) بھی دے تو (بھی) اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے کئے کے بدلے ہلاکت میں ڈال دیئے گئے ان کے لئے کھولتے ہوئے پانی کا پینا ہے اور دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے o"

آیت مذکورہ میں دوٹوک انداز میں بیان فرمادیا گیا ہے کہ کافروں کیلئے کوئی شفاعت کرنے والا اور مددگار نہ ہوگا۔ خود ائمہ ومفسرین کی تصریحات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے روز جو لوگ بے یار و مددگار ہوں گے وہ اللہ کے نافرمان سرکش اور کافر ہیں۔ ذیل میں دو علمائے تفسیر کے اقوال درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

یعنی الیھود والنصاریٰ ومشرکی العرب. (۱)

"اس سے یہود نصاریٰ اور مشرکین عرب مراد ہیں۔"

۲۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں۔

أی لا تعلق قلبک بھم فانھم اھل تعنت. (۲)

"یعنی آپ کا ان سے کوئی قلبی تعلق نہیں کیونکہ وہ نافرمانی (وسرکشی) کرنیوالے ہیں۔"

۴۔ مشرکین کی شفاعت کرنے والے ماذون نہیں

www.MinhajBooks.com

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا نَرٰی مَعَکُمْ شُفَعَآءَ کُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّھُمْ فِیْکُمْ شُرَکٰٓؤُا ط لَقَدْ

(۱) عبد اللہ بن عباس، تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس:۱۱۲

(۲) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۷:۱۵

تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُوْنَ○[۱]

''اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم (یہ) گمان کرتے تھے کہ وہ تمہارے (معاملات) میں شریک ہیں بیشک (آج) تمہارا باہمی تعلق (واعتماد) منقطع ہوگیا اور وہ (سب) دعوے جو تم کیا کرتے تھے تم سے جاتے رہے○''

اس آیت کریمہ میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ مشرکین جن کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں، ان کو شفاعت کرنیوالا بھی خیال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا تمہارے ساتھ تمہارے شریک نظر نہیں آئے۔ تمہارے اور ان کے درمیان رابطہ ختم ہو چکا ہے اور جو تم گمان کرتے تھے وہ جاتا رہا۔ لہٰذا یہ نفی شفاعت مشرکین سے ہے نہ کہ مومنین سے۔

۱۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

أی الّذین عبدتموهم وجعلتموهم شركاء يريد الاصنام وكان المشركون يقولون الاصنام شركاء الله و شفعاؤنا عنده.[۲]

''(شفعاء كم) یعنی جن کی تم عبادت کرتے تھے اور انہیں شریک بناتے تھے اس سے بت مراد ہیں اور مشرکین کہتے تھے (یہ) بت اللہ کے شریک ہیں اور اسی کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں۔''

۲۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں:

شفعاء كم الاصنام فى استحقاق عبادتكم شركاء الله.[۳]

(۱) الانعام، ۶:۹۴

(۲) قرطبی، الجامع لأحكام القرآن، ۷:۴۲

(۳) سیوطی، محلی، تفسیر جلالین:۱۴۰

”(آیت میں شفعاء کم سے مراد) بت ہیں جن کے بارے میں تم یہ خیال کرتے تھے کہ وہ استحقاق عبادت میں اللہ کے شریک ہیں۔“

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

شفعاء کم الهتكم.[۱]

”(آیت میں شفعاء کم سے مراد) تمہارے معبودان باطلہ ہیں۔“

۵۔ اللہ کو بھلا دینے والے، شفاعت سے محروم ہوں گے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ط يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَ تْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّج فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ط قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ○[۲]

”وہ صرف اس (کہی ہوئی بات) کے انجام کے منتظر ہیں جس دن اس (بات) کا انجام سامنے آ جائے گا وہ لوگ جو اس سے قبل اسے بھلا چکے تھے کہیں گے بے شک ہمارے رب کے رسول حق (بات) لے کر آئے تھے سو کیا (آج) ہمارے کوئی سفارشی ہیں جو ہمارے لئے سفارش کر دیں یا ہم (پھر دنیا میں) لوٹا دیئے جائیں تا کہ ہم (اس مرتبہ) ان (اعمال) سے مختلف عمل کریں جو (پہلے) کرتے رہے تھے بے شک انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور وہ (بہتان و افتراء) ان سے جاتا رہا جو وہ گھڑا کرتے تھے○“

---

(۱) عبد اللہ بن عباس، تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس: ۱۱۵

(۲) الاعراف، ۷: ۵۳

www.MinhajBooks.com

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز اللہ کو بھلا ڈالنے والوں کو شفاعت کچھ کام نہ دے گی۔ اس لئے وہ دوبارہ دنیا میں جا کر نیک اعمال کرنے کی خواہش کا اظہار کریں گے یہ بات کافر ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ مومن کی طرف سے اللہ کو بھلا دینے کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس آیت کریمہ کے تحت ائمہ ومفسرین کی تصریحات بھی اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ جو لوگ شفاعت سے محروم ہوں گے وہ کفار ومشرکین ہی ہیں۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

فنعملُ فنومن و نعمل غیر الذی کنا نعمل فی الشرک. (۱)

''تاکہ ہم عمل کریں کا مطلب ہے کہ ہم ایمان لائیں اور عمل کریں اس کے علاوہ' جو حالت شرک میں ہم عمل کرتے رہے تھے۔''

۲۔ علامہ قرطبیؒ کے مطابق کہ یہ قول کرنے والے دراصل مشرکین ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

أی بطل ما کانوا یقولون من ان مع اللہ الھا آخر. (۲)

''یعنی باطل ہوا جو وہ کہتے تھے کہ اللہ کے ساتھ دوسرا خدا (بھی) ہے۔''

۳۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں:

أی ترکوا الایمان له. (۳)

''یعنی (یہ ان لوگوں کا قول ہے) جو اس پر ایمان نہ لائے تھے''

---

(۱) عبد اللہ بن عباس، تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس: ۱۲۹

(۲) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۷: ۲۱۸

(۳) سیوطی، محلی، تفسیر جلالین: ۱۵۸

مندرجہ بالا اقوال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ قول مشرکین و کفار کے لئے ہے اور اسے مسلمانوں کے حق میں ثابت کرنا منشاء قرآنی کے خلاف ہے۔

۶۔ کفار کی دنیا کو پلٹ جانے کی حسرت

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ روز قیامت کفار حسرت بھرے لہجے میں کہیں گے:

فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَo وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍo فَلَوۡ اَنَّ لَنا کَرَّةً فَنکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَo(۱)

''سو (آج) نہ کوئی ہماری سفارش کرنے والا ہےo اور نہ کوئی گرم جوش دوستo سو کاش ہمیں ایک بار (دنیا میں) پلٹنا (نصیب) ہوجاتا تو ہم مومن ہوجاتےo''

اس آیت طیبہ میں کفار کے حسرت بھرے جذبات کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ قیامت کے روز عذاب دیکھ کر کہیں گے: کاش ہمیں دنیا میں واپس جانے کا موقع مل جاتا تو ہم بھی مومن بن کر زندگی گزارتے اور پھر یوں حسرت بھرے انداز میں نہ رہتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار و مشرکین اپنے کفر کی وجہ سے شفاعت سے محرومی کا اعتراف کر رہے ہوں گے۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ جلال الدین محلیؒ لکھتے ہیں:

فما لنا من شافعين كما للمومنين من الملئكة والنبين والمومنين.(۲)

(۱) الشعراء، ۲۶: ۱۰۰۔ ۱۰۲

(۲) محلی، تفسیر جلالین: ۳۷۲

”تو آج ہمارا کوئی سفارشی نہیں جس طرح مومنین کے لئے ملائکہ، انبیاء اور مومنین (سفارشی) ہیں۔“

تفسیر جلالین وہ مستند تفسیر ہے جس کی تدریس آج بھی دینی مدارس ہیں بطور نصاب شامل ہے لوگ تو شفاعت انبیاء پر کج فہمی اور کور چشمی کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں جبکہ صاحبِ تفسیر ملائکہ، انبیاء بلکہ مومنین کی شفاعت کو بھی آیت کریمہ سے ثابت کر رہے ہیں۔

۷۔ مشرکین کی روز قیامت عدم شفعاء کی وجہ سے سخت نا امیدی

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ وَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَ كَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِیْنَ○ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ○ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ○(۱)

”اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو مُجرِم لوگ مایوس ہو جائیں گے○ اور ان کے (خود ساختہ) شریکوں میں سے ان کے لئے سفارشی نہیں ہوں گے اور وہ (بالآخر) اپنے شریکوں کے (ہی) مُنکِر ہو جائیں گے○ اور جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن لوگ (نفسا نفسی میں) الگ الگ ہو جائیں گے○ پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے تو وہ باغاتِ جنت میں خوشحال و مسرور کر دیئے جائیں گے○“

اس آیت میں یہ چیز بیان کی گئی ہے کہ مجرمین قیامت کے روز سخت نا امید ہونگے۔ المجرمین سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔

(۱) الروم، ۳۰: ۱۲۔ ۱۵

اس امر پر درج ذیل چیزیں دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ آیت میں سیاق کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں مشرکین و کفار مراد ہیں کیونکہ احوال آخرت بتا کر ساتھ ہی "فاما الذین آمنوا" کہہ کر ایمان والوں کے احوال بیان فرمائے ہیں یہ ایک واضح اشارہ ہے کیونکہ اس سے پہلے اہل ایمان کے مدمقابل ان لوگوں کے احوال بیان کئے گئے ہیں جو کفار و مشرکین ہیں۔

۲۔ "یبلس" سخت نا امیدی پر دلالت کرتا ہے اور یہ چیز بذات خود اس چیز کے تعین کے لئے کافی ہے کہ وہ کفار و مشرکین ہونگے کیونکہ مومنین پر نا امیدی کی حالت روز قیامت طاری نہیں ہوگی۔

۳۔ مفسرین نے بھی یہاں یہی معنی مراد لیا ہے۔ امام جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں:

(یبلس المجرمون) یسکت المشرکون لانقطاع حجتهم.(۱)

"یبلس المجرمون سے مراد یہ ہے کہ مشرکین اپنی حجت کے ختم ہونے کے باعث خاموش ہوجائیں گے۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

ییاس المشرکون من کل خیر (ولم یکن لهم) لعبدة الاوثان (من شرکائهم من) الهتهم شفعاء.(۲)

"مشرکین ہر خیر سے مایوس ہوں گے اور بتوں کی عبادت کرنے والوں کے لئے ان کے خداؤں میں سے سفارشی نہ ہوں گے۔"

www.MinhajBooks.com

(۱) محلی، تفسیر جلالین: ۴۰۶

(۲) تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس: ۳۳۹

۸۔ صداقت قرآن کے منکرین کی شفاعت سے محرومی

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَالَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيۡعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ○ (۱)

''تمہارے لئے اسے چھوڑ کر نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی سفارشی، سو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے؟''

اس آیت کریمہ سے ماقبل آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہوا جنھوں نے قرآن کی صداقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور افترا پردازی کرتے ہوئے کہا کہ یہ حضور ﷺ نے خود اپنی طرف سے گھڑا ہے اور یوں حضور ﷺ پر بہتان عظیم باندھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان، زمین اور خلائی کائنات کی تخلیق کے مرحلے کی طرف توجہ دلائی اور ان کو خطاب کر کے فرمایا تمہارا کوئی ولی ہے نہ شفیع' پھر ان کو جھنجھوڑ کر فرمایا۔ کیا تم یہ کائنات دیکھ کر بھی نصیحت نہیں پکڑتے۔

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

أفلا تتذكرون تتعظون بالقرآن فتومنون. (۲)

''افلا تتذکرون سے مراد یہ ہے کہ کیا تم قرآن (کا اللہ کی کتاب ہونے کے باوجود اس) سے نصیحت نہیں پکڑتے۔''

۲۔ امام جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں:

(افلا تتذکرون) هذا فتومنوا. (۳)

''کیا تم اس سے نصیحت نہیں پکڑتے کہ ایمان لے آؤ۔''

---

(۱) السجدة، ۳۲:۴

(۲) تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس:۳۴۸

(۳) محلی، جلالین:۴۱۶

۹۔ معبودان باطلہ سے نفیٔ شفاعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ءَ اَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّىۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يُنۡقِذُوۡنِ ۝[1]

''کیا میں اس (اللہ) کو چھوڑ کر ایسے معبود بنالوں کہ اگر خدائے رحمان مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ مجھے اُن کی سفارش کچھ نفع پہنچاسکے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکیں۝''

مذکورہ آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ معبودان باطلہ کی پوجا کرنے والوں کو ان معبودوں کی شفاعت کچھ فائدہ نہ دے گی اور یہ بھی اظہر من الشّمس ہے کہ معبودان باطلہ کی پوجا کافر بناتی ہے لہٰذا یہ امر ثابت ہوگیا کہ یہاں شفاعت کے نفع بخش ہونے کی نفی کفار کے لئے ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام کی آراء مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ء أتخذ أ أعبد (من دونه) من دون الله بامركم (الهة) أصناماً.[2]

''ء أتخذ من دونه کا معنی ہے کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں۔ من دونہ کا معنی اللہ کے سواء (اور) الہۃ بتوں کے معنی میں مستعمل ہے۔''

۲۔ علامہ جلال الدین محلیؒ رقمطراز ہیں:

(الهة) اصناماً.[3]

(۱) یٰسں، ۳۶: ۲۳

(۲) تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس: ۳۷۰

(۳) محلی، تفسیر جلالین: ۴۴۳

www.MinhajBooks.com

’’الھۃ سے مراد بت ہیں۔‘‘

۳۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

(الھۃ) یعنی اصناماً.[۱]

’’الھۃ یعنی بت۔‘‘

۱۰۔ ظالمین (کفار) کا کوئی شفیع نہ ہوگا

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ○[۲]

’’ظالموں کے لئے نہ کوئی مہربان دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات مانی جائے○‘‘

۱۔ یہاں ظالمین سے مراد کفار ہیں جیسا کہ امام ابو البرکات نسفیؒ فرماتے ہیں:

ما لظالمین: الکافرین من حمیم ولا شفیع.[۳]

’’ظالموں کے لئے یعنی کافروں کے لئے کوئی ولی دوست اور نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا۔‘‘

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ما للظالمین المشرکین.[۴]

(۱) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱۸:۱۵

(۲) المومن، ۱۸:۴۰

(۳) نسفی، مدارک التنزیل، ۶۹:۴

(۴) تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس: ۳۹۴

www.MinhajBooks.com

’’ظالمین سے مراد مشرکین ہیں۔‘‘

۳۔ قرآن حکیم کے دوسرے مقامات پر چونکہ شفاعت کا اثبات بھی ہے اس لئے یہاں نفئ شفاعت کفار کے لئے متحقق ہے۔ کیونکہ یہاں ظالمین سے مراد گناہگار مؤمن نہیں ہیں اس لئے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ اس معنی کے خلاف صراحۃً دلالت کرتی ہیں:

۱۔ **عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي.** (۱)

’’حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میری شفاعت میری اُمت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے ہے۔‘‘

۲۔ **عَنْ أَبِي مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: خُيِّرْتُ بَيْنَ الشَّفَاعَةِ وَ بَيْنَ أَنْ يَدْخُلَ نِصْفُ أُمَّتِى الْجَنَّةَ؟ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ لِأَنَّهَا أَعَمُّ وَ أَكْفَى. أَتَرَوْنَهَا لِلْمُتَّقِيْنَ؟ لَا، وَلٰكِنَّهَا لِلْمُذْنِبِيْنَ الْخَطَّائِيْنَ الْمُتَلَوِّثِيْنَ.** (۲)

’’حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے حق شفاعت اور میری نصف اُمت کے جنت میں داخل کئے جانے

---

(۱) ترمذي، السنن، كتاب صفة القيامة، باب فى الشفاعة، ۴: ۶۲۵، رقم: ۲۴۳۶
۲۔ حاكم، المستدرك، ۱: ۱۴۰، رقم: ۲۳۲
۳۔ طيالسى، المسند، ۱: ۲۳۳، رقم: ۱۶۶۹
۴۔ ابن عبد البر، التمهيد، ۱۹: ۶۹

(۲) ابن ماجه، السنن، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، ۲: ۱۴۴۱، رقم: ۴۳۱۱

www.MinhajBooks.com

میں اختیار دیا گیا۔ پس میں نے شفاعت کو اختیار کر لیا کیونکہ یہ زیادہ عام ہے اور کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ متقین کے لئے ہے؟ نہیں وہ تو گناہگاروں، خطاکاروں اور معصیت میں آلودہ لوگوں کے لئے ہے۔‘‘

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اصلاً شفاعت تو ہے ہی گناہگاروں کیلئے اور صلحاء کے لئے شفاعت کا مطلب محض بلندیٔ درجات ہے کیونکہ انہیں جنت میں داخل کرنے کا خود رب العالمین وعدہ فرما چکا ہے۔

۱۱۔ منکرینِ روزِ جزاء سے نفیٔ شفاعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یَتَسَآءَلُوْنَ○ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ○ مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ○ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ○ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ○ وَکُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ○ وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ○ حَتّٰٓی اَتٰنَا الْیَقِیْنُ○ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِیْنَ○[1]

’’وہ مجرمین سے پوچھیں گے○ تمہیں کیا چیز دوزخ میں لائی○ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے○ اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے○ اور ہم بے ہودہ باتیں کرنے والوں کے ساتھ مل کر بے ہودہ باتیں کیا کرتے تھے○ اور ہم جزاء و سزا کے دن کو جھٹلاتے تھے○ یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا۔ پس انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی○‘‘

ان آیات میں ایک تو کفار و مشرکین سے نفیٔ شفاعت کا بیان ہو رہا ہے اور دوسرا مومنین کے لئے شفاعت کا اثبات ہے۔

(۱) المدثر، ۷۴:۴۰۔ ۴۸

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں:

(فما تنفعهم) يقول الله لا تنالهم (شفاعة الشافعين) يعنى شفاعة الملائكة و الانبياء و الصالحين. [۱]

’’اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ مجرمین ملائکہ‘ انبیاء اور صالحین کی شفاعت نہیں پائیں گے۔‘‘

اس آیت کریمہ میں ایک تو مجرمین کے لئے شفاعت کی نفی ثابت ہورہی ہے جبکہ دوسری طرف اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملائکہ‘ انبیاء اور صالحین شفیع ہونگے مگر ان کی شفاعت مجرمین یعنی کفار کے لئے نہیں بلکہ مومنین کے لئے ہوگی۔

۲۔ علامہ جلال الدین محلیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

ويقولون لهم بعد اخراج الموحدين من النار. [۲]

’’اور موحدین کے جہنم سے نکالے جانے کے بعد ان سے کہا جائے گا۔‘‘

معلوم ہوا کہ یہ سارا کلام منکرین سے ہو رہا ہے۔ آگے مزید اسی آیت کے ذیل میں فرمایا:

﴿فما تنفعهم شفاعة الشافعين﴾ من الملائكة و الانبياء و الصالحين و المعنى لا شفاعة لهم. [۳]

’’انبیاء‘ ملائکہ اور صالحین کی شفاعت انہیں کوئی نفع نہ دے گی مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی شفاعت نہیں۔‘‘

www.MinhajBooks.com

---

(۱) تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس:۴۹۳

(۲) محلی، تفسیر جلالین:۵۸۰

(۳) محلی، تفسیر جلالین:۵۸۰

۳۔ علامہ قرطبیؒ نے اس آیت کے تحت انتہائی ایمان افروز تفسیر فرمائی ہے وہ فرماتے ہیں:

أی یسئلون (عن المجرمین) ای المشرکین.

''مجرمین یعنی مشرکین سے سوال کیا جائے گا۔''

پھر اسی سورہ کی اگلی آیات کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ھذا دلیل علی صحۃ الشفاعۃ للمذنبین و ذالک ان قوما من اھل التوحید عذبوا بذنوبھم ثم شفع فیھم فرحمھم اللہ بتوحیدھم والشفاعۃ فاخرجوا من النار ولیس للکفار شفیع یشفع فیھم. (۱)

''یہ (آیت) گناہگاروں کے لئے ثبوت شفاعت کی دلیل ہے۔ اس طرح کہ اہل توحید میں سے گناہگار موحدین کو ان کے گناہوں کے بدلے عذاب ہوگا پھر ان کی شفاعت کی جائے گی پس اللہ ان کی توحید اور شفاعت کی وجہ سے ان پر رحم فرمائے گا اور انہیں جہنم سے نکال دے گا جبکہ کفار کے لئے کوئی بھی شفیع شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔''

مذکورہ آیت کریمہ میں **فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین** سے پہلے کے الفاظ خود ان لوگوں کا تعین کر رہے ہیں جن کے لئے شفاعت نفع بخش نہ ہوگی یہ وہ لوگ ہیں جو روز قیامت کو جھٹلاتے ہیں ظاہر ہے روز قیامت کو مسلمان نہیں جھٹلا سکتے۔ اس پر مزید قرآن حکیم نے فرمایا کہ روز قیامت کا انکار ان کی زندگی کے آخری مرحلے تک جاری رہا اور ان کو اسی حالت میں موت آ گئی لہٰذا اس آیت سے مسلمانوں کے حق میں نفئ شفاعت گمان کرنا درست نہیں ہے۔

(۱) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱۹:۵۷

۳۔ الاذن للشافع

شفاعت کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے کو شفاعت کرنے کا اذن مل چکا ہو یعنی وہ ماذون ہو تبھی اس کی شفاعت بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوگی اس پر قرآن حکیم کی بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں چند ایک ملاحظہ کریں۔

۱۔ **مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ.** (۱)

’’کون ایسا شخص ہے جو اس کے حضور اس کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے۔‘‘

۲۔ **مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ مبَعْدِ اِذْنِهٖ.** (۲)

’’(اس کے حضور) اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔‘‘

۳۔ **یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ.** (۳)

’’اس دن سفارش سود مند نہ ہوگی سوائے اس شخص (کی سفارش) کے جسے (خدائے) رحمان نے اذن (و اجازت) دے دی ہے۔‘‘

۴۔ **وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ.** (۴)

’’اور اس کے پاس (کسی کی) سفارش کام نہیں آتی بجز اس کے کہ جس کو وہ خود (سفارش کے لئے) اجازت دے۔‘‘

۵۔ **لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْم بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰیO** (۵)

www.MinhajBooks.com

(۱) البقرۃ، ۲:۲۵۵

(۲) یونس، ۱۰:۳

(۳) طٰہٰ، ۲۰:۱۰۹

(۴) سبا، ۳۴:۲۳

(۵) النجم، ۵۳:۲۶

”ان کی شفاعت کسی چیز کا فائدہ نہ دے گی مگر اس کے بعد کہ اللہ جس کے لئے چاہے اذن دے اور جس سے راضی ہو۔“

مذکورہ بالا تمام آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اذن کے بعد ہی شفاعت فائدہ مند ہوگی۔ جن لوگوں کو اذن شفاعت نہیں ملا ان کی شفاعت کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گی صرف انہی لوگوں کی شفاعت نفع بخش ہوگی جن کو اذن شفاعت مل چکا ہے۔

شافعین ماذون ہیں

اس مقام پر ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ حق شفاعت تو اذن شفاعت سے مشروط ہے پھر ہم انہیں پہلے سے کیوں شافع اور ماذون للشفاعۃ خیال کرتے ہیں۔

حقیقت میں یہ ایک غلط فہمی ہے کہ انہیں اذن شفاعت نہیں ملا اور قیامت کے روز ملے گا بلکہ قیامت کو جو اذن ملے گا وہ تو اذن کلام ہوگا۔ اذن شفاعت تو اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو دنیا میں ہی عطا کر دیتا ہے اس بات پر کئی ایک چیزیں دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ مذکورہ بالا آیات میں سے چار آیات کے ساتھ لفظ ”اذن“ صیغہ ماضی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اذن شفاعت مل چکا ہے۔

۲۔ سورہ مریم میں ارشاد ربانی ہے:

لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَہۡدًا ۝(۱)

”(اس دن) لوگ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے (خدائے) رحمان سے وعدہ (شفاعت) لے لیا ہے۔“

اس آیت کریمہ میں بھی (اتخذ) صیغہ ماضی استعمال ہوا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ ان سے شفاعت کا وعدہ ہو چکا ہے۔

(۱) مریم، ۱۹:۸۷

۳۔ قرآن کا نزول آج سے چودہ سو سال قبل ہو چکا ہے اس میں شفاعت کرنے والوں اور اس سے محروم رہنے والوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ گویا نزول قرآن کے وقت سے بھی حضور نبی اکرم ﷺ کی زبان اقدس سے شافعین کو اذن شفاعت مل چکا ہے اب جس اذن کا ذکر قیامت کے روز کے حوالے سے آتا ہے اس سے مراد ماذون لوگوں کے کلام کا اذن ہوگا۔

۴۔ **وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ○**(۱)

”وہ لوگ جو اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں وہ شفاعت کے مالک نہیں ہونگے مگر وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ اسے جانتے ہیں○“

شہادت بالحق قیامت کے روز نہ ہوگی بلکہ وہ تو دنیا سے تعلق رکھتی ہے اس لئے سورۂ حدید کے مطابق منافقین کو حکم ہوگا ”ارجعوا وراء کم“ کہ دنیا میں واپس لوٹ جاؤ کیونکہ جو کچھ وہاں جا کر کروگے وہاں کی شہادت کام آئے گی۔

شہادت بالحق کی وضاحت

قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ شاہدین بالحق کو اذن شفاعت مل چکا ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہدین بالحق کون لوگ ہیں؟ شہادت بالحق کی تفصیل سورۂ آلِ عمران میں اس طرح ہوئی ہے:

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ○ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ

(۱) الزخرف، ۴۳:۸۶

الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِo شَهِدَ اللهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًام بِالْقِسْطِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُo(۱)

”(اے حبیب!) آپ فرما دیں: کیا میں تمہیں ان سب سے بہترین چیز کی خبر دوں؟ (ہاں) پرہیزگاروں کے لئے ان کے رب کے پاس (ایسی) جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے (ان کے لئے) پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور (سب سے بڑی بات یہ کہ) اللہ کی طرف سے خوشنودی نصیب ہوگی، اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہےo (یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم یقیناً ایمان لے آئے ہیں سو ہمارے گناہ معاف فرما دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لےo (یہ لوگ) صبر کرنے والے ہیں اور قول و عمل میں سچائی والے ہیں اور ادب و اطاعت میں جھکنے والے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں اور رات کے پچھلے پہر (اٹھ کر) اللہ سے معافی مانگنے والے ہیںo اللہ نے اس بات پر گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی (اور ساتھ یہ بھی) کہ وہ ہر تدبیر عدل کے ساتھ فرمانے والا ہے، اس کے سوا کوئی لائقِ پرستش نہیں وہی غالب حکمت والا ہےo

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ حق کی گواہی دینے والوں میں فرشتوں کے ساتھ اولوا العلم کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر اولوا العلم کی تفصیل بھی اس سے ماقبل آیات میں بیان کر دی۔ اللہ تعالیٰ ان طبقات کو اذن شفاعت عطا کر چکا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت میں ارشاد فرمایا تھا کہ حق کی شہادت دینے والوں کو اذن شفاعت مل چکا ہے اور شہادت حق چونکہ دنیا میں ہی ہوتی ہے اس لئے آخرت میں اس کو معتبر نہیں گردانا جائے گا۔ لہٰذا جس نے دنیا میں شہادت حق دی وہ شفاعت کا دنیا

(۱) آل عمران، ۳: ۱۵۔۱۸

میں ہی مالک قرار دیا جائے گا ہاں قیامت کے روز اس کے بعد ایک دوسرا اذن ہوگا جس کے بعد شافعین اپنا اختیار اِستعمال کریں گے اور اللہ سے کلام کرسکیں گے۔ یہی اذن کلام ہے جبکہ اذن شفاعت تو پہلے ہی مل چکا ہے۔

اذن شفاعت کے دو درجات

اذن شفاعت کے دو درجے ہیں۔

۱۔ اذنِ شفاعت

۲۔ اذنِ کلام

اذنِ شفاعت

یہ اذن شفاعت تو اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کو دنیا میں ہی عطا فرما دیا ہے۔

اذنِ کلام

یہ دوسرا اذن ہے۔ قیامت کے دن جب ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہوگی اللہ تعالیٰ کے جلال اور ہیبت کے سامنے کسی آدمی کو بولنے کی مجال نہ ہوگی اس وقت فقط وہی بات کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ کلام کرنے کا اذن دے گا۔ اس کا ذکر قرآن حکیم میں یوں آتا ہے:

یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ط لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ○[1]

”جس دن جبرائیل (روح الامین) اور (تمام) فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں

---

(۱) النباء، ۷۸: ۳۸

گے، کوئی لب کشائی نہ کر سکے گا، سوائے اس شخص کے جسے خدائے رحمٰن نے اِذنِ (شفاعت) دے رکھا تھا اور اس نے (زندگی میں تعلیماتِ اسلام کے مطابق) بات بھی درست کہی تھیo‘‘

یہ اذنِ کلام، آدابِ شفاعت اور بارگاہِ اُلوہیت کے آداب میں سے ہے اس کا اذنِ شفاعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو اِس دنیا میں مل چکا اس لئے جن مقامات پر قیامت کے روز اذن دیئے جانے کی بات ہے وہ اذن کلام ہے نہ کہ اذن شفاعت اس کی مثال دنیا میں وکیل کی طرح ہے کہ وکیل پہلے بنایا جاتا ہے بعد میں جج کے سامنے جب اِسے اجازت مل جاتی ہے تو وہ بولتا ہے۔

۴۔ الرضا عن المشفوع لهٗ

شفاعت کی مقبولیت کی چوتھی شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا جس آدمی کے بارے میں شفاعت کرنا چاہتا ہے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ذات بھی راضی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کے بارے میں راضی ہی نہیں کہ اس کی شفاعت کی جائے تو یہ ظاہر و باہر ہے کہ اس سے متعلق شفاعت کا کیا جانا ناممکن ہوگا کیونکہ شفاعت کرنے والے کو شفاعت کا اختیار بھی اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اس چیز پر بھی قرآن حکیم کی متعدد آیات دلالت کرتی ہیں کہ شفاعت اسی کے حق میں مقبول ہوگی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ لا اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى.(۱)

’’اور وہ (اس کے حضور) سفارش بھی نہیں کرتے مگر اس کے لئے (کرتے ہیں) جس سے وہ خوش ہوگیا ہو۔‘‘

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ

(۱) الأنبياء، ۲۱: ۲۸

اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰی○[1]

''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں (کہ کفّار و مشرکین اُن کی عبادت کرتے اور ان سے شفاعت کی امید رکھتے ہیں) جن کی شفاعت کچھ کام نہیں آئے گی مگر اس کے بعد کہ اللہ جسے چاہتا ہے اور پسند فرماتا ہے اُس کے لئے اِذن (جاری) فرما دیتا ہے۔''

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ شفاعت کرنے والے کی شفاعت فقط اس شخص کے حق میں مقبول ہوگی جس کے لئے شفاعت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہو۔

تفصیلی مطالعہ کے لئے ہماری مطبوعہ کتاب ''عقیدۂ شفاعت'' کا مطالعہ کیا جائے۔

www.MinhajBooks.com

(۱) النجم، ۵۳: ۲۶

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ کا معنٰی

”جو کچھ مخلوقات کے سامنے (ہو رہا ہے یا ہو چکا) ہے اور جو کچھ اِن کے بعد (ہونے والا) ہے (وہ) سب جانتا ہے۔“

اِس جملے میں اللہ تعالیٰ کے علم کامل کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ قابل عبادت خدا وہی ہوسکتا ہے جو تمام ارضی و سماوی موجودات کا عالم ہو۔ گذشتہ، مستقبل اور حال کی صورت میں جو کچھ اِن پر گذر رہا ہے اِس سے آگاہ ہو۔ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ نے اِنسان کی رُشد و ہدایت کے لئے توحید در عبادت، اپنی صفتِ حیات، قیومیت اور مالکیت کے بارے میں وضاحت کے بعد بتایا کہ شفعاء میں کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کے اذن و اجازت کے بغیر شفاعت کی قدرت نہیں رکھتا۔

علمِ الٰہی اور اذنِ شفاعت میں ربط

سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم الٰہی اور اذن و اجازت شفاعت کے مابین کیا ربط و تعلق ہے؟ خالق و مالک اور علیم و خبیر نے آیت الکرسی میں کیوں مسئلہ شفاعت کے بعد اپنے علم کے بارے میں وضاحت فرمائی ہے؟ جس طرح آیت الکرسی میں شفاعت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے جامع اور کامل علم کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اِسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے شفاعت کے متعلق مشرکین کا عقیدہ بیان کرنے کے بعد استفہام انکاری کی صورت میں اپنے علم کامل کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُہُمۡ وَ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ قُلۡ اَتُنَبِّـُٔوۡنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعۡلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ○[1]

''اور (مشرکین) اللہ کے سوا ان (بتوں) کو پوجتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور (اپنی باطل پوجا کے جواز میں) کہتے ہیں کہ یہ (بت) اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں، فرما دیجئے: کیا تم اللہ کو اس (شفاعتِ اصنام کے من گھڑت) مفروضہ سے آگاہ کر رہے ہو جس (کے وجود) کو وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں (یعنی اس کی بارگاہ میں کسی بت کا سفارش کرنا اس کے علم میں نہیں ہے)۔ اس کی ذات پاک ہے اور وہ ان سب چیزوں سے بلند و بالا ہے جنہیں یہ (اس کا) شریک گردانتے ہیں○''

علمِ الٰہی کے ساتھ شفاعت کا ربط دو اعتبار سے ہے۔ ایک شفعآء کا انتخاب اور شفاعت کے لئے اِن کی صلاحیت، دوسرے مشفوع لھم کے لحاظ سے کہ وہ کون ہیں جو اِس لائق ہیں کہ فیضِ شفاعت سے وہ بہرہ یاب ہوسکیں۔

اولاً مشرکین اپنے مخلوق ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ جل جلالہ کو اِس جہانِ ہست و بود کا خالق مانتے تھے لیکن اپنے معبودان باطلہ بتوں کو ہلاکت و نیستی سے محفوظ رکھنے اور اپنی بت پرستی کی وجہ جواز پیدا کرنے کے لئے کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہ بت بارگاہِ الٰہی میں ہمارے شفیع و سفارشی ہیں۔ اصلاً وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ خالق کائنات کا حریم کبریائی ہمارے نزدیک مقدس و محترم ہے اور ہماری نگاہ میں کوئی چیز بھی اُس کے برابر کی نہیں ہے۔ یہ بت ہمارے اور خالقِ کائنات کے مابین واسطہ ہونے کا مقام و مرتبہ رکھتے ہیں اور اُس کے ہاں ہمارے شفیع بنتے ہیں۔ آیت الکرسی نے اِن کے اِسی عقیدہ

(۱) یونس، ۱۰: ۱۸

باطلہ وفاسدہ اور مشرکہ پر کاری ضرب لگائی اور ببانگِ دہل فرمایا کہ بارگاہِ الٰہی میں اُس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یعنی شفیع و سفارشی کا انتخاب تمہارے اختیار کی چیز نہیں اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ خودسری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خواہشِ نفس سے کسی کو اپنے اور خالق کے مابین واسطہ یعنی شفیع بنا ڈالے، کیونکہ شفاعت کا مکمل اختیار خود ذاتِ واجب الوجود کے دستِ قدرت میں ہے۔ اُسے اختیار ہے جسے شفیع کے طور منتخب فرمائے اور یہ قابل فخر منصب وہ جسے چاہے عطا کرے اور اُسے شفاعت کرنے کا اذن اور اجازت عطا فرمائے۔ لوگوں کو یہ حقیقت سمجھانے کے لئے بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اِس کمالِ خصوصیت کا متحقق اور ثابت ہونا بغیر دلیل کے نہیں۔ آیت الکرسی میں بطورِ دلیل بتایا جا رہا ہے کہ وہی شفاعت کی اجازت مرحمت فرماتا ہے۔ جو ارضی و سماوی تمام موجودات کی صلاحیتوں اور طاقتوں سے مکمل طور پر آگاہ و دانا ہے۔ جب کہ شفعآء یعنی شفاعت کرنے والے تو خود انہیں موجوداتِ عالم کا حصہ ہیں۔ وہ ذاتِ اقدس اِنہیں اذن شفاعت سے بہرہ یاب کرنے والی ہے جو ظاہر و باطن، عیاں و پنہاں، گذشتہ و آئندہ، آغاز و انجام، مشہود و غیر مشہود یعنی موجود و غیر موجود اور آگے پیچھے غرض شفاعت کرنے والوں اور شفاعت سے بہرہ یاب ہونے والوں کے پورے احوال و کوائف سے پوری طرح آگاہ و آشنا ہے۔

دوسری آیت میں استفہامِ انکاری کے اُسلوب و انداز میں اور ذرا سخت پیرائے میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ جو تم خودسرانہ انداز میں کچھ اشیاء کو اپنا شفیع بنالیتے ہو اور اِن کی پرستش کرنے لگتے ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ زمین و آسمان کی کوئی شے ذات واجب الوجود سے مخفی و پوشیدہ ہے! اب چاہتے ہو کہ اپنی اس غلط روش کے ذریعے اپنے خالق کو کچھ اطلاعات بہم پہنچاؤ؟ یعنی اگر تمہارے منتخب کردہ شفاعت کرنے والے شفعآء شفاعت کے لائق اور مستحق ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور شفاعت کے لئے منتخب کر لیتا۔

مجسم شفیع ہدایت و مغفرت

خود قرآنِ حکیم اور رسولِ رحمت ﷺ کی ذات گرامی شفاعت و مغفرت کا ایک نمونہ کامل اور شفاعت کے علم الٰہی سے ارتباط کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ ایک برگزیدہ شفیع اور اِنسانوں کی ہدایت اور مغفرت کے لئے ماذونِ الٰہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے لئے حضور نبی اکرم ﷺ کی صلاحیت کو جو دراصل شفاعتِ ہدایت و مغفرت ہے اُسے خود اپنے علم کامل کی طرف منسوب کیا اور ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ. (۱)

’’اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے اپنی رسالت کا محل کسے بنانا ہے۔‘‘

شفآء کا اپنے اس مرتبہ کے لائق ہونا یقینی ہے

شفعآء تکوینی ہوں یا تشریعی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقامِ شفاعت کے لئے تبھی منتخب کیئے جاتے ہیں، جب علم الٰہی میں اِن کا اِس مرتبے کے لائق اور صالح ہونا یقینی اور ثابت ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علم الٰہی سے مسئلہ شفاعت اور ارتباط اِس لحاظ سے ہو کہ شفعآء کی صلاحیت کی شناخت اور شفیع کا انتخاب اُسی کے تحت ہوتا ہے۔ یہ جہانِ ہست و بود اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلے کے تحت انتہائی دقیق اور باریک نظم و حساب کے مطابق خلق کیا گیا ہے اور اِس جہانِ ہستی میں کوئی بھی شے ناموزوں نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ اجازت و اذن شفاعت سے علم الٰہی کا ربط مشفوع لھم کی کیفیت کے اعتبار سے ہو، کیونکہ بعض گنہگار جو شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اِن کے بارے میں شفعآء کی شفاعت بالکل بے اثر ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہ مشرک کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ شفعآء صرف انہیں افراد کے حق میں

(۱) الانعام، ۶: ۱۲۴

شفاعت و سفارش کریں گے جن کا ایمان صحیح ہوگا اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جو مشرکین کے شرک اور انحراف کو جانتا ہے اور اِن کے آغاز و انجام سے پوری طرح آگاہ ہے۔ ''**یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم**'' کے جملے سے یہ بھی باور کرایا جا رہا ہے کہ وہاں غلطی سے کسی بے گناہ کو مجرم قرار دیئے جانے کا کوئی امکان نہیں۔

علمِ الٰہی پر اعتقاد رکھنا صالح اعمال کی اساس ہے

پھر یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر دیا گیا ہے کہ علمِ الٰہی پر اعتقاد رکھنا صحیح عبادات اور صالح اعمال کے اجراء کا ضامن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے۔ اِن صفات میں سے ایک صفت علم ہے۔ قرآنِ حکیم میں بار بار اِس کا ذکر آیا ہے۔ علم خداوندی کی بنیاد اُس کے معلوم کا وجود میں آنا نہیں، بلکہ علم تو اُس کی عین ذات ہے اور پہلے اِس کے کہ اِس جہان کو خلق فرمائے، وہ ہر اُس چیز سے عالم اور آگاہ تھا جو علم سے تعلق پذیر ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور اُس کا علم اُس کے لئے لازم ذات ہے۔ اُس کا علم تھا جب کہ ابھی معلوم خلق نہ ہوا تھا۔ سماعت بھی اُس کی عین ذات تھی جب کہ مسموع موجود نہ ہوا تھا۔ بصارت بھی اُس کی لازم ذات تھی جب کہ کوئی قابل رؤیت شئ پیدا نہ ہوئی تھی۔ قدرت بھی اُس کی عین ذات تھی جب کہ اس کی قدرت کا متعلق و موضوع نہیں بنا تھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اِس عالم کو خلق فرمایا تو معلوم تحقق پذیر ہوا اور اللہ تعالیٰ کا علم ازلی اِس معلوم نوموجود پر منطبق ہوا۔ اِس طرح سماعت مسموع پر، بصارت مبصور پر اور قدرت مقدور پر منطبق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تمام نیک و بد اعمال اور جائز و ناجائز حرکات سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے اور اِن کی نیتوں، ارادوں اور افکار کو بھی جانتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُo[1]

’’وہ خیانت کرنے والی نگاہوں کو جانتا ہے اور (ان باتوں کو بھی) جو سینے (اپنے اندر) چھپائے رکھتے ہیںo‘‘

جو بندۂ مومن یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اِنسان کے تمام اسرار اور رازوں پر آگاہ ہے تو وہ یقیناً اِس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اِس کے سارے اعمال پاک اور ہر قسم کی آلائشوں سے مبرّا ہونے چاہئیں اور اِن کو پنہاں اور عیاں شرک سے آلودہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہی حقیقت آیت الکرسی کے اس جملے میں ذہن نشین کرائی گئی ہے۔

(۱) المومن، ۴۰: ۱۹

www.MinhajBooks.com

وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ کا معنٰی

”اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے۔“

عقیدۂ توحید میں کسی مقام پر التباس اور خلط ملط نہیں ہے۔ مقامِ اُلوہیت بالکل الگ ہے اور مقامِ عبدیت جدا ہے۔ ان دونوں مقامات میں التباس و اشتباہ کا کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق اور اُس کی اپنے بندوں پر رحمت و شفقت کو اِسلام تسلیم کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ رحمتِ پروردگار ہر لحظہ اپنے بندوں پر نازل ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک کامل اور جامع تعبیر ہے کہ علمِ اِلٰہی تمام کائنات کی اشیاء پر محیط ہے۔ وہ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہو رہا ہے اس سے بھی واقف ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے اِسے بھی جانتا ہے۔ اور جو کچھ مستقبل میں ہوگا اس سے بھی آشنا ہے۔ مگر خود بندے کچھ نہیں جانتے سوائے ان باتوں کے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود چاہے کہ وہ واقف ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے جامع اور مکمل علم سے نفس انسانی میں خوف وخشیت الٰہی کی ایک کپکپی دوڑ جاتی ہے۔ انسان بارگاہِ الٰہی میں سراپا انکسار کھڑا ہوتا ہے، اس کے دل کی گہرائیوں میں آنے والے خیالات اور اس کے نفس کی پنہائیوں میں گزرنے والے تصورات سے اللہ تعالیٰ واقف ہے۔ وہ ہر اگلی پچھلی بات جانتا ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آشنا ہے۔ انسانوں کو صرف اسی قدر علم میسر آیا ہے جس قدر اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے ۔اس حقیقت پر تامّل اور تدبّر کی ضرورت ہے کیونکہ عصر حاضر کا انسان کائنات کے کچھ رازوں سے پردہ اُٹھا کر کلی

علم کے زعم میں مبتلا ہو چکا ہے۔ جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے۔ اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا علم ہی مطلق ،مکمل اور جامع علم ہے۔ وہ اپنے علم میں سے کچھ باتوں سے انسانوں کو روشناس کرتا ہے تاکہ اس کے اس وعدے کی تکمیل ہو جائے۔مگر انسان اس حقیقت کو فراموش کر کے فریب علم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اِس انعام پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے کے بجائے سرکشی پر اُتر آتے اور کفر کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو علم عطا کیا ہے وہ منصب خلافت کے لئے عطا کیا ہے اور اس لئے عطا کیا ہے۔تاکہ اس کے اس وعدے کی تکمیل ہو جائے کہ وہ انسان کو آفاق اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھلائے گا اور انسان کا اُمورِ خلافت کے بارے میں یہ علم روز بروز اور نسلاً بعد نسل بڑھتا رہے گا۔ یہاں تک کہ انسان اپنے اس مقررہ سفر کی منزل تک پہنچ جائے گا۔اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے کچھ اُمور کو انسان کی نظروں سے اوجھل رکھا ہے جو اُمورِ خلافت کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ انسان کو آج تک راز زندگی کا کوئی علم نہیں۔ آج تک زندگی ایک سربستہ راز ہے! انسان کو مستقبل کا تفصیلی علم نہیں دیا گیا اور حال و مستقبل کی درمیانی حدوں کے درمیان ایک دبیز پردہ لٹکایا گیا ہے کہ انسان اس پردے کے ماورا جھانکنے سے عاجز ہے۔غرض سینکڑوں راز ہیں جو منصب خلافت میں مفید اور کارآمد نہ ہونے کی بناء پر انسانی علم سے دور رکھے گئے ہیں۔مگر اس کے باوجود انسان کو جو تھوڑا سا علم خود اُس کی اجازت سے ملا ہے اِسی پر انسان از خود رفتہ ہوگیا۔کفر کیااور خالقِ کائنات کے وجود سے انکار کیا۔

اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام العلیم ہے اس کا مادہ ''ع ل م'' ہے بنیادی طور پر علم کا مطلب ہوتا ہے جاننا، واقف ہونا، آگاہ ہونا وغیرہ۔ علم بطور اسم مذکر دانائی، ہنر، جوہر، آگاہی، واقفیت، ادراک، خبر، معرفت ہوتا ہے۔ اللہ العلیم کا علم اس قدر زیادہ اور بے پایاں ہے کہ کوئی چیز، کوئی شے، کہیں بھی ہے وہ العلیم، کے علم سے باہر نہیں ہے۔ ہر شے کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت، ضرورت اور اس کے عمل، وظیفہ اور کام، سوچ اور سوچ کی

پرواز اور پرواز کی رسائی تک کا علم رکھتا ہے۔ کسی کی کوئی حرکت اور عمل اللہ العلیم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ خود سرچشمہ علم ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس علیم سے منہ موڑ کر کہیں اور جاتا ہے تو اس کے لیے جہالت کی تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ العلیم کے سوا کوئی اور علم کا منبع نہیں ہے۔ اس کے سوا کسی اور سے کوئی روشنی میسر نہیں آسکتی۔ ہر ایک کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی علم دیتا ہے۔

انسان اور دیگر مخلوقات کے علم میں فرق

اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوقات کو صرف محدود اور ایک شعبے یا چند شعبوں کا علم دے رکھا ہے۔ لہٰذا ان کے پاس دوسرے علوم کا ہرگز علم نہیں ہے۔ ان شعبوں کے بارے میں وہ ہرگز کچھ نہیں جانتے۔ لیکن ان کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسان کو جامع علم دے رکھا ہے۔ اسی لیے انسان کے علم کی جامعیت دوسری تمام مخلوقات سے اسے ممتاز اور ارفع بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود ہے۔ اس میں تنگ نظری اور تنگ دستی نہیں ہے۔ اسی اعتبار سے اس کی خدائی بھی بے انتہا وسیع ہے اور اس کا زاویہ نظر اور دائرہ فیض بھی وسیع ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ کہاں کس وقت کس نیت سے اس کو یاد کر رہا ہے۔ ہر حقیقت کا ذاتی اور مستقل علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کا علم کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم ہر ایک پر محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے علم سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ کائنات میں جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اللہ علیم اسے خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر بات ہر عمل اور ہر سوچ سے پوری طرح سے باخبر اور واقف ہے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر امر کا مکمل اور گہرا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام پوشیدہ حقیقتوں کو خوب خوب جاننے والا ہے۔ ہر شئے ہر مخلوق کی ضرورت، حرکت اس کے اعمال، اس کے ارادوں، اس کی خواہشات، اس کی نیت اور جو کچھ اس کے دل کے اندر

ہے سب سے اللہ تعالیٰ علیم خوب واقف بلکہ باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر علم رکھنے والے سے بالاتر ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو انسان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو نیک لوگوں اور متقیوں کے بارے میں بھی خوب علم ہے اور مشرکین اور کفار کے احوال وواقعات اور ارادوں کا بھی سارا علم اور خبر ہے۔

علیمٌ کے مختلف صفات کے ساتھ استعمال کی حکمت

اللہ العلیم کو تمام انسانی اعمال کا علم ہوتا ہے اور وہ تو نگاہوں کی خیانت اور دل کے ارادوں تک کا علم رکھتا ہے۔ ''علیم حکیم'' صفت کو متعدد مقامات پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنی ناقص انسانی عقل کے حوالے سے خدائی قوانین کو اس معیار اور سطح پر سمجھنے سے قاصر ہے، لیکن اللہ علیم حکیم سب سے خوب اور ہر مصلحت کے ساتھ جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر حوالے سے آگاہ، واقف، علم والا، دانا بینا اور نرم خوبھی ہے یعنی ''علیم حلیم''۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکمت والا ہے، اس کا علم حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی نہیں ہوتا ہے، ان حکمتوں اور مصلحتوں کو انسان ہرگز نہیں پا سکتا۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے اور حکمت والا دانا و بینا ہے۔

اللہ تعالیٰ اشیاء کو خلق کرنے سے پہلے ازل سے ان کا اس طرح علم تھا جس طرح ان کو خلق کرنے کے بعد ان کا علم ہے۔ قرآنِ حکیم میں علم الٰہی کے بارے میں کثیر آیات موجود ہیں اور ان سب میں یہ ذکر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ جہان ہستی کی تمام کلیات و جزئیات کا عالم ہے۔ بطور نمونہ چند ایک آیات ذکر کی جاتی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (۱)

''بھلا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ بڑا باریک بین (ہر چیز سے) خبردار ہے۝''

(۱) الملك، ۶۷: ۱۴

ارضی و سماوی موجودات بلکہ تمام موجودات عالم کے بارے میں اللہ تعالیٰ اپنے جامع علم رکھنے کے بارے میں کہ خواہ وہ جامد ہوں یا زندہ، فرشتے ہوں یا انسان، نباتات ہوں یا حیوان، عاقل ہوں یا غیر عاقل، قرآن حکیم میں ہے:

وَاللهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ (۱)

"حالانکہ اللہ اُن (تمام) چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے ○"

وَرَبُّکَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (۲)

"اور آپ کا رب ان کو خوب جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں (آباد) ہیں۔"

اس جہان کی باشعور اور بے شعور تمام موجودات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم رکھنے اور ان سب کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے بمنزلہ لشکر اور قوت مجریہ ہونے سے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:

وَ مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ. (۳)

"اور آپ کے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

اس کرۂ زمین اور اس کے دائرے میں موجود ہر شی اور اس میں ہونے والے تمام حوادث و واقعات پر اللہ تعالیٰ کے آگاہ ہونے کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے:

---

(۱) الحجرات، ۴۹: ۱۶

(۲) بنی اسرائیل، ۱۷: ۵۵

(۳) المدثر، ۷۴: ۳۱

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○[۱]

”اور غیب کی کنجیاں (یعنی وہ راستے جس سے غیب کسی پر آشکار کیا جاتا ہے) اسی کے پاس (اس کی قدرت و ملکیت میں) ہیں انہیں اس کے سوا (از خود) کوئی نہیں جانتا، اور وہ ہر اس چیز کو (بلاواسطہ) جانتا ہے جو خشکی میں اور دریاؤں میں ہے، اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر (یہ کہ) وہ اسے جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی (ایسا) دانہ ہے اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا ہے)۔“

دوسرے مقام پر اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا:

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا.[۲]

”وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمانی کرّوں سے اترتا (یا نکلتا) ہے یا جو کچھ ان میں چڑھتا (یا داخل ہوتا) ہے۔“

علمی ترقی اور علمِ الٰہی

اس کرۂ زمین کو جس ہوا نے گھیر رکھا ہے، اس کا قطر ۸۰۰ کلو میٹر ہے اور وہ زمین کی حرکت کے ساتھ ایک لاکھ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ یہ ہوا

---

(۱) الأنعام، ۶: ۵۹

(۲) الحدید، ۵۷: ۴

www.MinhajBooks.com

ان اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب ہے جو کئی ایک جہات سے اس کرۂ زمین کے زندہ موجودات کی زندگی کی حفاظت کی ضامن ہے۔ ان میں سے حفاظت کی ایک جہت یہ ہے کہ یہ ہوا ان پتھروں کو جلا دیتی ہے اور ذرّہ ذرّہ کر دیتی ہے جو دور دور سے ٹوٹ کر مسلسل زمین کے اِس ماحول میں وارد ہوتے رہتے ہیں۔ علم حیاتیات کا ماہر پروفیسر فرانک آلین کہتا ہے: اس کرۂ ارض کے اردگرد زندگی کی محافظت کے لئے گیسوں سے بھری ہوئی جو فضا موجود ہے۔ وہ ۸۰۰ کلومیٹر کی حدود میں پھیلی ہوئی ہے اور اتنی موٹی اور سخت ہے کہ اس کو زمین کے ذرّہ سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ وہ اس کو آسمان سے ہر روز برسنے والے ان دو کروڑ بھاری پتھروں کی مار سے بچاتی ہے جو تقریباً ۵۰ کیلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی اس قریبی ہوا میں داخل ہوتے ہیں۔ (۱)

زمین کے اطراف میں کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں ایسے شہاب ثاقب ’’سنگہائے شہابی‘‘ موجود ہیں جو زمین کی طرف سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں چونکہ وہ سرد اور منجمد ہیں اس لئے صرف سورج کی روشنی میں چمکتے ہیں، لیکن اس قدر چھوٹے چھوٹے ہیں کہ ان سے منعکس ہونے والی آفتاب کی روشنی اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ ہم انہیں دیکھ سکیں۔

’’زمین اپنی قوت جاذبہ سے ہر روز آفتاب کے گرد گھومتے ہوئے ان کروڑوں آسمانی پتھروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یعنی وہ سورج سے ایک جانب ہٹ کر زمین کی طرف آجاتے ہیں۔ ان پتھروں کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ کبھی کبھی ۷۰ کیلو میٹر فی سیکنڈ تک بھی جا پہنچتی ہے۔ وہ اپنی اس تیز رفتار کے ساتھ ہوا سے ٹکراتے ہیں تو سخت گرم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ حرارت سے سفید ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت ہم ان کو آگ کے ایک شعلہ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔‘‘

ان آیات میں آسمان کی خلقت، ارضی وسماوی موجودات، زندگی وموت، آغاز و

(۱) ہارون یحییٰ، اللہ کی نشانیاں (مترجم ڈاکٹر تصدق حسین): ۴۵

انجام، ظاہر و باطن، زمین سے اوپر جانے والی اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ اس میں ایسے اُمور کو پیش کیا گیا ہے جو دورِ حاضر میں علم الفلکیات، علم الارض، علم النباتات، علم الحیوان، علم الکیمیاء، علم الطبیعات اور اس قسم کے دیگر علوم جو عصر حاضر کی ضرورت ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے حکمت والا، زندگی عطا کرنے والا، موت دینے والا، قادر، عالم اور دانا ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

علم الٰہی اور انسانی ساخت

اللہ تعالیٰ انسانوں کے ابدان کی طبعی ساخت اور ان کے درمیان پائے جانے والے گوناگوں اختلافات سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ مثلاً انسان، عقل، ہوش، حافظہ، جسمانیت، سرشت اور روش وغیرہ میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں اور ان اختلافات کی بنیاد رحم مادر ہی میں پڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام اُمور کا عالم ہے اور اس کا علم ان سب پر حاوی ہے، چنانچہ وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ کُلُّ اُنۡثٰی وَمَا تَغِیۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَ مَا تَزۡدَادُ ؕ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ○ (۱)

”اللہ جانتا ہے جو کچھ ہر مادہ اپنے پیٹ میں اٹھاتی ہے اور رحم جس قدر سکڑتے اور جس قدر بڑھتے ہیں، اور ہر چیز اس کے ہاں مقرر حد کے ساتھ ہے○“

اس مضمون کے بارے میں چند ایک آیات ملاحظہ کیجئے:

۱۔ **اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ۚ وَیُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ ۚ وَیَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ.** (۲)

”بیشک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، اور وہی بارش اتارتا ہے، اور جو کچھ رحموں میں ہے وہ جانتا ہے۔“

---

(۱) الرعد، ۱۳: ۸

(۲) لقمان، ۳۱: ۳۴

اس بارے میں کہ اللہ تعالیٰ تمام نیک و بد اعمال اور جائز و ناجائز حرکات سے مکمل طور پر آگاہ ہے قرآن حکیم میں ہے:

۲۔ اِنَّ اللہَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ○ (۱)

’’بیشک وہ جو کچھ سرانجام دیتے ہیں اللہ اسے خوب جاننے والا ہے○‘‘

۳۔ وَاللہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِیۡمٌ○ (۲)

’’اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جاننے والا ہے○‘‘

۴۔ قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡہُ یَعۡلَمۡہُ اللہُ. (۳)

’’آپ فرما دیں کہ جو تمہارے سینوں میں ہے خواہ تم اسے چھپاؤ یا اسے ظاہر کر دو اللہ اسے جانتا ہے، اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوب جانتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے۔‘‘

۵۔ وَ اِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ یَعۡلَمُ السِّرَّ وَ اَخۡفٰی○ (۴)

’’اور اگر آپ ذکر و دعا میں جہر (یعنی آواز بلند) کریں (تو بھی کوئی حرج نہیں) وہ تو سِرّ (یعنی دلوں کے رازوں) اور اَخفی (یعنی سب سے زیادہ مخفی بھیدوں) کو بھی جانتا ہے (تو بلند التجاؤں کو کیوں نہیں سنے گا)○‘‘

علمِ الٰہی اور جدید علم نفسیات

جدید علم نفسیات کی تحقیقات میں ماہرین نے انسان کے ضمیر سے متعلق بہت

(۱) فاطر، ۳۵: ۸
(۲) البقرۃ، ۲: ۲۸۳
(۳) آلِ عمران، ۳: ۲۹
(۴) طٰہٰ، ۲۰: ۷

زیادہ بحث کی ہے اور اس بارے میں کئی کتب لکھی ہیں۔

ایک اِنسان کے ضمیر سے مراد اس کے ذہنی خیالات اور نفسانی صورتوں کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کے باطن میں موروثی طور پر پوری زندگی کے اکتساب کے باعث مجتمع اور مرتکز ہو جاتا ہے۔ انسان کے ذہن کے خزانے میں ذخیرہ شدہ یہی خیالات اور تصورات وغیرہ ہی اس امر کا باعث بنتے ہیں کہ وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر یہی ارادہ انسان کے کسی صحیح یا غلط، مطلوب یا نامطلوب عمل کے انجام دینے کا سبب قرار پاتا ہے۔ ذہن کے دائرے میں آنے والے یہ خیالات و معلومات چونکہ روشنی و تاریکی یا وضوح و ابہام کے اعتبار سے باہم فرق رکھتے ہیں اور ہر انسان اپنے باطن میں پائے جانے والے اس تفاوت کو خود بخود محسوس بھی کرتا ہے۔ اس لئے دورِ حاضر کا علم نفسیات اِنسان کے ضمیر کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور ماہرین نے ان دونوں حصوں کے علیحدہ علیحدہ نام بھی تجویز کئے ہیں۔ مثلاً آشکار اور پنہاں یا خود آگاہ اور ناخود آگاہ۔ پھر اُنہوں نے ہر ایک کے لئے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً ہر اِنسان جو اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے خلق و روش کے لحاظ سے بالفعل حیوان اور بالقوہ انسان ہوتا ہے۔ یعنی وہ تمام صفات اور سارے اخلاق و عادات جو طبیعی طور پر اس کے اندر موجود ہوتے ہیں اور اس کی نشوونما کے ساتھ تدریجاً ظہور کرتے جاتے ہیں، وہ سب حیوانی مطالبات ہوتے ہیں مثلاً، کھانا، پینا، شہوت، غضب، حب ذات، کھیل کود، انتقام جوئی، تفوق طلبی اور اس قسم کے جو حیوانی صفات ہیں لیکن انہیں نومولود انسانی بچوں کے اندر انسانی صفات اور عمدہ اخلاق و عادات کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور ایک لائق مربی انہیں ایک اچھا انسان بنا سکتا ہے۔ وہ مربی یہ قدرت رکھتا ہے کہ اس نومولود کے وجود میں انسانی صفات کی پرورش کرے اور اِسے مکارمِ اخلاق کا حامل بنا دے۔ اِنسان اپنے حیوانی تقاضوں کے تحت غصے اور جوش کی حالت میں چاہتا ہے کہ اپنے غصے کے تحت کسی شخص سے انتقام لے۔ لیکن اِسلام اپنے پیروکاروں کو تربیت دیتا ہے کہ اپنے غصے پر قابو پائیں، دوسرے لوگوں کی

لغزشوں سے چشم پوشی کریں اور ان کے ساتھ نیکی اور احسان کا سلوک کریں۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَo(۱)

”یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہےo“

اللہ تعالیٰ کے علمی دائرہ کی وسعت سے متعلق قرآن حکیم یوں تعلیم دیتا ہے کہ وہ سب کچھ جو لوگوں کی فکر و عقل میں آتا ہے، باالفاظ دیگر جو کچھ ضمیر آشکار اور ضمیر مخفی میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ و آشنا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس انسان نے اِسلامی تعلیمات کے حقیقی کمالات سے متاثر ہو کر ان کو قبول کیا اور غیر اِسلامی رُجحانات کو دبا کر رکھا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کس شخص نے لوگوں کو دکھلانے کے لئے بظاہر مسلمانی کا دعویٰ کیا ہوا ہے اور وہ مخلوق میں اپنی اِسلام دشمن اور مخالف انسانیت خواہشات کا پیروکار رہتا ہے۔ ایک حقیقی مسلمان کہ جس کا ضمیر الٰہی تعلیمات سے آراستہ ہوتا ہے، اگر کبھی اضطرارِ حالات میں مجبور ہو جائے اور ناچار ہو کر اِسے اِسلام کی نفی کرنا پڑے تو ایسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ اس کے حقیقی ایمان اور اِسلامی ذہن سے آشنا و آگاہ ہوتا ہے۔ آج سے چودہ صدیاں قبل جب قرآن حکیم علمی دائرے کی وضاحت کے درپے ہوا تو اس نے ”سر“ اور ”اخفیٰ“ کے دو کلمات اِستعمال کئے اور ان سے اس دقیق فرق کی طرف اشارہ فرمایا۔ مختصر یہ کہ اس عالم ہستی کے سارے کلیات و جزئیات علم الٰہی کے دائرے میں موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے مکمل طور پر آگاہ اور ان کا عالم ہے۔

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جنگلی حیوانات کی آوازوں کو

(۱) آل عمران، ۳: ۱۳۴

جانتا ہے۔ اپنے بندوں کی ان نافرمانیوں کو جو وہ خلوت گاہوں میں کرتے ہیں۔ مچھلیوں کی آمد و رفت کو جو وہ سمندروں کی گہرائیوں میں کرتی ہیں اور پانی کی امواج اور ان لہروں کو جو تیز و تند ہواؤں اور طوفانوں سے وجود میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں سے بخوبی آشنا و آگاہ ہے۔(۱)

اِسلام اور قرآن اپنے ماننے والوں سے یہی خواہش کرتا ہے کہ وہ سب پورے خلوص کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت کریں۔ وہ اپنے خالق و مالک کی عبادت اسے معبودِ حقیقی سمجھ کر کریں اور اس مولیٰ کی درگاہ میں وہی عبادت قابل قبول قرار پاتی ہے جو پر خلوص عبادت ہوتی ہے۔ عبادت کا دارومدار خلوص نیت پر ہے۔ تیرا کوئی بھی عمل بارگاہ الٰہی میں قابل قبول نہیں مگر یہ کہ تو نے اسے خلوص کے ساتھ انجام دیا ہو۔

کیا خلوص نفسیاتی کیفیت کا نام ہے؟

خلوص کا تعلق انسان کی نفسیاتی کیفیات اور ضمیر سے ہے اور یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا عالم ہے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اِنسان کے تمام اسرار اور رموز پر آگاہ ہے تو وہ حتماً اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کی ساری عبادات پاک و پاکیزہ اور ہر قسم کی آلائشوں سے مبرا ہونا چاہئیں اور ان کو مخفی یا آشکار شرک سے آلودہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اسے علم ہے کہ آلودہ اور ناخالص عبادت نہ فقط یہ کہ موجب نجات و سعادت نہیں ہوسکتی، بلکہ انسان کو مشرکین کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستوجب سزا قرار پاجاتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کل بروز قیامت نجات کس چیز میں ہے؟ حضور نبی اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: نجات فقط اس میں ہے کہ اپنے اللہ کے ساتھ دھوکا اور فریب نہ کرو کہ پھر اللہ تعالیٰ بھی تمہیں دھوکے میں ڈال دے گا۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دھوکا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے دھوکے میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کا ایمان سلب کر لیتا ہے۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دھوکا کرتا ہے اگر وہ

(۱) نہج البلاغۃ خطبہ: ۳۱۵

اسے صحیح طور پر سمجھے تو درحقیقت اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ اس پر حضور نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا، کوئی خدا سے کس طرح دھوکا کر سکتا ہے؟ فرمایا: اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو جو فریضہ انجام دینے کا ارادہ فرمایا ہے، اس کو انجام تو دے لیکن دل میں نیت غیر خدا کی کرے۔ اس کے بعد فرمایا: راہِ تقویٰ اختیار کرو اور ریا سے پرہیز کرو کیونکہ ریا اللہ تعالیٰ سے شرک کرنے کے مترادف ہے اور بروز قیامت ریا کار کو چار ناموں سے پکارا جائے گا، اے کافر، اے فاجر، اے مکار، اے اپنا نقصان کرنے والے! تیرے اعمال غارت اور تیرا اجر ضائع ہوا۔

توحید فی العلم کا تصور

اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق و مالک، رب اور مدبرّ امورِ کل ہے۔ وہ ذات ہر شئے پر قادرِ مطلق، حی و قیوم، سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات میں وحدہ لاشریک ہے۔ اس کی نہ کوئی مثل ہے اور نہ کوئی مثال۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں، وہ لم یزل اور لایزال ہستی ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ نہ کوئی اس کی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا۔ وہی اول ہے وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا مطیع و منقاد اور تابع فرمان ہے۔ وہ امر کن سے کائنات کی ہر شئے کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ وہی معبود و مقصودِ حقیقی ہے۔ پورا نظام عالم اسی کی بے مثال حکمت اور تدبیر سے چل رہا ہے۔ کائنات ارض و سما کے اندر ہر طرف اسی کی ذات و صفات کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

توحید باری تعالیٰ ایمانیات کے باب میں دین اسلام کی اساس ہے۔ یہ وہ بنیادی حقیقت ہے جس کے لوازم و خواص کی تفہیم کے بغیر کوئی شخص معتقدات کی شاہراہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ قرآن مجید نے توحید باری تعالیٰ اور اس کے جمیع لوازم و خواص کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ انتہائی دلنشیں، حکیمانہ اور بصیرت آموز انداز میں بیان

فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت کے بیان میں توحید فی الذّات اور توحید فی الصّفات لا ینفک اجزاء کے طور پر شامل ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے میں کوئی اس کا ہمسر نہیں اسی طرح اس کی صفات مختصہ میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ توحید فی الصفات پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صفات جو اللہ تبارک و تعالیٰ کا خاصہ ہیں ان کو فقط اسی کے لئے مانا جائے اور ان صفات و خواص کا اثبات و اختصاص کسی غیر کے لئے نہ کیا جائے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ توحید فی العبادہ، توحید فی الدعا اور توحید فی العلم توحید کی مختلف جہتیں ہیں اور ان میں ہر جہت اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔

جس علم کا اثبات خاصۃً اللہ کے لئے ہے اس کو اللہ کا حق تسلیم کرنا اور کسی غیر اللہ کے لئے اس طرح کے علم کی نفی کا عقیدہ رکھنا توحید فی العلم ہے۔

اس بارے میں قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ. (۱)

”اور غیب کی کنجیاں (یعنی وہ راستے جن سے کسی پر غیب آشکار کیا جاتا ہے) اسی کے پاس (اس کی قدرت و ملکیت میں) ہیں اس کے سوا (از خود) کوئی نہیں جانتا۔“

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ○ (۲)

”فرما دیجئے کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں (از خود) غیب کا علم نہیں

(۱) الانعام، ۶: ۵۹

(۲) النمل، ۲۷: ۶۵

رکھتے سوائے اللہ کے (وہ عالم بالذّات ہے) اور نہ ہی وہ یہ خبر رکھتے ہیں کہ وہ (دوبارہ زندہ کر کے) کب اٹھائے جائیں گے۔‘‘

شرک فی العلم

شرک فی العلم یہ ہے کہ جس علم کا اثبات خالصتاً اللہ کے لئے ہو اس علم کو غیر اللہ کے لئے ثابت کیا جائے یا اس کے لئے ویسے ہی علم کا عقیدہ رکھا جائے۔ تاہم مخلوق میں سے کسی بندۂ خدا کو اس کے حسبِ حال اللہ کی عطا سمجھ کر علم ثابت کیا جانا شرک نہیں۔ مخلوق کے لئے علم کا اثبات کسی حقیقت و مجاز کے اجراء کا متقاضی نہیں، کیونکہ یہ بات مسلّمہ ہے کہ اللہ رب العزت کا علم ذاتی اور مخلوق کا علم عطائی ہے۔ اللہ رب العزت کے علم اور مخلوق کے علم میں کوئی نسبت نہیں۔ اللہ جل شانہٗ اپنی مخلوق میں سے انبیاء علیھم السلام، اولیاء کرام، علماء اور مخلوق میں سے جس کو چاہے ہر ایک کے حسب حال درجہ بہ درجہ علم کی دولت عطا فرماتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ○[1]

’’اور ہر صاحب علم سے اوپر (بھی) ایک علم والا ہوتا ہے○‘‘

اللہ تعالیٰ خود بھی علیم ہے اور اس نے انسان کو بھی علم کی نعمت سے بہرہ یاب کیا ہے، لیکن یہ صفت انسان کو اس کے حسب حال عطا ہوئی ہے۔ اسی طرح انبیاء علیھم السلام کے لئے جس علمِ غیب کا اثبات ہے وہ مطلع علی الغیب ہونا ہے اور یہ بات نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

علمِ الٰہی کی صفات

توحید فی العلم اور شرک فی العلم کے ضمن میں علم الٰہی کی درج ذیل صفات کا تسلیم

(۱) یوسف، ۱۲: ۷۶

کرنا ضروری ہے۔

۱- اللہ تعالیٰ کا علم محیط بالکل ہے۔

۲- علم الٰہی ذاتی ہے، عطائی نہیں۔

۳- علم الٰہی بالقدرۃ ہے۔

یعنی وہ ایسا علم ہے کہ جس کے ساتھ اسے نفع و نقصان کے بدلنے پر بلاشرکت غیرے پوری قدرت حاصل ہے۔

پس وہ علم جو ان تینوں صفات کے ساتھ متصف ہو اس علم کو اللہ رب العزت کے لئے ثابت کرنا توحید اور اللہ تعالیٰ کے غیر کے لئے ثابت کرنا شرک ہے۔

عطائے الٰہی اور اِذنِ الٰہی شرک نہیں

مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا اور اِذن سے علم کا ثابت کرنا شرک نہیں۔ البتہ اللہ کے غیر کے لئے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ بالذات علم رکھنے، علم دینے، فیض پہنچانے، ذاتی تصرف سے کسی کو کوئی چیز عطا کرنے یا اس کی مشکل دور کرنے پر قادر ہے، شرک ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ بندے کا علم، فیض اور تصرف اس کا ذاتی نہیں بلکہ محض عطائے الٰہی ہے اور بندے کے ہاتھ اور زبان سے جو اذن جاری ہو رہا ہے وہ اذنِ الٰہی کے تابع ہے اور اس میں بندے کا اپنا کوئی کمال نہیں تو یہ ہرگز شرک نہیں ہوگا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کی عطا اور اذن کا ذکر موجود ہے۔

متقین کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ○[1]

’’اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے (ہماری راہ پر) خرچ کرتے

(۱) البقرۃ، ۲: ۳

www.MinhajBooks.com

ہیں۔‘‘

مفسرین نے اس مقام پر **رزقنھم** کی تفسیر ’’**اعطیناھم**‘‘ کی ہے اور رزق سے ہر نفع رساں شئے مراد لی گئی ہے۔ امام بغویؒ فرماتے ہیں:

قوله ’’ومما رزقنھم‘‘ ای اعطیناھم، والرزق اسم لکل ما ینتفع به حتی الولد و العبد. (۱)

’’فرمانِ الٰہی ’’**ومما رزقنھم**‘‘ سے مراد ’’**اعطیناھم**‘‘ (اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے) اور رزق ہر اس شئے کا نام ہے جس سے نفع حاصل کیا جائے یہاں تک کہ اولاد اور غلام بھی اس کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔‘‘

علامہ محمد رشید رضا رزق کا مفہوم بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

الرزق فی اللغة النصیب والعطاء یطلق علی الحسی والمعنوی. (۲)

’’لغت میں رزق سے مراد حصہ اور بخشش ہے خواہ حسی طور پر ہو یا معنوی طور پر۔‘‘

لہٰذا رزق سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ تمام نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کو عطا کی ہیں خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وسائلِ رزق میں چاہے مال و دولت ہو یا حکومت و سلطنت، صحت و توانائی ہو یا علم و ہنر۔ مذکورہ بالا آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے کہ اے بندے جو کچھ تیرے پاس ہے فی الواقع تیرا نہیں بلکہ یہ میرا عطا کردہ ہے اور تجھے چاہئے کہ اس میں سے محروموں کو بھی فیض یاب کرے۔ تیرے مال میں غریبوں، ناداروں، مفلسوں اور مفلوک الحال لوگوں کا بھی حصہ ہے۔ تیرا فرض بنتا

(۱) بغوی، معالم التنزیل، ۱: ۴۷

(۲) رشید رضا، تفسیر المنار، ۱: ۱۲۹

ہے کہ تو ان کا یہ حصہ ان تک پہنچائے۔ اگر میں نے تجھے علم و ہنر کی دولت عطا کی ہے تو تجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ دوسروں کو علم و ہنر سکھا کر اس نعمت کو عام کر دے۔ اگر میں نے تجھے حکمت و تدبر سے نوازا ہے تو تجھے چاہیئے کہ اس سے مخلوقِ خدا کو بھی نفع پہنچائے۔

آیہ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کی عطا کو خاص نہیں بلکہ عام رکھا گیا ہے۔ اس ارشاد ربانی کی رو سے **مُنعَم علیہ** کے لئے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عطا کردہ نعمت سے محروم افراد کو متمتع ہونے کا موقع فراہم کرے کہ اس پر سب کا حق برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو سلطنت اور علم و حکمت عطا فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

وَاٰتٰـهُ اللهُ الْمُلْکَ وَالْحِکْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ. (۱)

''اور اللہ نے ان کو (یعنی داؤد کو) حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور انہیں جو چاہا سکھایا۔''

علم و حکمت اور حکومت اصلاً سب اللہ کے لئے ہے اور اس میں سے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے:

اسی مضمون پر مشتمل دیگر آیاتِ قرآنی میں سے بعض آیات درج ذیل ہیں:

۱۔ **وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا.** (۲)

''اور ہم نے ان سب کو حکمت اور علم سے نوازا تھا۔''

۲۔ **وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا.** (۳)

''اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو (غیر معمولی) علم عطا کیا۔''

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۵۱

(۲) الأنبياء، ۲۱: ۷۹

(۳) النمل، ۲۷: ۱۵

www.MinhajBooks.com

۳۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَيْنَاهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا.[۱]

''اور جب وہ اپنے کمال شباب پر پہنچ گیا (تو) ہم نے اسے حکم (نبوت) اور علم (تعبیر) عطا فرمایا۔''

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا.[۲]

''اور جب وہ پورے شباب پر پہنچے اور (ذہنی صلاحیتوں سے) درست ہو گئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا۔''

۵۔ وَاللهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ.[۳]

''اور اللہ اپنی سلطنت (کی امانت) جسے چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔''

۶۔ يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ.[۴]

''(اللہ) جسے چاہتا ہے دانائی عطا فرما دیتا ہے۔''

۷۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا.[۵]

''اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہو گئی۔''

۸۔ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ○[۶]

(۱) یوسف، ۱۲:۲۲
(۲) القصص، ۲۸:۱۴
(۳) البقرۃ، ۲:۲۴۷
(۴) البقرہ، ۲:۲۶۹
(۵) البقرۃ، ۲:۲۶۹
(۶) الکہف، ۱۸:۶۵

www.MinhajBooks.com

’’تو دونوں نے (وہاں) ہمارے بندوں میں سے ایک (خاص) بندے (خضر علیہ السلام) کو پا لیا جسے ہم نے اپنی بارگاہ سے (خصوصی) رحمت عطا کی تھی اور ہم نے اسے اپنا علم لدنی (دینی اسرار و معارف کا الہامی علم) سکھایا تھا۔‘‘

سب کو ملتا ہے فقط ان کی رضا کا صدقہ

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ اس کی رحمت و رافت اور مغفرت وبخشش کی چادر گنہگاروں پر سایہ فگن ہے۔ اس کی عطا اور بخشش کے دروازے ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلے ہیں لیکن سب کچھ محبوبِ خدا ﷺ کے واسطے، وسیلے اور صدقے سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ○[1]

’’ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان (طالبانِ دنیا) کی بھی اور ان (طالبانِ آخرت) کی بھی (اے حبیب مکرم! یہ سب کچھ) آپ کے رب کی عطا سے ہے اور آپ کے رب کی عطا (کسی کے لئے) ممنوع اور بند نہیں○‘‘

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں اپنے بندوں کو سب کچھ عطا فرماتا ہوں۔ اگر کوئی آخرت کی کامیابی کا طلبگار ہو تو اسے اخروی کامیابی عطا فرماتا ہوں۔ اگر کوئی دنیوی نعمتوں کا آرزومند ہو تو اسے دنیوی نعمتوں سے سرفراز کر دیا جاتا ہے لیکن میری عطائیں، نوازشیں اور عنایتیں محبوبِ کریم ﷺ کے واسطے سے ہیں۔ جب تک آپ ﷺ کا واسطہ موجود رہے گا آپ کی امت پر میری عطا اور بخشش کی بارشوں کا نزول ہوتا رہے گا۔

واضح رہے کہ آیہ مذکورہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی عطا خاص نہیں بلکہ عام ہے اس کی عطا کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے دربار سے کوئی سائل خالی دامن نہیں لوٹتا۔ اللہ

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۰

تعالیٰ نے اپنی عطاؤں کے لامحدود خزانے اپنے محبوبِ کریم ﷺ کے تصرف میں دے دیئے ہیں اور وہ اپنے بے پناہ جود و کرم سے جس پر چاہیں وہ خزانے لٹا سکتے ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰیo(۱)

''اور آپ کا رب عنقریب آپ کو (اتنا کچھ) عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گےo''

مالکِ کل نے اپنے حبیب ﷺ کو کوثر کی صورت میں خیرِ کثیر کا مالک بنا دیا۔

اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَo(۲)

''بے شک ہم نے آپ کو (ہر خیر و فضیلت میں) بے انتہا کثرت بخشی ہےo''

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إنّما أنا قاسم و الله يعطي.(۳)

''میں تو صرف تقسیم کرتا ہوں اور اللہ رب العزت عطا فرماتا ہے۔''

کارساز ذات کی بندہ نوازیاں

اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ اور مقرب بندوں کو مقامِ ماذونیت پر سرفراز فرماتا ہے۔ اس مقام پر جو کچھ بندے سے صادر ہوتا ہے اس میں اذنِ الٰہی اور عطائے الٰہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

(۱) الضحیٰ، ۹۲: ۵

(۲) الکوثر، ۱۰۸: ۱

(۳) بخاري، الصحيح، كتاب العلم، باب من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين، ۱: ۳۹، رقم: ۷۱

حضرت عیسیٰ علیہ السلام معجزاتی طور پر مٹی سے پرندے کی صورت بنا کر اس میں پھونکتے تو وہ اللہ کے اذن سے اڑنے لگتا جیسا کہ قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بیان فرماتا ہے:

اِنِّی اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًام بِاِذْنِ اللهِ. (۱)

''میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل جیسا (ایک پتلا) بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں سو وہ اللہ کے حکم سے فوراً اڑنے والا پرندہ ہو جاتا ہے۔''

ہر شئے کا خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ آیہ مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فعل خلق کی نسبت اپنی طرف کرنا اوران کی پھونک کے اثر سے بے جان مٹی کا پرندہ بن کر مائل بہ پرواز ہو جانا درحقیقت اذنِ الٰہی کا ہی صدور تھا جس کا ثبوت باذن اللہ کے الفاظ سے ملتا ہے۔ یہاں فعلِ خلق کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف مجازاً کی گئی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر اسی نسبت کے بارے میں واضح ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَکُوْنُ طَیْرًام بِاِذْنِی. (۲)

''اور جب تم میرے حکم سے مٹی کے گارے سے پرندے کی شکل کی مانند (مورتی) بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ (مورتی) میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی۔''

آیہ مذکورہ میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام جو اللہ کے مقرب بندے اور رسول ہیں کے عبد

(۱) آل عمران، ۳: ۴۹

(۲) المائدۃ، ۵: ۱۱۰

www.MinhajBooks.com

ماذون ہونے کی تصدیق خود اللہ رب العزت نے فرمائی ہے۔ آپ کو رب ذوالجلال نے مسیحائی کا وہ اعجاز اور کمال تصرف عطا کر رکھا تھا کہ آپ مادر زاد اندھوں کو بینا اور برص زدہ مریضوں کو شفایاب کر دیتے اور مردے اللہ کے حکم سے آپ کے کلمہ ''قم'' پر زندہ ہو جاتے تھے۔

قرآن مجید میں اس کمالِ عیسوی کا ذکر خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے ان الفاظ میں منسوب ہے۔

وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللهِ.(۱)

''اور میں مادر زاد اندھے اور سفید داغ والے کو شفایاب کرتا ہوں اور میں اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتا ہوں۔''

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان افعال کی نسبت اپنے عبد ماذون حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بایں الفاظ بیان فرمائی ہے:

وَ تُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِی.(۲)

''جب تم مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں (یعنی برص زدہ مریضوں) کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور جب تم میرے حکم سے مردوں کو (زندہ کر کے قبر سے) نکال کھڑا کر دیتے تھے۔''

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے ہونے والے اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزاتی تصرفات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ متذکرہ بالا افعال کا باذن اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صادر ہونا ہرگز شرک نہیں۔ کوئی بھی خارق العادت کام جو اللہ کے حکم سے اس کے کسی

---

(۱) آل عمران، ۳: ۴۹

(۲) المائدۃ، ۵: ۱۱۰

مقرب بندے سے صادر ہوا سے ہرگز شرک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

واقعہ موسیٰ و خضر علیہما السلام میں اذنِ الٰہی کا حضرت خضر علیہ السلام سے جاری ہونا بھی اسی ذیل میں آتا ہے اور اس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں فرمایا گیا ہے:

فَانۡطَلَقَا حَتّٰۤی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیۡنَۃِ خَرَقَہَا. (۱)

''پس دونوں چل دیئے یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے (تو خضر علیہ السلام نے) اس (کشتی) میں شگاف کر دیا۔''

اس سے آگے فرمایا:

فَانۡطَلَقَا حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَہٗ. (۲)

''پھر وہ دونوں چل دیئے یہاں تک کہ دونوں ایک لڑکے سے ملے تو (خضر علیہ السلام نے) اسے قتل کر ڈالا۔''

پھر فرمایا:

فَانۡطَلَقَا حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَہۡلَ قَرۡیَۃِۣ اسۡتَطۡعَمَاۤ اَہۡلَہَا فَاَبَوۡا اَنۡ یُّضَیِّفُوۡہُمَا فَوَجَدَا فِیۡہَا جِدَارًا یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّنۡقَضَّ فَاَقَامَہٗ. (۳)

پھر دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب دونوں ایک بستی والوں کے پاس آ پہنچے، دونوں نے وہاں کے باشندوں سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے ان دونوں کی میزبانی کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر دونوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرا چاہتی تھی تو (خضر علیہ السلام نے) اسے سیدھا کر دیا۔''

---

(۱) الکھف، ۱۸: ۷۱

(۲) الکھف، ۱۸: ۷۴

(۳) الکھف، ۱۸: ۷۷

www.MinhajBooks.com

ان آیات کریمہ سے بخوبی واضح ہے کہ مذکورہ واقعہ میں تمام امور جو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے انجام دیئے درحقیقت اذنِ الٰہی سے تھے اور ان کا صدور آپ علیہ السلام کے افعال سے ہوا جیسا کہ اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان تمام باتوں کی حقیقت بیان کرنے کے بعد فرمایا:

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَلَیْهِ صَبْرًا ○[1]

"اور میں نے (جو کچھ بھی کیا) وہ از خود نہیں کیا۔ یہ ان واقعات کی حقیقت ہے جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔"

مقامِ ماذونیت کی تائید صحیح بخاری میں موجود ایک حدیث قدسی سے ہوتی ہے جس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے منسوب فرمایا ہے:

وما يزال عبدي يتقرّب إليّ بالنوافل حتّى أحبّه فإذا أحببته كنت سمعه الّذي يسمع به وبصره الّذي يبصر به ويده الّتي يبطش بها ورجله الّتي يمشي بها وإن سألني لأعطينه.[2]

"میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر اس کے کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھے سوال کرے تو میں ضرور اسے عطا فرماتا ہوں۔"

بندہ فرائض کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ نفلی عبادات کی مداومت کے نتیجے میں

(۱) الکہف، ۱۸: ۸۲

(۲) بخاری، الصحیح، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۵: ۲۳۸۴، رقم: ۶۱۳۷

اللہ کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مقام کسی کافر، مشرک اور بت پرست کو نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس مقام سے انبیاء کرام علیھم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیائے عظام علیھم الرحمۃ کو ہی سرفراز کیا جا تا ہے۔ حدیث قدسی کے مفہوم سے پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی بندہ نیابت الٰہیہ کے درجہ و منصب پر فائز کیا جاتا ہے تو پھر اللہ رب العزت اس میں اپنا اذن جاری کرتا ہے جس کے بعد وہ بندہ صاحبانِ اذن میں سے ہو جاتا ہے۔ پھر اس مقام پر جو کچھ اس سے صادر ہوتا ہے وہ اللہ کے اذن اور اس کی عطا سے ہوتا ہے اور وہ بندہ جو کچھ بھی کرتا ہے اسے اذن الٰہی گردانا جاتا ہے۔ اس مقام کو مولانا رومؒ نے یوں بیان فرمایا ہے:

گفتہ او گفتہ اللّٰہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللّٰہ بود

اس بندے کا بولنا اللہ کا بولنا ہو جاتا ہے باوجود اس کے کہ بات بندے کی زبان سے نکل رہی ہوتی ہے مگر وہ کلام اس کی زبان پر آ کر اذن الٰہی بن جاتا ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اللہ کی مشیت اس کے شامل حال رہتی ہے۔ اس لئے کہ کوئی بندہ مطلقاً اذنِ الٰہی کا مالک نہیں بن جاتا۔

شانِ رسالت اور مقامِ تکوین

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، قدرتِ کاملہ کا مالک ہے۔ وہ جس شئے کو چاہے امر کن کے ذریعے عدم سے وجود میں لے آئے۔ اس کی یہ شان کسی کی عطا کردہ نہیں بلکہ بالذات اس میں پائی جاتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (۱)

’’اس کا امرِ (تخلیق) فقط یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو (پیدا فرمانا) چاہتا ہے تو

(۱) یٰسٓ، ۳۶: ۸۲

www.MinhajBooks.com

اسے فرماتا ہے ہو جا، پس وہ فوراً (موجود یا ظاہر) ہو جاتی ہے۔ (اور ہوتی چلی جاتی ہے)o‘‘

محولہ بالا آیہ کریمہ میں مقامِ تکوین کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شان انبیاء اور اولیاء کو ان کے حسب حال عطا فرمائی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی نسبت متعدد ایسے معجزات منقول ہیں جن سے آپ کی شانِ تکوین کا اظہار ہوتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایک غزوہ میں صحابہ کے پاس تلواریں نہیں تھیں، فقط چھڑیاں تھیں جو آپ ﷺ کے فرمان سے کاٹ دار تلوار کی شکل اختیار کر گئیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:

قال لعسیب النخل کن سیفا فکان سیفا. (۱)

’’آپ ﷺ نے کھجور کی شاخ سے فرمایا: اے چھڑی! تلوار بن جاؤ۔ پس وہ تلوار بن گئی۔‘‘

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان چوبی تلواروں سے دشمن پر حملہ آور ہوتے اور ان کی گردنیں تن سے جدا کر دیتے۔

۲۔ جنگ بدر میں حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کی تلوار لڑتے لڑتے ٹوٹ گئی تو آپ ﷺ نے ان کو درخت کی ایک شاخ دے کر فرمایا کہ اضرب یعنی اس شاخ کے ساتھ جہاد کرو۔

آگے روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ شاخ ان کے دستِ حق پرست میں شمشیرِ آبدار بن گئی جس سے وہ کافروں کے ساتھ مصروفِ جہاد ہو گئے۔

فعاد فی یدہ سیفا صارما طویل القامۃ ابیض شدید المتن. (۲)

’’پس وہ شاخ ان کے ہاتھ میں سفید لمبی تیز دھار تلوار بن گئی۔‘‘

(۱) شعرانی، الیواقیت والجواھر، ۱: ۱۴۷

(۲) قاضي عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، ۱: ۴۶۶

قرآن وسنت کی مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب اور مقرب بندوں کو ان کے حسبِ حال خارق العادت صفات اور کمالات سے نوازتا ہے۔ حتی کہ اس کے بعض برگزیدہ بندے قدرت وتصرف کی محیر العقول صفات سے بھی بہرہ مند کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ان صفات وکمالات کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ ان کی ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہیں تو یہ شرک نہیں اور عقیدہ توحید کو اس سے کوئی ضعف نہیں پہنچتا کیونکہ نکتہ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی تمام صفات ذاتی ہیں اور بندے کی تمام صفات عطائی ہیں۔ عطائے الٰہی اور اذنِ الٰہی سے بندے میں جو صفات پیدا ہو جاتی ہیں ان پر شرک کا احتمال نہیں کیا جا سکتا۔

علمِ الٰہی کی وسعت کا قرآنی تصور

شانِ خالقیت و مالکیت اور تصورِ علم

اللہ تعالیٰ کا علم، علم محض نہیں بلکہ ایسا علم ہے جس میں اس کی صفات خالقیت و مالکیت اور قدرت وتصرف کے سارے اختیارات بھی شامل ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے علم کی حقیقت و ماہیت اور وسعت کا ذکر متعدد مقامات پر مختلف اسلوب اور انداز سے آیا ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا:

تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰیo اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰیo لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَهُمَا وَمَا تَحۡتَ الثَّرٰیo وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ یَعۡلَمُ السِّرَّ وَ اَخۡفٰیo اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰیo(۱)

---

(۱) طه، ۲۰: ۴۔۸

’’یہ اس (اللہ) کی طرف سے اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور بلند و بالا آسمان پیدا فرمائے۔ (وہ) نہایت رحمت والا (ہے) جو عرش (جملہ نظامہائے کائنات کے اقتدار) پر متمکن ہوگیا (پس) جو کچھ آسمانوں (کی بالائی نوری کائناتوں اور خلائی مادی کائناتوں) میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان (فضائی اور ہوائی کروں میں) ہے اور جو کچھ سطح ارضی کے نیچے آخری تہہ تک ہے سب اسی کے (نظام اور قدرت کے تابع) ہیں اور اگر آپ ذکر و دعا میں حمد (یعنی آواز بلند کریں تو بھی کوئی حرج نہیں) وہ تو سر (یعنی دلوں کے رازوں) اور اخفی (یعنی سب سے زیادہ مخفی بھیدوں) کو بھی جانتا ہے (تو بلند التجاؤں کو کیوں نہیں سنے گا۔ اللہ (اسی کا اسم ذات) ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔‘‘

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی صفتِ خالقیت بیان کرتے ہوئے زمین، آسمانوں، عرش، ماتحت العرش اور مافوق العرش عوالم کی تخلیق کا ذکر کیا اور جو عالم زیریں میں زمین کے نیچے ہے اس کے لئے اپنی صفتِ مالکیت بیان کی۔ ان دونوں صفات کا ذکر کرنے کے بعد باری تعالیٰ نے ساتویں آیت میں اپنا تصورِ علم بیان فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کوئی شے مخفی نہیں

۱۔ سورہ آل عمران میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ○ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ○[1]

’’یقیناً اللہ ہر زمین اور آسمان کی کوئی بھی چیز مخفی نہیں۔ وہی ہے جو (ماؤں کے)

(۱) آل عمران، ۳: ۵-۶

رحموں میں تمہاری صورتیں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کے سوا کوئی لائقِ پرستش نہیں (وہ) بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔‘‘

۲۔ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ○[۱]

’’اللہ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں○‘‘

۳۔ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ○[۲]

’’اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو○‘‘

۴۔ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا تَکۡتُمُوۡنَ○[۳]

’’اور اللہ ان (سب باتوں) کو جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو○‘‘

۵۔ یَعۡلَمُ سِرَّکُمۡ وَ جَهۡرَکُمۡ وَ یَعۡلَمُ مَا تَکۡسِبُوۡنَ○[۴]

’’جو تمہاری پوشیدہ اور تمہاری ظاہر (سب باتوں) کو جانتا ہے○‘‘

۶۔ اِنَّهٗ یَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَ یَعۡلَمُ مَا تَکۡتُمُوۡنَ○[۵]

’’بے شک وہ بلند آواز کی بات بھی جانتا ہے اور وہ (کچھ) بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو○‘‘

www.MinhajBooks.com

(۱) البقرۃ، ۲:۷۷

(۲) النحل، ۱۶:۱۹

(۳) النور، ۲۴:۲۹

(۴) الانعام، ۶:۳

(۵) الأنبیاء، ۲۱:۱۱۰

علمِ الٰہی کے وسیع و بسیط ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ کا علم وسیع اور بسیط ہے۔ اس پر دلالت کرنے والی بعض آیات درج ذیل ہیں۔

۱۔ رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَيۡءٍ رَّحۡمَةً وَّ عِلۡمًا.(۱)

”اے ہمارے پروردگار تیری رحمت اور علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔“

۲۔ وَسِعَ رَبِّيۡ كُلَّ شَيۡءٍ عِلۡمًا.(۲)

”میرے رب نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے احاطہ میں لے رکھا ہے۔“

۳۔ وَيَعۡلَمُ مَا فِي الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيۡ ظُلُمَاتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيۡ كِتَابٍ مُّبِيۡنٍ○(۳)

”اور وہ ہر اس چیز کو (بلاواسطہ) جانتا ہے جو خشکی میں اور دریاؤں میں ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا (مگر) وہ اسے جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا)○“

۴۔ اَللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ كُلُّ اُنۡثٰى وَمَا تَغِيۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَمَا تَزۡدَادُ وَكُلُّ شَيۡءٍ عِنۡدَهٗ بِمِقۡدَارٍ○ عَالِمُ الۡغَيۡبِ وَ الشَّهَادَةِ الۡكَبِيۡرُ الۡمُتَعَالِ○ سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَمَنۡ جَهَرَ بِهٖ وَمَنۡ هُوَ مُسۡتَخۡفٍ بِالَّيۡلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ○(۴)

(۱) المومن، ۴۰: ۷
(۲) الأنعام، ۶: ۸۰
(۳) الانعام، ۶: ۵۹
(۴) الرعد، ۱۳: ۸

’’اللہ جانتا ہے جو کچھ ہر مادہ اپنے پیٹ میں اٹھاتی ہے اور رحم جس قدر سکڑتے اور جس قدر بڑھتے ہیں اور ہر چیز اس کے ہاں مقرر حد کے ساتھ ہےo وہ ہر نہاں اور عیاں کو جاننے والا ہے، سب سے برتر (اور) اعلٰی مرتبہ والا ہےo تم میں سے جو شخص آہستہ بات کرے اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپا ہو اور جو دن (کی روشنی) میں چلتا پھرتا ہو (اُس کے لئے) سب برابر ہیںo‘‘

۵۔ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍo[۱]

’’اور آپ کے رب (کے علم) سے ایک ذرہ برابر بھی (کوئی چیز) نہ زمین میں پوشیدہ ہے اور نہ آسمان میں اور نہ اس (ذرہ) سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر واضح کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں درج ہے۔‘‘

اللہ تعالٰی عالم الغیب ہے

اس پر درج ذیل آیات دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ اِنِّيْ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.[۲]

’’میں آسمانوں کی اور زمین کی (سب) مخفی حقیقتوں کو جانتا ہوں۔‘‘

۲۔ يَوْمَ يَجْمَعُ اللهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَا اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِo[۳]

’’جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع فرمائے گا پھر (ان سے) فرمائے گا کہ تمہیں

---

(۱) یونس، ۱۰: ۶۱

(۲) البقرۃ، ۲: ۳۳

(۳) المائدۃ، ۵: ۱۰۹

(تمہاری اُمتوں کی طرف سے دعوت دین کا) کیا جواب دیا گیا تھا وہ (اللہ کی بارگاہ میں) عرض کریں گے ہمیں کچھ علم نہیں بے شک تو ہی غیب کی سب باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔‘‘

۳۔ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِيْ وَلَا اَعْلَمُ مَافِيْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِo(۱)

’’تو ہر اس بات کو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں ان (باتوں) کو نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے۔ بے شک تو ہی غیب کی سب باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔‘‘

۴۔ اَلَمْ يَعْلَمُوْآ اَنَّ اللهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ وَاَنَّ اللهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِo(۲)

’’کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ ان کے بھید اور ان کی سرگوشیاں جانتا ہے اور یہ کہ اللہ سب غیب کی باتوں کو بہت خوب جاننے والا ہے۔‘‘

۵۔ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَo(۳)

اور وہ (اب اسی مہلت کی وجہ سے) کہتے ہیں کہ اس (رسول) پر ان کے رب کی طرف سے کوئی (فیصلہ کن) نشانی کیوں نازل نہیں کی گئی۔ آپ فرما دیجئے غیب تو محض اللہ ہی کے لئے ہے۔ سوتم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

۶۔ وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَo(۴)

(۱) المائدۃ، ۵: ۱۱۶
(۲) التوبۃ، ۹: ۷۸
(۳) یونس، ۱۰: ۲۰
(۴) ھود، ۱۱: ۱۲۳

’’اور تمہارا رب تم سب لوگوں کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔‘‘

۷۔ قُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا لَهٗ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَبۡصِرۡ بِهٖ وَاَسۡمِعۡ.[1]

’’فرما دیجئے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت (وہاں) ٹھہرے رہے۔ آسمانوں اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں اسی کے علم میں ہیں۔ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے۔‘‘

۸۔ اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيۡبِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ○[2]

’’بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے۔ بے شک وہ (لوگوں کے) دلوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔‘‘

۹۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ○[3]

’’بیشک اللہ آسمانوں اور زمین کے سب غیب جانتا ہے، اور اللہ جو عمل بھی تم کرتے ہو اسے خوب دیکھنے والا ہے○‘‘

مذکورہ بالا آیات اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب ذاتی پر دلالت کر رہی ہیں۔ وہ آیات جن میں غیر خدا سے علمِ غیب کی نفی کا ذکر ہے وہ علمِ غیب ذاتی کی نفی کی گئی ہے۔

www.MinhajBooks.com

---

(۱) الکھف، ۱۸: ۲۶

(۲) فاطر، ۳۵: ۳۸

(۳) الحجرات، ۴۹: ۱۸

آیت الکرسی اور مسئلہ علمِ غیب

مسئلہ علم غیب کو سمجھنے کے لئے آیت الکرسی کو مرکزی و کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اِس موضوع پر ذہن میں پائے جانے والے بہت سے ابہامات و اشکالات کو دور کرنے کے لئے اس آیہ کریمہ کے مطالب و مفاہیم تک رسائی حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر یہ سمجھ میں آجائیں تو انشاء اللہ العزیز علم غیب کے حوالے سے بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی اور تشکیک کے مارے ہوئے ذہنوں میں تیقن کے چراغ روشن ہوں گے۔

پہلے یہ بات سمجھ لی جائے کہ آیت الکرسی اللہ جل مجدہ کی ذات و صفات کے حوالے سے ایک جامع آیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی ابتداء میں رب ذوالجلال کے اسم ذاتی ''اللہ'' کا ذکر کر کے متلاشیانِ حق کو بتلایا جا رہا ہے کہ یہ وہ ذات ہے جو واجب الوجود، قدیم بالذات، تمام صفات کمالیہ کی جامع اور ہر نقص وعیب سے پاک و مبرا اور تنہا عبادت کے لائق ہے۔ پھر اس کی الوہیت کا اثبات معبودان باطلہ کی نفی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد اس کی صفات کا ذکر بایں طور کیا گیا ہے کہ وہ ازخود زندہ و قائم ہے۔ جو اپنی حیات اور قیام میں کسی کا محتاج و دست نگر نہیں۔ وہ حییّ و قیوم ذات اُونگھ، غنودگی اور نیند کی تمام تر کیفیات وعوارض سے پاک ہے۔ کائنات بالا وزیریں میں ہر جگہ اس کی حکمرانی اور عملداری ہے۔ اذنِ الٰہی کے بغیر اور اِس کی منشاء کے خلاف کوئی اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے کی مجال اور قدرت نہیں رکھتا۔ ان صفات کو بیان کرنے کے بعد اللہ جل شانہٗ کی شانِ علم کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے:

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ. (۱)

’’جو کچھ مخلوقات کے سامنے (ہو رہا ہے یا ہو چکا) ہے اور جو کچھ ان کے بعد (ہونے والا) ہے (وہ) سب جانتا ہے، اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے۔‘‘

’’ھُم‘‘ ضمیر کا مرجع کون؟

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ’’**ما بین ایدیھم و ما خلفھم**‘‘ میں ’’**ھم**‘‘ ضمیر کا مجرور کیا ہے اور اس سے کیا معنی مراد لیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ’’**ھم**‘‘ ضمیر کا پہلا مرجع اسی آیت کریمہ میں مذکور کلمات ’’**لهٗ مافی السموٰت وما فی الارض**‘‘ ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ’’**ھم**‘‘ ضمیر سے مراد عالمین بالا و زیریں یعنی آسمانوں اور زمین میں بسنے والی وہ ساری مخلوق ہے جو عقل و شعور کی حامل اور حصولِ علم کی صلاحیت رکھتی ہے۔ گویا اس میں جمیع صاحبانِ عقل و شعور، انبیاء، ملائکہ، جنات، انسان اور وہ ساری مخلوق شامل ہے جو علم کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوسکتی ہے۔ ’’**ھم**‘‘ ضمیر کا دوسرا مرجع اِسی آیہ کریمہ کا پچھلا حصہ ’’**من ذا الّذی یشفع عنده الا باذنهٖ**‘‘ سے قرینہ فراہم کیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ’’**ھم**‘‘ ضمیر سے شفعاء یعنی شفاعت کرنے والے مراد ہو سکتے ہیں جو انبیاء اور ملائکہ ہیں۔ اس مرجع کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ رب العزت شفاعت کرنے والے انبیاء اور ملائکہ سے جو کچھ پہلے ہے اور جو کچھ ان کے بعد میں ہے اس سے پوری طرح باخبر ہے اور ہر چیز اس کے علم میں ہے۔

اگر دوسرے مرجع کو مانا جائے اور اِسے انبیاء و ملائکہ تک محدود کر دیا جائے تو

(۱) البقرہ، ۲: ۲۵۵

مخلوق کے کئی بلکہ بیشتر ذی شعور طبقات خارج ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی شان علم ان کے لئے بھی اسی طرح ہے جیسے وہ انبیاء و ملائکہ کے لئے ہے۔ اس بناء پر پہلے مرجع کو ترجیح دینا زیادہ بہتر اور قرین انصاف ہو گا کہ اس طرح انبیاء و ملائکہ سمیت اولین و آخرین جمیع مخلوقات اس میں از خود شامل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے بھی ''ھم'' ضمیر کے یہ دونوں مراجع بیان کئے ہیں لیکن پہلے مرجع کو ترجیح دی ہے۔ ذیل میں بعض مفسرین کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔

امام اسماعیل حقیؒ لکھتے ہیں:

والضمير لما فی السموٰت وما فی الارض لان فيهم العقلاء فغلب من يعقل علی غيره او لما دل عليه من ذامن الملائكة والانبياء فيكون للعقلاء خاصة.(۱)

''اور ضمیر (ھم) ما فی السموٰت وما فی الارض جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے کے لئے ہے کیونکہ ان میں عقل والے رہتے ہیں۔ پس ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر فوقیت حاصل ہے یا یہ ضمیر ''ذا'' کے مدلول ملائکہ اور انباء کے لئے ہے۔ بایں صورت عقل والوں کے ساتھ خاص ہو گی۔''

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں:

قوله تعالیٰ (يعلم مابين ايديهم وما خلفهم) الضمير ان عائد علی كل من يعقل من تضمنه قوله: له مافی السموٰت وما فی الأرض.(۲)

''فرمان خداوندی یعلم مابین ایدیھم و ما خلفھم میں دونوں ضمیریں (ھم)

(۱) اسماعیل حقی، روح البیان، ۱: ۴۳

(۲) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۳: ۲۷۶

ہر اس صاحب عقل کی طرف لوٹتی ہیں جو فرمان خداوندی: ’’لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض‘‘ کے ضمن میں آتا ہے۔

علامہ سید محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں:

وضمير الجمع يعود على ما في (المسوت) الخ الا انه غلب من يعقل على غيره وقيل للعقلاء في ضمنه فلا تغليب و جوز ان يعود على مادل عليه (من ذا) من الملائكة والانبياء وقيل الانبياء خاصة. (۱)

’’جمع کی ضمیر (ھم) **مافی السموت** ...... الخ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے کی طرف لوٹتی ہے مگر ذوی العقول کو غیر ذی العقول پر غلبہ حاصل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر صرف عقلاء کے ساتھ خاص ہے۔ اس طرح اس میں تغلیب کا پہلو نہیں رہتا اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا مرجع ’’من ذا‘‘ کا مدلول ملائکہ اور انبیاء یا صرف انبیاء ہوں۔‘‘

امام ابن جوزیؒ نے ’’ھم‘‘ ضمیر سے مراد جمیع مخلوق ہی لیا ہے۔ وہ آیت کے اس حصے کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں:

(يعلم ما بين ايديهم وما خلفهم) ظاهر الكلام يقتضى الاشارة ولى جميع الخلق. (۲)

’’**یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم** میں ظاہر کلام کا تقاضا ہے کہ (ھم ضمیر کا) اشارہ جمیع خلق کی طرف ہو۔‘‘

متذکرہ بالا اقوال سے معلوم ہوا کہ مفسرین نے پہلے مرجع کو ترجیح دی ہے اور

(۱) آلوسی، روح المعانی، ۳: ۹

(۲) ابن جوزی، زاد المسیر، ۱: ۳۰۳

کہا ہے کہ ضمیر جمع ’’ھم‘‘ اسی آیت کریمہ کے پچھلے کلمات ’’لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض‘‘ کی طرف راجع ہے اور اس سے مراد آسمانوں اور زمین میں موجود وہ تمام مخلوق ہے جسے عقل و شعور کی نعمت ودیعت کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے ان کلمات کا مفہوم یہ ہو گا کہ آسمانوں اور زمین کی تمام عاقل اور باشعور مخلوق کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۔

ما بین ایدیھم وما خلفھم کا مفہوم

اب یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مابین ایدیھم وما خلفھم جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے کئی جواب اور مفہوم ہیں جنہیں مفسرین نے اپنی کتب تفسیر میں بیان کیا ہے۔

پہلا مفہوم

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ما بین ایدیھم سے مراد وہ اُمورِ دنیا ہیں جو اہل بینش کی نظروں کے سامنے گزر چکا ہے اور وما خلفھم سے مراد وہ سب کچھ ہے جو بعد میں ہوگا اور اب اہل عالم کی نظروں سے مخفی و پوشیدہ ہے۔ اس میں وہ سب اُمور شامل ہیں جو اخروی زندگی میں پیش آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان دنیوی احوال کو بھی جانتا ہے جو ان کی نظروں کے سامنے گزر چکے ہیں اور ان اخروی معاملات کو بھی جو ان کی نظروں سے ابھی پوشیدہ ہیں۔

امام ابن جریر طبریؒ اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

یعلم مابین ایدیھم ما ماضی من الدنیا وما خلفھم من الآخرۃ. (۱)

’’ما بین ایدیھم سے مراد ہے وہ دنیوی اُمور ہیں جو گزر چکے ہیں اور وما

(۱) طبری، جامع البیان، ۳:۷

خلفھم سے مراد اُمورِ آخرت ہیں۔''

امام طبریؒ کے دوسرے قول کے مطابق ما بین ایدیھم سے مراد وہ اُمورِ دنیا ہیں جو گزر چکے ہیں اور وما خلفھم سے مراد مخلوق کے بعد والے دنیوی اور اخروی احوال ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

قوله يعلم ما بين ايديهم ما مضى امامهم من الدنيا وما خلفهم ما يكون بعدهم من الدنيا والآخرة. (۱)

''فرمانِ خداوندی یعلم ما بین ایدیھم سے مراد ہے جو کچھ ان کے سامنے اُمورِ دنیا میں گزر چکا ہے اور ما خلفھم سے مراد ہے جو کچھ ان کے بعد کے دنیوی اور اُخروی حالات ہیں۔''

امام رازیؒ نے مجاہد، عطا اور سعدی علیہم الرحمہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

(ما بين ايديهم) ما كان قبلهم من اُمور الدنيا (وما خلفهم) ما يكون بعدهم من امر الاخرة. (۲)

''ما بین ایدیھم سے مراد ہے جو کچھ اُمورِ دنیا میں سے ان سے پہلے گزر چکا ہے اور (وما خلفھم) سے مراد ہے جو کچھ ان کے بعد اَمرِ آخرت میں سے ہے۔''

علامہ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں:

يعلكم ما بين ايديهم اى امر الدنيا (وما خلفهم) اى امر الاخرة. (۳)

---

(۱) طبری، جامع البیان، ۳:۷

(۲) رازی، التفسیر الکبیر، ۷: ۱۰

(۳) آلوسی، روح المعانی، ۳: ۹

www.MinhajBooks.com

’’ما بین ایدیھم جو کچھ ان کے آگے ہے سے مراد امر دنیا ہے اور وما خلفھم جو کچھ ان کے پیچھے ہے سے مراد اَمرِ آخرت ہے۔‘‘

دوسرا مفہوم

دنیا اور آخرت کے لحاظ سے ما بین ایدیھم وما خلفھم کا ایک مفہوم اس سے قبل بیان کردہ مفہوم کے برعکس بھی ہے یعنی مابین ایدیھم جو کچھ ان کے سامنے ہے اس سے مراد آخرت ہے اور وما خلفھم جو کچھ ان کے پیچھے ہے سے مراد وہ سب کچھ ہے جو وہ عالم آخرت میں جانے کے بعد اپنے پیچھے چھوڑ کر آئیں گے اور یہ دنیا ہی ہے جو پیچھے رہ جائے گی۔ امام رازیؒ دوسرے مفہوم کے ذیل میں لکھتے ہیں:

(یعلم ما بین ایدیھم) یعنی الاخرۃ لانھم یقدمون علیھا (وما خلفھم) الدنیا لانھم یخلفونھا وراء ظھورھم.[1]

’’یعلم ما بین ایدیھم سے مراد آخرت ہے کیونکہ وہ آخرت میں آئیں گے اور ماخلفھم سے مراد دنیا ہے کیونکہ وہ اسے اپنی پس پشت چھوڑ آئیں گے۔‘‘

متذکرہ بالا دونوں مفاہیم سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی جمیع مخلوق جو اہلِ عقول ہے۔ دنیوی اُمور و احوال کو بھی جانتا ہے اور ان کے اخروی حالات وواقعات سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے اور اس سے ہم ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

تیسرا مفہوم

’’ما بین ایدیھم‘‘ سے مراد حاضر ومشہود ہے اور اس کا معنی وہ سب کچھ ہے

(۱) رازی، التفسیر الکبیر، ۷: ۱۰

جو آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے یعنی وہ عالم جو ہم بچشم سر دیکھتے ہیں اسے حاضر و مشہود کہتے ہیں۔ اس کے برعکس ’’**وما خلفھم**‘‘ سے مراد غائب ہے کہ جو پیچھے ہوتا ہے اور ہماری نظروں سے اوجھل ہے اسے غائب کہا جاتا ہے۔

امام رازیؒ آیت کے اس حصہ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عطاؒ کا قول نقل فرماتے ہیں جو اُنہوں نے سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(یعلم ما بین ایدیھم) من السماء الی الارض (وما خلفھم) یرید مافی السموٰت. (۱)

’’**یعلم مابین ایدیھم** سے مراد ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمان سے زمین تک ہے اور ’’**وما خلفھم**‘‘ جو کچھ ان کے پیچھے ہے سے مراد ہے جو کچھ آسمانوں کے اندر ہے اللہ اسے بھی جانتا ہے۔‘‘

آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے وہ مخلوق خدا کے لئے حاضر اور مشہود ہے اور جو کچھ آسمانوں کے اندر ہے وہ مستور اور آنکھوں سے غائب ہے۔

امام ابو حیان اندلسیؒ لکھتے ہیں:

مابین ایدیھم ما اظھر وا وما خلفھم ما کتموہ. (۲)

’’**مابین ایدیھم** سے مراد ہے جو کچھ ان کے سامنے ظاہر ہے اور **وما خلفھم** سے مراد ہے جو کچھ ان سے پوشیدہ ہے۔‘‘

اسی حاضر اور غائب کے مفہوم کو امام ابو حیان اندلسیؒ ایک دوسرے انداز میں بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

---

(۱) رازی، التفسیر الکبیر، ۷: ۱۰

(۲) ابو حیان اندلسی، البحر المحیط، ۲: ۲۷۹

ما بين ايديهم الحاضر من افعالهم واحوالهم وما خلفهم ماسيكون. (۱)

”**ما بین ایدیھم**“ سے مراد ہے جو کچھ ان کے افعال و احوال سے حاضر ہے اور ”**و ما خلفھم**“ سے مراد ہے جو کچھ عنقریب واقع ہو گا۔“

اس اعتبار سے ”**ما بین ایدیھم و ما خلفھم**“ کا معنی یہ ہوا کہ جو کچھ مخلوق کے مشاہدے کے لئے حاضر ہے خواہ وہ ان کے افعال ہوں یا احوال۔ اللہ اِسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان کی نظروں سے اوجھل اور غائب وہ اِسے بھی جانتا ہے ۔ یہاں غیوبت اور شہادت دونوں چیزیں پہلو بہ پہلو ہیں۔قرآن مجید میں اللہ رب العزت کی اس شان کا تذکرہ یوں ہوا ہے۔

عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ. (۲)

”غیب اور ظاہر کا علم رکھنے والے۔“

چوتھا مفہوم

”**ما بین ایدیھم**“ سے مراد خلقِ مخلوق سے پہلے کے احوال ہیں ”**ما خلفھم**“ سے مراد خلقِ مخلوق کے وہ احوال ہیں جو بعد میں وقوع پذیر ہوں گے۔

ابو حیان اندلسیؒ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

مابين ايديهم هو ماقبل خلقهم وما خلفهم هو ما بعد خلقهم. (۳)

”**ما بین ایدیھم** سے مراد ہے جو کچھ ان کی تخلیق سے قبل تھا اور ”ما

(۱) ابو حیان اندلسی، البحر المحیط، ۲:۲۷۹
(۲) الزمر، ۴۶:۳۹
(۳) ابو حیان اندلسی، البحر المحیط، ۲: ۲۷۹

خلفھم‘‘ سے مراد ہے جو کچھ ان کی تخلیق کے بعد ہوگا۔‘‘

شیخ اسماعیل حقیؒ نے ’’ما بین ایدیھم‘‘ سے مراد مخلوق کی موت کے بعد پیش آنے والے تمام واقعات لئے ہیں جبکہ ’’ما خلفھم‘‘ سے اُنہوں نے تخلیق سے پہلے جو کچھ تھا وہ مراد لیا ہے۔ وہ اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ما بين ايديهم بعد انقضا اجالهم وما خلفهم اى ماكان قبل ان يخلقهم.(۱)

’’**ما بین ایدیھم**‘‘ سے مراد ہے جو کچھ ان کی اموات کے بعد ہوگا اور ’’**ما خلفھم**‘‘ سے مراد ہے جو کچھ ان کی تخلیق سے پہلے تھا۔‘‘

اِس لحاظ سے ’’**یعلم ما بین ایدیھم و ما خلفھم**‘‘ کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کی تخلیق سے پہلے جو کچھ تھا اسے بھی جانتا ہے اور ان کی تخلیق کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اسے بھی جانتا ہے۔

پانچواں مفہوم

’’**ما بین ایدیھم**‘‘ سے مراد ہے جو کچھ تمہارے علم میں ہے اور **ما خلفھم** سے مراد ہے جو کچھ تمہارے علم میں نہیں۔

علامہ بیضاویؒ اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

يعلم ما بين ايديهم و ما خلفهم او ما يدر كونه وما له يدر كونه.(۲)

”**یعلم ما بین ایدیھم و ما خلفھم** سے مراد ہے کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اور جو کچھ وہ نہیں جانتے سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔‘‘

---

(۱) اسماعیل حقی، روح البیان، ۱: ۲۱۶

(۲) بیضاوی، انوار التنزیل، ۱: ۲۱۶

www.MinhajBooks.com

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ نے بھی یہی مفہوم مراد لیا ہے:

ما یدر کونه وما لا یدر کونه. (۱)

’’جو کچھ وہ جانتے ہیں اور جو کچھ وہ نہیں جانتے سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔‘‘

چھٹا مفہوم

تفسیر روح البیان میں امام اسماعیل حقیؒ نے مذکورہ بالا مفاہیم کے علاوہ ایک اور مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم ان کلمات کی تفسیر صوفیانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

(یعلم) محمد ﷺ ما بین ایدیهم من الامور الاولیات قبل خلق الله الخلائق کقوله (اول ماخلق الله نوری) وما خلفهم من احوال القیامة وفزع الخلق وغضب الرب و طلب الشفاعة من الانبیاء وقولهم نفسی نفسی و حوالة الخلق بعضهم الی بعض حتی بالاضطرار یرجعون الی النبی ﷺ لاختصاصه بالشفاعة. (۲)

’’حضور نبی اکرم ﷺ جانتے ہیں جو کچھ مخلوق سے پہلے ہوا یعنی وہ اُمور جو پہلے ہو گزرے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ابھی مخلوق کو پیدا بھی نہیں فرمایا تھا جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا‘‘ اور ما خلفهم اور جوان کے بعد ہوگا جیسے قیامت کے ہولناک معاملات و احوال، مخلوق کی گھبراہٹ اور اللہ تعالیٰ کا غضب میں ہونا، انبیاء

(۱) قاضی ثناء اللہ، تفسیر المظهری، ۱: ۳۵۸

(۲) اسماعیل حقی، روح البیان، ۱: ۴۰۳

علیہم السلام سے شفاعت کا طلب کیا جانا وران کا نفسی نفسی پکارنا پھر مخلوق کا ایک نبی سے دوسرے نبی کی طرف جانا یہاں تک کہ سخت پریشانی کے عالم میں سرور عالم ﷺ کے حضور باریاب ہونا کیونکہ شفاعت کبریٰ صرف آپ سے ہی مخصوص ہے۔''

مندرجہ بالا پہلے پانچ مفاہیم سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے کہ علم الٰہی کی شان یہ ہے کہ کائنات ارض و سماوات میں جتنی مخلوق آباد ہے اس کے اگلے پچھلے، ظاہری، باطنی تمام حالات نیز ان کی زندگی کے جملہ معاملات اور احوال کا اللہ تعالیٰ کو مکمل علم ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ اس کا یہ علم **من کل الوجوہ** محیط ہے۔

امام ابن کثیرؒ اس پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

(یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم) دلیل علی احاطۃ علمہ بجمیع الکائنات ما فیھا و حاضرھا و مستقبلھا. (۱)

''**یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم** اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام کائنات اور اس کے اندر جو کچھ ہے اور جو کچھ اس کائنات میں حاضر ہے اور جو کچھ اس کائنات کا مستقبل ہے سب پر محیط ہے۔''

امام موصوف کے بقول علمِ الٰہی کی شان یہ ہے کہ وہ جمیع مخلوق کے جملہ معاملات پر کلیتًا حاوی اور محیط ہے۔

امام ابو حیان اندلسیؒ اس موضوع پر لکھتے ہیں:

فالمعنی انہ تعالیٰ عالم سائر احوال المخلوقات لا یعزب عنہ شئ فلا یراد بما بین الایدی ولا بما خلفھم شئ معین کما ذھبوا الیہ. (۲)

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱: ۳۰۹

(۲) ابو حیان اندلسی، البحر المحیط، ۲: ۲۷۹

www.MinhajBooks.com

’’اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کے تمام احوال کو جاننے والا ہے اور اس کے علم سے کوئی شئے بھی غائب نہیں۔ پس ’’جو کچھ سامنے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے‘‘ سے کوئی معین چیز مراد نہیں جیسا کہ جمہور مفسرین کا مؤقف ہے۔‘‘

اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو واقعات پردہ غیب سے ظہور پذیر ہونے والے ہیں وہ سب بلا استثناء اور بغیر کم و کاست اللہ رب العزت کے علم میں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اس شانِ علم کا کما حقہ ادراک کر لیا جائے تو پھر اس فیصلے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ اس خالق کائنات جو علیم و خبیر ہے کی طرف سے کون سا علم مخلوق کے لئے ثابت کیا جا سکتا ہے اور کون سا علم ہے جس کا مخلوق کے لئے اثبات ممکن نہیں۔ اس پر مستزاد یہ تعین کرنا بھی ممکن ہے کہ انسان کے لئے کس علم کے ثابت کرنے سے شرک واقع ہوتا ہے اور کس علم کے ثابت کرنے سے شرک واقع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی شان علم پوری طرح سمجھ لی جائے تو کوئی مسئلہ لاینحل نہیں رہتا اور ہر عقدہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

احاطہ علم کی نفی اور مخلوق کا مرتبہ علم

آگے ارشاد فرمایا:

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ.(۱)

’’اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے۔‘‘

آیہ کریمہ کے پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کے اپنے علم کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ اس کا علم ہر شئے پر حاوی اور محیط ہے۔ اس سے آگے اب اللہ تعالیٰ کی شان علم کے ساتھ مخلوق کے مرتبہ علم کی بات ہو رہی ہے کیونکہ یہاں ولا یحیطون کا فاعل

(۱) البقرۃ، ۲:۲۵۵

انبیاء، ملائکہ اور دیگر جمیع مخلوق ہیں۔

امام اسماعیل حقیؒ ولا یحیطون کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

(ولا یحیطون) ای لا یدرکون یعنی من الملائکة والانبیاء وغیرهم. (۱)

اس سے مطلقاً علم مخلوق کی نفی نہیں بلکہ احاطہ علم کی نفی ہے۔ من علمہ میں ''ہ'' ضمیر کا مرجع ''اللہ'' ہے اور من تبعیض کے لئے ہے اور ''شئ'' پر ''ب'' تبعیض ہے جبکہ شے کے آخر میں آنے والی تنوین تنکیر کا فائدہ دے رہی ہے۔ اب معنی یہ ہوگا وہ اللہ کے علم میں سے کسی معمولی شئے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔

علم اور احاطہ علم میں فرق

علم اور احاطہ علم میں کیا فرق ہے یہ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ علم اور احاطہ علم کے لغوی معانی اچھی طرح سمجھ لئے جائیں۔

العلم ادراک الشئ بحقیقته. (۲)

''کسی شے کی حقیقت کو جاننا علم ہے۔''

الاحاطة ادراک الشئ بکماله ظاهر او باطنا. (۳)

''کسی شے کو ظاہراً باطناً مکمل طور پر جاننا احاطہ کہلائے گا۔''

امام ابو حیان اندلسیؒ لفظ احاطہ کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

(۱) اسماعیل حقی، روح البیان، ۱: ۴۰۳

(۲) راغب اصفهانی، المفردات

(۳) جرجانی، التعریفات: ۳۲

www.MinhajBooks.com

الاحاطة تقتضی الحفوف بالشئ من جمیع جهاته والاشتمال علیه.(۱)

احاطہ کسی شئے کو اس کی تمام جہات اور مشتملات سمیت گھیر لینے کا تقاضا کرتا ہے۔

امام ابن جوزیؒ اس کی شرح یوں بیان کرتے ہیں:

یقال لکل من احرز شیئا اوبلغ علمه اقصاه قد احاطه به.(۲)

''ہراس شخص کے لئے جو کسی شئے کو اپنے علم کے دائرے میں جمع کر لے یا اس کا علم اس شئے کی آخری حدوں تک پہنچ جائے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس شئے کا احاطہ کر لیا ہے۔''

علامہ محمود آلوسیؒ احاطہ علم کا مفہوم ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

الاحاطة بالشئ علما علمه کما هو علی الحقیقة والمعنی لا یعلم احد من هؤلاء کنه شئ ما من معلوماته تعالیٰ (الا بماشاء) ان یعلم.(۳)

''علماً کسی شئے کا احاطہ کرنا اس شئے کی حقیقت کو جاننا ہے اور مذکورہ کلمات کا معنی ہے کہ یہ سب (ملائکہ انبیاء اور دیگر مخلوق) اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے کسی شئے کی کنہ کو نہیں جانتے مگر اتنا جتنا اللہ چاہے کہ وہ جان لیں۔''

علم اور احاطہ کے باہم تقابل سے معلوم ہوا ہے کہ ان دونوں میں فرق ہے کسی شئے کی حقیقت کو جاننا علم اور کسی شئے کی حقیقت کو اس طرح جاننا کہ اس شئے کی حقیقت کا کوئی پہلو کوئی گوشہ کوئی سمت اور کوئی جہت حتی کہ کوئی جزو بھی علم سے کسی وقت بھی خارج

(۱) ابو حیان اندلسی، البحر المحیط، ۲: ۲۷۹

(۲) ابن جوزی، زاد المسیر، ۱: ۳۰۴

(۳) آلوسی، روح المعانی، ۳: ۹

نہ ہو احاطہ علم کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے شانِ علم سے تو نوازتا ہے مگر احاطہ علم فقط اس کی اپنی شان ہے جس میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں اور یہ شان مخلوق میں سے کسی فرد کو بھی حاصل نہیں۔

علمِ محیط خالق کی اور علمِ محاط بندے کی صفت ہے

جس علم میں احاطہ علم کی صفت موجود ہو اسے علم محیط کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے مگر جو علم کل نہ تھا آج آ گیا یا آج نہیں کل آ جائے گا یعنی اس کی حدود وقت کے ساتھ پھیلتی جاتی ہوں وہ علم محاط ہے، یہ مخلوق کی شان ہے۔ اس کی مثال دائرہ سے دی جا سکتی ہے۔ دائرے کے اندر کا کل رقبہ اور چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی محاط ہے جبکہ دائرہ تشکیل دینے والی پرکار سے کھینچی ہوئی لکیر اس کا محیط ہے۔ محاط نسبت کے اعتبار سے کل تو ہوسکتا ہے محیط نہیں ہوسکتا۔ محیط وہ ہے جو محاط کے اوپر ہے اس لئے کل اور جز دونوں محاط کے اندر آسکتے ہیں۔ علم محیط اور علم محاط میں یہ فرق ہے کہ علم محیط اللہ کی شان اور صفت ہے جبکہ علم محاط بندے کی صفت ہے۔ اب علم محاط خواہ پوری ارضی مخلوق کے علم پر حاوی ہو وہ مخلوق کے لئے جائز ہوگا کیونکہ اس کا دائرہ محیط جو کہ علم الٰہی ہے سے متجاوز نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے علم محیط کو یوں بیان فرمایا گیا:

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌo(۱)

''جو کچھ وہ کر رہے ہیں بیشک اللہ اس پر احاطہ فرمائے ہوئے ہےo''

۲۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًاo(۲)

''اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے احاطہ کئے ہوئے ہےo''

---

(۱) آلِ عمران، ۳: ۱۲۰

(۲) النساء، ۴: ۱۰۸

www.MinhajBooks.com

۳۔ وَكَانَ اللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا ○[1]

”اور اللہ ہر چیز کا احاطہ فرمائے ہوئے ہے ○“

۴۔ اِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيطٌ ○[2]

”بیشک میرا رب تمہارے سب کاموں کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے ○“

۵۔ وَّ اَنَّ اللهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ○[3]

”اور یہ کہ اللہ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ فرما رکھا ہے (یعنی آنے والے زمانوں میں جب سائنسی اکتشافات کامل ہوں گے تو تمہیں اللہ کی قدرت اور علمِ محیط کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح اُس نے صدیوں قبل ان حقائق کو تمہارے لئے بیان فرما رکھا ہے) ○“

اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ چونکہ مخلوق کا علم اللہ تعالیٰ کے علم محیط کے دائرے میں شامل ہے اس لئے مخلوق کا علم علم محاط ہوگا۔ مخلوق کے علم کے بارے میں قرآن فرماتا ہے۔

۶۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○[4]

”اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے ○“

۷۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ○[5]

(۱) النساء، ۴: ۱۲۶

(۲) ھود، ۱۱: ۹۲

(۳) الطلاق، ۶۵: ۱۲

(۴) الاسراء، ۱۷: ۸۵

(۵) یوسف، ۱۲: ۷۶

''اور ہر صاحب علم سے اوپر بھی ایک علم والا ہوتا ہے o''

اس میں علم کی حدود اور درجہ بندی کو بیان کیا گیا ہے۔ علم کا سیکھنا ایک ارتقائی عمل ہے۔ ہر صاحب علم کے اوپر درجہ بدرجہ اور علم والے موجود ہوتے ہیں مگر ایک ہی ذات ہے جسے علیم مطلق کہا جا سکتا ہے جسے قرآن حکیم نے اللہ جل شانہٗ کے حوالے سے یوں بیان فرمایا ہے:

۸۔ وَاَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌo(۱)

''اور اللہ ہر چیز سے بہت واقف ہے o''

مخلوق کا علم قلیل ہے اور اپنے اندر تدریج کا پہلو رکھتا ہے اس لئے جو علم قلیل ہو اور تدریجی سطح پر آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ علم، علمِ محیط نہیں ہوسکتا بلکہ ایسا علم، علمِ محاط ہوگا۔

اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خانؒ اپنی کتاب مستطاب میں رقمطراز ہیں:

فعلم المخلوق الحاصل بالفعل وان کثر ما کثر حتی یشمل کل مافی العرش والفرش من اول یوم الی الیوم الاخر والوف الاف امثال ذلک لا یکون قط الامتناھیا بالفعل لان العرش و الفرش حدان حاصران و اول یوم الی الیوم الاخر حدان اخران وما کان محصوراً بین حاصرین لایکون الامتناھیا.(۲)

''مخلوق کا علم اگرچہ کتنا ہی کثیر و بسیار ہو یہاں تک کہ عرش و فرش میں روزِ اول سے روز آخر تک اور اس سے کروڑوں مثل سب کو محیط ہو جائے پھر بھی

(۱) المائدہ، ۵: ۹۶

(۲) الدولة المکیة بالمادة الغیبیه/۲۴

محدود بالفعل ہوگا اس لئے کہ عرش وفرش کے دو کنارے گھیرنے والے ہیں اور روز اوّل سے روزآخر تک یہ دوسری دو حدیں ہوئیں اور جو چیز دو گھیرنے والوں میں گھری ہو وہ نہ ہوگی مگر متناہی۔‘‘

یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ آیۃ الکرسی کے زیرنظر حصے میں بھی اللہ جل شانہٗ نے بشمول انبیاء، صلحاء، ملائکہ اور سب مخلوق کے لئے احاطہ علم کی نفی فرمائی ہے۔ مطلقاً علم کی نفی نہیں فرمائی۔ اگر مخلوق کے لئے مطلق علم کی نفی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ’’ولا یحیطون‘‘ کی بجائے ’’ولا یعلمون‘‘ فرماتا۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ولم یقل ولا یعلمون شیئا تنبیھا علی ان العلم التام المحیط بکنہ الاشیاء کلھا مختص بہٖ تعالیٰ ولا یوجد احاطۃ علم غیرہ بکنہ شئ الا نادرا.(۱)

’’اور یہ نہیں فرمایا ولا یعلمون شیئا اور وہ کسی چیز کو نہیں جانتے اس بات کی طرف متنبہ فرماتے ہوئے کہ تمام اشیاء کی کنہ کا علم تام اور محیط اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے علم کا کسی شئے کی کنہ کو محیط ہونا جزواً بھی نادر الوقوع ہے۔‘‘

مخلوق کے لئے علم کا اثبات ’’الا بما شاء‘‘ سے بھی ہو رہا ہے۔ یہاں پر مخلوق کے لئے نفی علم محیط کی گئی ہے علم محاط کی نہیں، مخلوق کے لئے دونوں ثابت ہیں اس میں کلی محاط بھی اور جزئی محاط دونوں شامل ہیں اور علم کی دونوں سرحدیں محیط علم کو نہیں چھوسکتیں اس لئے کہ ان کا احاطہ کوئی متنفس نہیں کرسکتا۔

---

(۱) قاضی ثناء اللہ، التفسیر المظھری، ۱: ۳۵۸

جزئی علمِ محاط

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے تمام اشیاء کو پیش فرمایا اور حکم دیا:

فَقَالَ اَنۡۢبِئُوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ○[1]

”اور فرمایا: مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو○“

تو فرشتے عرض کرنے لگے:

قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَاؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ○[2]

”فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بیشک تو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہے○“

فرشتوں نے یہ اقرار کر کے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں سے جو علم معلومات تو نے ہمیں عطا کیا ہے ہم صرف وہی جانتے ہیں پس ثابت ہوا کہ اللہ کی معلومات میں سے علم حاصل ہو سکتا ہے البتہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اگر احاطہ ہونا تسلیم کر لیا جائے تو بندہ لامحالہ طور پر اللہ تعالیٰ کی صفت علم میں شریک ہو جائے گا یہ عقیدہ رکھنا کفر اور شرک ہے۔ اس آیہ کریمہ میں علم کا مطلب ہے کہ جو اشیاء امتحان کے لئے پیش کی جا رہی ہیں ان کے بارے میں جتنا علم تو نے ہمیں دیا ہے ہم وہی جانتے ہیں اور جو نہیں دیا وہ نہیں جانتے یہ جزئی علم محاط کی صفت مخلوق کو ارزانی کی گئی ہے۔

(۱) البقرة، ۲: ۳۱

(۲) البقرة، ۲: ۳۲

کلی علمِ محاط

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان تمام اشیاء کی معلومات پہلے ہی عطا فرما دی تھیں جو فرشتوں کے سامنے پیش کی گئیں اور جن کے بارے میں اُنہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا. (۱)

”اور اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام (اشیاء کے) نام سکھا دیئے۔“

اس امر کا مظہر ہے کہ یہاں پر لفظ کل کا اِستعمال حضرت آدم علیہ السلام کو کل اسماء عطا کرنے کی دلیل ہے اور اسے علم محاط کے باب میں کل اثبات کیا جا رہا ہے۔

امام ابن کثیر آیہ مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

الصحيح انه علمه اسماء الاشياء كلها ذواتها و صفاتها و افعالها كما قال ابن عباس حتى الفسوة والفسية عينى ذوات الاسماء وا لافعال المكبر و المصغر. (۲)

”صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے ناموں ان کی شکلوں ان کی خصوصیات اور افعال کا علم عطا فرمادیا تھا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیالی اور پیالے تک کا علم عطا فرمادیا تھا یعنی تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے ناموں اور افعال کا علم عطا فرما دیا تھا۔“

صحیح بخاری میں حدیث شفاعت میں مذکور ہے کہ جب لوگ حضرت آدمؑ کے پاس آئیں گے تو یوں عرض کریں گے:

أنت أدم أبو النّاس خلقک اللہ بيده واسكنک جنته واسجد

(۱) البقرة، ۲: ۳۱

(۲) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱: ۷۳

لک ملائکة وعلّمک أسماء کلّ شيء فاشفع لنا عند ربّک حتّی یریحنا من مکاننا ھذا. الخ.[۱]

''آپ انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا اور آپ کو اپنی جنت میں ٹھہرایا اور اپنے فرشتوں سے آپ کے لئے سجدہ کروایا اور آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے آپ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری شفاعت فرما دیں تاکہ آج اس جگہ سے نجات ملے۔''

اس حدیث مبارکہ میں بھی لفظ کل اِستعمال ہوا ہے اللہ رب العزت نے نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کا علم کلی دینے کی بات کی بلکہ عملی طور پر ان کے بیان کر دینے سے اس کو ثابت بھی کر دیا۔ ارشاد فرمایا:

فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.[۲]

''پس جب آدم (علیہ السلام) نے انہیں ان اشیاء کے ناموں سے آگاہ کیا تو (اللہ نے) فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) مخفی حقیقتوں کو جانتا ہوں۔''

جب حضرت آدم علیہ السلام تمام اشیاء کے بارے میں بیان کر چکے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے علم کو اپنے علم غیب کی دلیل قرار دیتے ہوئے فرشتوں پر یہ واضح فرما دیا کہ میں عالم الغیب ہوں یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں جس کو جتنا چاہتا ہوں دے دیتا ہوں۔ تمہیں علم محاط کے درجے میں نے جزئی علم دے دیا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کو علمِ محاط کے درجے میں کلی علم عطا کر دیا۔ دونوں صورتوں میں شرک نہ ہوا کیونکہ ان دونوں درجوں پر میرا علم

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالی: وجوہ یومئذ ناضرة إلی ربھا ناظرة، ۶: ۲۷۰۸، رقم: ۷۰۰۲

(۲) البقرة، ۲: ۳۳

محیط اور حاوی ہے میرا علم ہر جز پر اسی طرح محیط ہے جس طرح وہ محاط والے کلی علم پر محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے محاط کے درجے میں جزئی علم عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محاط کے درجے میں کلی علم سے نواز دیتا ہے اور یہ سارے کل اور جز مل کر بھی اللہ کی شان علم کے مقابلے میں اس کی معلومات کے جز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تمثیل

اس کی مثال یوں ہے کہ اللہ پاک اولیاء کو جو علمِ محاط عطا کرتا ہے وہ سارے کا سارا علم مل کر بھی انبیاء علیہم السلام کے علم کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے سات سمندروں کے مقابلے میں ایک قطرہ در آنحالیکہ ان کا علم بعضوں کی نسبت سے کل ہوگا اور اولیاء کا علم محاط کے درجے میں کل ہو کر بھی انبیاء کے علم کے مقابلے میں جز رہے گا اور تمام انبیاء کا علم اپنی اپنی سطح اور مرتبے پر کل ہو کر بھی علم مصطفیٰ ﷺ کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے سات سمندروں کے مقابلے میں ایک قطرہ اور حضور ﷺ کا علم محاط کے درجے میں انبیاء علیہم السلام کی طرف سے کل ہو کر بھی علمِ الٰہی کے مقابلے میں ایسے ہی ہے جیسے سات سمندروں کے مقابلے میں ایک قطرہ ہو۔ سمندروں کی مثال سمجھانے کی غرض سے ہے ورنہ ''لیس کمثلہ شئ'' اللہ تعالیٰ کسی تمثیل سے پاک ہے۔ کوئی تشبیہہ اور کوئی استعارہ اس کی مثلیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ معلوماتِ الٰہیہ میں سے کسی معلوم کا احاطہ مخلوق کے لئے ممکن نہیں لیکن اگر وہ علم محاط ہو تو ذاتِ باری تعالیٰ جتنا چاہے عطا فرما دے اس کی عطا پر کوئی قدغن نہیں 'الا بماشاء' میں کلمہ ما عام ہے اللہ ایک دانے سے لے کر کروڑوں، عربوں، کھربوں دانوں پر بھی ما کا اطلاق ہوتا ہے۔ علم محیط کسی کو عطا نہیں کیا جاتا جبکہ علم محاط عطا تو ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے وہ اپنی معلومات کے سمندر میں سے جتنا چاہے عطا کر دے، دست قدرت سے کسی کو چلو بھر عطا کر دے کسی کو چاہے تو سمندر عطا کر دے یہ اس کی شانِ کریمی ہے۔

علمہٖ کا مفہوم

قرآن مجید نے ارشاد فرمایا:

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ.(۱)

’’وہ اللہ کے علم میں سے کسی شئے کا احاطہ نہیں کرتے۔‘‘

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ’’علمه‘‘ سے کیا مراد لیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر ’’علمه‘‘ کے تین معانی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

پہلا معنی: معلوماتِ الٰہیہ

ولا یحیطون بشیٔ من علمه میں ’’علمه‘‘ سے وہ معلومات الٰہیہ مراد ہیں جن کی نوعیت اور جامعیت کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ اکثر مفسرینِ کرام نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔

۱۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

المراد بالعلم ههنا المعلوم والمعنی ان احدا لا یحیط بمعلومات اللہ تعالٰی.(۲)

’’یہاں پر علم سے مراد معلوم ہے اور معنی آیت یہ ہے کہ کوئی اللہ تعالٰی کی

(۱) البقرة، ۲: ۲۵۵

(۲) رازي، التفسير الكبير، ۷: ۱۱

www.MinhajBooks.com

معلومات کا احاطہ نہیں کرتا۔‘‘

۲۔ امام قرطبیؒ لکھتے ہیں:

العلم هنا بمعنى المعلوم اى ولا يحيطون بشى من معلوماته.[1]

’’یہاں علم بمعنی معلوم ہے یعنی وہ معلومات الٰہیہ میں سے کسی شئے کا احاطہ نہیں کرتے۔‘‘

۳۔ امام ابن جوزیؒ لکھتے ہیں:

والمراد بالعلم هاهنا المعلوم.[2]

’’یہاں پر علم سے مراد معلوم ہے۔‘‘

۴۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا يحيطون بشى من علمه اى معنى معلوماته.[3]

’’اور وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں سے یعنی معلومات میں سے کسی شئے کا احاطہ نہیں کرتے۔‘‘

معلومات کا معنی مفسرین نے بایں طور کیا ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کی صفت قائمہ ہے اور اسے صرف اللہ رب العزت کے ساتھ ہی خاص کیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کی تبعیض ممکن نہیں یعنی اس کے علم کا کوئی جز نہیں ہوسکتا اس لئے کہ جز صرف معلومات کا ہوتا ہے اور آگے الا بماشاء مگر جس قدر اللہ چاہے کی صورت میں جو حرفِ استثناء آیا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کی صفت قائمہ ہے، اس

---

(۱) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۲: ۲۷۶

(۲) ابن جوزی، زاد المسیر، ۱: ۳۰۴

(۳) قاضی ثناء اللہ، التفسیر المظهری، ۱:۳۵۸

میں مخلوق میں سے کسی کے لئے استثناء نہیں ہو سکتا۔

امام رازیؒ نے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم کے اثبات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

احتج بعض الاصحاب بهذه الاية فی صفة العلم لله تعالیٰ وهو ضعيف لوجوه احدها انكلمة "من" للتبعيض وهی داخلة ههنا علی العلم، فلوكان المراد من العلم نفس الصفة لزم دخول التبعيض فی صفة الله تعالیٰ وهو محال (والثانی) ان قوله (بمايشاء) لا ياتی فی العلم انما ياتی فی العلوم (والثالث) ان الكلام انما واقع ههنا فی المعلومات والمراد انه تعالیٰ عالم بكل المعلومات والخلق لايعلمون كل المعلومات بل لا يعلمون منها الا القليل.(۱)

''کچھ علماء نے اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم کو ثابت کیا ہے اور یہ قول ان وجوہات کی بناء پر ضعیف ہے پہلا یہ کہ کلمہ ''من'' جزئیت کے لئے آتا ہے اور یہاں یہ کلمہ علم پر داخل ہے۔ اگر یہاں علم سے مراد نفس صفت لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی صفت میں جو جزئیت لازم آئے گی جو کہ محال ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان الا بما شاء (استثناء) کا اطلاق صفت علم پر نہیں ہوسکتا بلکہ معلومات پر ہوگا۔ تیسرے یہ کہ یہاں پر کلام معلومات کے لئے وارد ہوا ہے جس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کا جاننے والا ہے اور مخلوق تمام معلومات کو نہیں جانتی بلکہ وہ تو اس میں سے بہت ہی کم جانتی ہے۔''

علمہ کے پہلے معنی کے لحاظ سے ''**ولا يحيطون بشی من علمه الا بما**

(۱) رازي، التفسير الكبير، ۷: ۱۱

شاء،، کا معنی ہوگا کہ وہ معلوماتِ الٰہیہ میں سے کسی شئے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہتے ہیں اس پہلے معنی سے اللہ تعالیٰ کی جمیع معلومات اور علم محیط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ذاتِ الٰہی معلوم نہیں علیم ہے

معلوم وہ ہوسکتا ہے جو علم کے احاطہ میں ہو۔ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کے علم کے احاطہ میں ہے اس لئے وہ معلوم کا درجہ رکھتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی کے علم کے احاطہ میں نہیں لہٰذا اس کے لئے معلوم نہیں کہا جائے گا۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ○[(۱)]

’’اور وہ (اپنے) علم سے اس (کے علم) کا احاطہ نہیں کر سکتے ○‘‘

یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات معلوم نہیں تو پھر وہ کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے اور یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ وہ ذات علیم ہے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○[(۲)]

’’اور اللہ ہر چیز سے بہت واقف ہے ○‘‘

دوسری جگہ پر فرمایا:

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○[(۳)]

(۱) طٰہٰ، ۲۰: ۱۱۰

(۲) المائدۃ، ۵: ۹۷

(۳) الحجر، ۱۵: ۸۶

”بیشک آپ کا رب ہی سب کو پیدا فرمانے والا، خوب جاننے والا ہےo“

جب بھی ذات باری تعالیٰ کی بات ہوگی اس کے لئے لفظ معرفت بولا جائے گا کیونکہ مخلوق کو ذاتِ خدا کا علم نہیں بلکہ معرفت نصیب ہوتی ہے۔

علم اور معرفت میں فرق

علم جاننا اور معرفت پہچاننا ہے۔ علم کی تعریف پہلے بیان ہوچکی اور معرفت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

المعرفة والعرفان ادراک الشی بتفکر وتدبر لاثرہ وھو اخص من العلم ویضادہ الانکار ویقال فلان یعرف اللہ ولا یقال یعلم اللہ.[1]

”معرفت اور عرفان کے معنی ہیں کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر کر کے اس کا ادراک کر لینا۔ یہ علم سے اخص ہے یعنی کم درجہ رکھتا ہے اور یہ الانکار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے **فلان یعرف اللہ** تو کہا جاتا ہے مگر **فلان یعلم اللہ** اِستعمال نہیں ہوتا۔“

چونکہ ذات باری تعالیٰ وہ ہستی ہے جس کا علم نہیں بلکہ معرفت حاصل ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کا بن دیکھے مان لیا جانا ہی عقیدہ توحید کی اساس ہے اور یہی ایمان بالغیب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی نسبت سوچنے اور غور و فکر کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے اس لئے یہ تلقین کی گئی ہے۔

تفکّروا فی آلاء اللہ ولا تفکّروا في ذات اللہ.[2]

---

(۱) المفردات فی غریب القرآن: ۲۳۰

(۲) الجامع الصغیر، ۱: ۱۳۲

”اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کیا کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر نہ کیا کرو۔“

خدا تعالیٰ کی ذات میں سوچنا اور تفکر کرنا گمراہی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ وہ ذات معلوم نہیں بلکہ علیم ہے۔ جو معلوم ہو وہ محاط ہوتا ہے اور جو علیم ہو وہ محیط ہوتا ہے اور تصور اس کا کیا جا سکتا ہے جو تصور کے احاطے میں آ سکے اور وہ ذات جو تصورات کی رسائی سے بلند اور ماوراء ہو بلکہ تصورات پر بھی محیط ہو تو پھر اس کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کا علم نہیں بلکہ معرفت حاصل ہوتی ہے اور معرفت کا حصول علامتوں اور نشانیوں سے ممکن ہوتا ہے۔اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کو براہِ راست نہیں جانا جا سکتا بلکہ اس کی پہچان کسی ذریعہ سے ممکن ہے کیونکہ اگر اس کا علم ہونا ممکن ہوتا تو براہِ راست ہوجاتا۔ چونکہ اس کی معرفت ہوتی ہے اور معرفت براہِ راست نہیں بلکہ ذرائع، وسائل اور مظاہر سے ہوتی ہے اس لئے اس کی ذات کے جلوے کسی میں چمکتے اور منعکس ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے جلووں کو دیکھ کر ہی اس کی خبر ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں ذاتِ باری تعالیٰ کے اثبات میں ارشاد فرمایا گیا:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ. (۱)

”ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں اور خود اُن کی ذاتوں میں دِکھا دیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی حق ہے۔“

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (۲)

(۱) حم السجدۃ، ۴۱: ۵۳

(۲) الذاریات، ۵۱: ۲۱

’’اور خود تمہارے نفوس میں (بھی ہیں)، سو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۝‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی معرفت کسی کو براہِ راست نہیں ہوسکتی بلکہ وہ اسے اس کے اندر سے ملے گی یا خارج سے ملے گی۔ اب جو شخص درمیانی واسطے اور ذریعے کا انکار کرکے خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہے تو اس کا حال یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا علم تو اس کے لئے پہلے ہی ناممکن تھا۔ اب معرفت کے دروازے بھی اس پر بند ہوگئے۔ معرفت کے لئے واسطہ شرط ہے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ واسطہ مخلوق کا ہوتا ہے خالق کا نہیں کیونکہ خالق تو مقصود ہے۔

تمثیل

اس کو ایک مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ آپ کسی شہر جانا چاہتے ہیں تو وہ شہر واسطہ نہیں بلکہ آپ کا مقصود ہوگا۔ یاد رہے کہ واسطہ ہمیشہ درمیان میں ہوتا ہے اور مقصود تک پہنچنے کے لئے واسطے سے کما حقہ آگاہی حاصل کرنا لازمی و لابدی اَمر ہے۔ اگر واسطے کا پتہ چل جائے تو مقصود تک پہنچنے کے راستے معلوم ہو جائیں گے اور وہاں تک رسائی میں کوئی مشکل حائل نہیں ہوگی۔ اس تمثیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت کے لئے درمیانی واسطہ لازمی ہے اور وہ واسطہ مخلوق ہے۔ اب جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ بندے اور خالق کے مابین جو کچھ ہے وہ واسطہ ہے اور جو کوئی اللہ کی معرفت حاصل کرنا چاہے اسے چاہیے کہ وہ اللہ کے بتلائے ہوئے واسطوں میں سے کوئی واسطہ اپنائے اور سب سے بہتر واسطہ وہ ہوتا ہے جو اللہ سے زیادہ قریب ہو۔ دریا، پہاڑ، سمندر، میدان اور دیگر مظاہر فطرت اور مخلوقات بہتر واسطے ہیں لیکن ان سے بھی بہتر واسطے اولیاء و اصفیاء ہیں اور ان سے بھی زیادہ بہتر واسطے خالق تک رسائی کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام میں حضور ﷺ کی ذات ستودہ صفات بہترین واسطہ ہیں کہ جہاں جا کر سارے واسطے ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی اور واسطے کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے جتنا زیادہ گہرا اور دائمی تعلق استوار ہوگا اتنی

زیادہ اللہ کی معرفت نصیب ہوگی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی:

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

معلوماتِ الٰہیہ کا علم

علم اور احاطۂ علم کے فرق اور ''اِلّا بما شاء'' کے استثناء سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات کا احاطہ ممکن نہیں۔ اب جہاں تک معلوماتِ الٰہیہ کے علم تک رسائی کا تعلق ہے وہ رب ذو الجلال کی عطاء سے مخلوق کو حاصل ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ معلوماتِ الٰہیہ کا علم کسی کو تھوڑا نصیب ہوتا ہے اور کسی کو زیادہ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

علمہٖ کا دوسرا معنی: علم غیب

''ولا یحیطون بشیٔ من علمہ'' میں لفظ ''علمہ'' کا ایک معنی اللہ تعالیٰ کا علم خاص بھی ہے اور علم خاص سے مراد علم غیب ہی ہے۔

۱۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں:

والمراد بعلمه العلم المختص به وهو الغيب فهم لا يحيطون بشئ من علم الغيب.[۱]

''علمہ سے مراد وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور وہ علم غیب ہے پس وہ علم غیب کا احاطہ نہیں کرتے۔''

۲۔ علامہ سید محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں:

(۱) قاضي ثناء الله، تفسير المظهری، ۱: ۳۵۸

وجوز أن یراد من علمه معلومه الخاص وهو کل ما في الغیب.[1]

''اور جائز ہے کہ **علمه** سے اللہ تعالیٰ کا معلوم خاص مراد لیا جائے اور معلوم خاص وہ سب کچھ ہے جو غیب کے ضمن میں آتا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ کے علم غیب سے مراد اس کا علم ذاتی ہے اور علم غیب ذاتی اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کہ کوئی دوسرا اس میں اس کا ساجھی اور حصہ دار نہیں۔

علامہ سید محمود آلوسیؒ آگے فرماتے ہیں:

وعطفت هذه الجملة علی ماقبلها لمغایرتها له، لأنّ ذلک یشعر بانه سبحانه یعل کل شئ وهذه تفید انه لا یعلمه غیره ومجموعها دال علی تفرده تعالیٰ بالعلم الذاتی الذی هو من اصول صفات الکلمال التی یجب ان یتصف الاله تعالیٰ شانه بالفعل.[2]

''اور اس جملے کا عطف بوجہ مغائرت پہلے جملے پر ہے کیونکہ پہلے جملہ **(یعلم ما بین ایدیهم الخ)** کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کو جانتا ہے اور اس جملے کا مفہوم ہے کہ اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے اس علم ذاتی پر دلالت کرتے ہیں جو اس کی ان صفات کمالیہ میں سے ہے جن کے ساتھ وہ بالفعل متصف ہے۔''

۳۔ علامہ بیضاویؒ اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وعطفه علی ما قبله لان مجموعهما یدّل علی تفرده بالعلم الذاتي التام الدال علی وحدانیته.[3]

---

(۱) آلوسی، روح المعانی، ۳:۹

(۲) آلوسی، روح المعانی، ۳:۹

(۳) بیضاوی، أنوار التنزیل، ۱: ۲۱٦

’’اس جملے کا عطف ماقبل پر ہے کیونکہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے اس علم ذاتی تام کے ساتھ متفرد ہونے پر دلالت کرتے ہیں جو اس کی وحدانیت پر دال ہیں۔‘‘

۴۔ امام محمد العمادیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وعطفه علی ماقبله لما انهما جميعا دليل علی تفرده تعالی بالعلم الذاتی التام الدال علی وحدانيته. (۱)

’’اور اس جملے کا عطف ماقبل پر ہے کیونکہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے اس علم ذاتی تام کے ساتھ مخصوص ہونے پر دلالت کرتے ہیں جو اسکی وحدانیت پر دال ہیں۔‘‘

۵۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں:

والواو فی ولا يحيطون اما للحال من فاعل يعلم ما بين ايديهم او للعطف وانما ذکر بالعطف لان مجموع الجملتين يدل علی تفرده بالعلم الذاتی التام المحيط باحوال خلقه الدال علی وحدانيته. (۲)

’’اور ولا یحیطون میں واؤ یا تو یعلم کے فاعل سے حال کے لئے ہے یا عطف کے لئے ہے۔ عطف کے لئے اس لئے مذکور ہے کہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے اس علم ذاتی تام کے ساتھ مختص ہونے پر دلالت کرتے ہیں جو اس کی تمام مخلوق کے احوال کو محیط ہے اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتا ہے۔‘‘

مندرجہ بالا تفاسیر کی روشنی میں یہ معلوم ہوا ہے کہ علمه سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ علمِ غیب ذاتی ہے جو محیط بالکل ہے۔ اس کی ذات کا خاصہ اور اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

(۱) العمادی، تفسیر أبی السعود، ۱: ۲۴۸

(۲) قاضی ثناء اللہ، تفسیر المظهری، ۱: ۳۵۸

علمِ غیب عطائی کا جواز و ثبوت

زیرِ نظر آیت میں مخلوق کے لئے نفی کا اطلاق اسی ذاتی علمِ غیب پر ہوتا ہے نہ کہ علمِ غیب عطائی پر بلکہ اس کا الّا بما شاء کے ساتھ اثبات ہو رہا ہے۔

۱۔ امام بغویؒ لکھتے ہیں:

(ولا یحیطون بشیٔ من علمه) أی من علمه اللہ (الّا بما شاء) أن یطلعهم علیه یعنی لا یحیطون بشیٔ من علم الغیب الّا بما شاء مما أخبر به الرّسل کما قال اللہ تعالٰی: ﴿فَلَا یُظۡهِرُ عَلٰی غَیۡبِهٖۤ اَحَدًاo اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ﴾.(۱)

’’اور وہ اس کی یعنی اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے اس پر انہیں مطلع فرما دے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ علمِ غیب میں سے کسی شیئے کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے اس میں سے اپنے رسولوں کو خبر دے دے جیسا کہ فرمایا: ’’پس وہ اپنے غیب پر کسی (عام شخص) کو مطلع نہیں فرماتاo سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے (اُنہی کو مطلع علی الغیب کرتا ہے کیوں کہ یہ خاصۂ نبوت اور معجزۂ رسالت ہے)۔‘‘

۲۔ امام رازیؒ الّا بما شاء کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

أما قوله: ’’إلّا بما شاء‘‘ ففیه قولان: (أحدهما) أنّهم لا یعلمون شیئا من معلومات إلّا ما شاء هو أن یعلمهم کما حکي عنهم قالوا: ﴿لَا عِلۡمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا﴾ والثاني: أنّهم لا یعلمون الغیب إلّا عند إطلاع اللہ بعض أنبیائه علی بعض الغیب کما قال:

(۱) بغوی، معالم التنزیل، ۱: ۲۳۹

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾.(۱)

’’اللہ تعالیٰ کے فرمان ’’الّا بما شاء‘‘ کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے کچھ نہیں جانتے مگر اس قدر جتنا اللہ انہیں علم عطا فرما دے جیسا کہ فرشتوں نے عرض کیا: ’’ہمیں کچھ علم نہیں مگر اِسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔‘‘ اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ غیب کو نہیں جانتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ بعض انبیاء کو بعض غیب پر مطلع فرما دے جیسا کہ فرمایا: ’’(وہ) غیب کا جاننے والا ہے، پس وہ اپنے غیب پر کسی (عام شخص) کو مطلع نہیں فرماتا○ سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے (اُنہی کو مطلع علی الغیب کرتا ہے کیوں کہ یہ خاصۂ نبوت اور معجزۂ رسالت ہے)۔‘‘

آیت کی متذکرہ بالا شرح سے معلوم ہوا کہ یہاں پر نفی علم غیب ذاتی کی ہے، مطلق علم اور اطلاع علی الغیب کی نفی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ رسولوں کو اپنی معلومات میں سے بھی جتنا چاہے علم عطا کرتا ہے اور غیب پر بھی مطلع فرماتا ہے۔

علمہٖ کا تیسرا معنی: علم بمعنی اسم مصدر

تیسرے معنی کی رو سے لفظ ’’علم‘‘ اسم مصدر ہے اور علمہ (اس کا علم) کی اضافت کا معنی ہے ’’إنّ العلم کلّه لله تعالیٰ‘‘ یعنی علم سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ علمہ اس لئے فرمایا کہ واضح ہو جائے کہ عالَم کا مالک اللہ ہے اور حقیقتاً اور اصلاً ایسا ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو علم حاصل نہیں۔ علامہ سید محمد حسین طبا طبائیؒ لکھتے ہیں:

ولا یحیطون بشيء من علمه إلّا بما شاء علی تقدیر أن یراد بالعلم المعنی المصدری أو معنی اسم المصدر. دلالة علی أن العلم

(۱) رازی، التفسیر الکبیر، ۷:۱۱

کلّہ للہ ولا یوجد من العلم عند عالم إلّا وھو شئ من علمہ تعالیٰ.[1]

’’ولا یحیطون بشی من علمہ میں علم سے مراد معنی مصدری یا اسم مصدر ہے۔ اس چیز پر دلالت کرنے کی وجہ سے کہ علم سارے کا سارا اللہ کے لئے ہے اور کسی عالم کے پاس علم نہیں پایا جا سکتا مگر یہ کہ وہ اللہ ہی کے علم کا پرتو ہے۔‘‘

’’ولا یحیطون بشئ من علمہ‘‘ میں مخلوق کے لئے اس علم کی نفی کی جا رہی ہے کہ جو علم اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے اس کے ایک ذرّے کا بھی کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ ’’ولا یحیطون بشیءٍ من علمہ‘‘ کا معنی یہ ہوا کہ از خود کوئی عالم نہیں ہوسکتا یا ازخود کوئی علم پر متصرف نہیں ہوسکتا۔ الا بماشاء اس استثناء کا معنی ہوگا ولا یوجد من العلم عند حال الا وھو شیء من علمہ تعالی کہ کوئی شخص اصلاً اور حقیقتاً علم نہیں رکھتا کہ علم سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ ہی کے پاس ہے مگر مخلوق میں سے جس کے پاس جتنا علم ہے وہ اللہ ہی کا علم ہے۔ وہ اِسی کے علم کا پرتو ہے۔ اس معنی کو ملحوظ رکھا جائے تو یہاں علم کی تقسیم کی نفی کی جا رہی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور یہ مخلوق کا علم ہے بلکہ یوں کہا جائے گا کہ علم کا مالک فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور مخلوق کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے ہی علم کا مظہر اور پرتو ہے۔

صفاتِ الٰہیہ کی شانِ مظہریت

اللہ تعالیٰ اپنے مقبول اور پسندیدہ بندوں کو اپنی صفات کی مظہریت سے متصف کر دیتا ہے۔ ان پر اپنی صفاتی تجلیات کا پرتو ڈالتا ہے جس کو جتنا پرتو نصیب ہوتا ہے اِسے اتنی ہی بلند شان حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس شان کی بہت سی مثالیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

(۱) حسین طباطبائی، المیزان، ۲:۳۳۵

ا۔ مظہرِ عزت

عزت صرف اللہ کے لئے ہے، قرآن حکیم فرماتا ہے:

اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًاؕ (۱)

’’کیا یہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں؟ پس عزت تو ساری اللہ (تعالیٰ) کے لئے ہےo‘‘

اس آیت کریمہ میں اُسلوب استفہام انکاری کا ہے جس سے حصر اور قصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ یہ سوال کہ کیا وہ کافروں کے پاس عزت تلاش کرنے کے لئے جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ آیت کے اگلے حصے فانّ العزّۃ میں حرف ’’فا‘‘ تاکید کے لئے ہے اور ’’انّ‘‘ بھی تاکید کے لئے اور یہ جملہ اسمیہ ہے جس میں دوام اور استمرار کا معنی پایا جاتا ہے کہ عزت جب اللہ کے لئے ثابت ہے تو ازل سے ابدالآباد تک اسی کے لئے ثابت ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک لمحے کے لئے بھی عزت کسی اور کے لئے ثابت ہو اور ’’جمیعا‘‘ تاکید کی پانچویں صورت ہے کہ ساری کی ساری عزت کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں پانچ تاکیدوں کے ساتھ یہ واضح فرمادیا کہ عزت صرف اور صرف اس کا خاصہ ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب وسنت میں انبیاء و رسل، والدین، اولیاء، علماء، صلحاء اور اکابرین اُمت کو لائق عزت قرار دیا گیا۔ قرآن حکیم میں اللہ کے رسول اور مومنین کے لئے عزت کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ. (۲)

’’حالانکہ عزّت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے رسول (ﷺ) کے لئے

(۱) النساء، ۴: ۱۳۹

(۲) المنافقون، ۶۳: ۸

اور مومنوں کے لئے ہے مگر منافقین (اس حقیقت کو) جانتے نہیں ہیں o‘‘

اس آیت کے مطابق عزت اللہ جل شانہ کے علاوہ اس کے رسول ﷺ اور مومنوں کے لئے بھی ثابت ہو رہی ہے۔ بظاہر متذکرہ بالا دونوں آیات میں تعارض اور تناقض نظر آ رہا ہے حالانکہ ایسا حقیقت میں نہیں ہے کیونکہ کلامِ الٰہی ہر قسم کے تضاد، تعارض اور تناقض سے مبرا ہے۔ ذرا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان آیات کا مفہوم ذاتی اور عطائی کے طور پر لیا جا سکتا ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌo(۱)

’’اور تُو جسے چاہے عزت عطا فرما دے اور جسے چاہے ذلّت دے، ساری بھلائی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے، بیشک تُو ہر چیز پر بڑی قدرت والا ہے o‘‘

اشتراکِ لفظی سے غلط فہمی کا ازالہ

مذکورہ آیات کی رُو سے عزت اللہ تعالیٰ کی ذاتی جبکہ بندے کی عطائی صفت ہے لیکن اگر ان آیات کو علمہ کے تیسرے معنی کے تناظر میں دیکھا جائے تو ذہن میں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک طرف حصر اور قصر کے ساتھ عزت کو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کر دینے کے بعد دوسری طرف اللہ کے رسول اور مومنین کو بھی عزت کا حصہ دار بنا دیا جائے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا جائے کہ اللہ جسے چاہتا ہے عزت سے سرفراز کرتا ہے اور جسے چاہے ذلت سے نامراد کرتا ہے تو متذکرہ بالا آیت میں حصر اور قصر کا اِستعمال چہ معنی دارد؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت عزت کا مالک اللہ ہی ہے اور اصلاً و واقعتاً عزت اِسی کے لئے خاص ہے مگر دنیا جہان میں جس کسی کو بھی عزت ملتی ہے اور اللہ رب العزت ہی کی عزت کا پرتو اور مظہر ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ معز بھی ہے اور مذل بھی جس پر

(۱) آل عمران، ۳: ۲۶

اللہ کی شانِ معزیت کا پرتو پڑتا ہے وہ صاحب عزت ہو جاتا ہے اور جس پر اس کی مذلیت کا پرتو پڑتا ہے وہ صاحب ذلت ہو جاتا ہے۔

۲۔ مظہرِ قوت

تمام قوتوں کا سرچشمہ اور مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا. (۱)

’’ساری قوتوں کا مالک اللہ ہےo‘‘

مگر ہم علی وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ انسانوں اور جنات کو بھی بے پناہ قوت حاصل ہے۔ اس کی ایک مثال سیدنا سلیمان علیہ السلام کے استفسار پر آپ کے درباریوں کا یہ جواب دینا ہے:

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ. (۲)

’’انہوں نے کہا: ہم طاقتور اور سخت جنگجو ہیں۔‘‘

اور تختِ بلقیس کی منتقلی کے سلسلے میں دربارِ سلیمانی کا ایک جن یوں عرض گذار ہوا۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌo (۳)

’’ایک قوی ہیکل جن نے عرض کیا: میں اسے آپ کے پاس لاسکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں اور بیشک میں اس (کے لانے) پر طاقتور (اور) امانتدار ہوںo‘‘

(۱) البقرۃ، ۲: ۱۶۵
(۲) النمل، ۲۷: ۳۳
(۳) النمل، ۲۷: ۳۹

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ حقیقتاً اور اصلاً قوت کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور دنیا میں جو قوت مخلوق کے پاس نظر آ رہی ہے یہ یا تو دوسرے معنی کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے یا پھر تیسرے معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہی کی قوت کا پرتو اور مظہر ہے۔

۳۔ مظہرِ خیر

خیر کا مالک اللہ تعالیٰ ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بِیَدِکَ الْخَیْرُ.(۱)

’’ساری بھلائی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے۔‘‘

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا.(۲)

’’اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہوگئی۔‘‘

اصلاً خیر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اس کے حکم سے بندوں کو اس صفتِ خیر کا مظہر بنا دیا جاتا ہے۔

۴۔ مظہرِ سمع و بصارت

اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے، ارشاد ربانی ہے:

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُo(۳)

(۱) آلِ عمران، ۳: ۲۶

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۶۹

(۳) بنی اسرائیل، ۱۷: ۱

’’بیشک وہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔‘‘

اس آیت کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سمیع و بصیر ہے کوئی اور نہیں۔ دوسرے مقام پر بندے کے بارے میں خود ہی فرمایا:

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ○[۱]

’’پس ہم نے اسے (ترتیب سے) سننے والا (پھر) دیکھنے والا بنایا ہے ○‘‘

تو معنی یہ ہوا کہ بندے کا سمیع و بصیر ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی شان کا پرتو ہے جو بندے میں ظاہر ہو رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بندے کی یہ صفت بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ مظہریت لئے ہوئے ہے۔

۵۔ مظہرِ شہادت

اللہ تبارک وتعالیٰ کو شہید یعنی مشاہدہ کرنے والا کے صفاتی نام سے پکارا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا○[۲]

’’بیشک اللہ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے○‘‘

قرآنِ حکیم میں حضور نبی اکرم ﷺ کے لئے بھی شہید کا لقب وارد ہوا، ارشادِ ربّانی ہے:

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ.[۳]

---

(۱) الانسان، ۷۶: ۲
(۲) النساء، ۴: ۳۳
(۳) الحج، ۲۲: ۷۸

’’اس (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، اس سے پہلے (کی کتابوں میں) بھی اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ یہ رسولِ (آخر الزماں ﷺ) تم پر گواہ ہو جائیں اور تم بنی نوع انسان پر گواہ ہو جاؤ۔‘‘

حضور نبی اکرم ﷺ کا شہید ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ شہادت کا مظہر ہے۔

۶۔ مظہرِ رافت و رحمت

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت روف و رحیم بھی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ اللهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ○ (۱)

’’بیشک اللہ تمام انسانوں کے ساتھ نہایت شفقت فرمانے والا بڑا مہربان ہے‘‘○

اور حضور نبی اکرم ﷺ کے لئے بھی قرآن مجید میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ○ (۲)

’’بیشک تمہارے پاس تم میں سے (ایک باعظمت) رسول (ﷺ) تشریف لائے۔ تمہارا تکلیف و مشقت میں پڑنا ان پر سخت گراں (گزرتا) ہے۔ (اے لوگو!) وہ تمہارے لئے (بھلائی اور ہدایت کے) بڑے طالب و آرزومند رہتے ہیں (اور) مومنوں کے لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں‘‘○

بلاشبہ حضور نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کی شانِ رافت و رحمت کے مظہر اتم ہیں۔

(۱) الحج، ۲۲: ۶۵

(۲) التوبۃ، ۹: ۱۲۸

ان تمام آیاتِ مذکورہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس صفت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محصور کیا گیا ہے وہ صفت بندے میں صفتِ الٰہی کا پرتو بن کر ظاہر ہوتی ہے گویا بندہ اسی صفتِ الٰہیہ کا مظہر ہوتا ہے۔ اس طرح آیاتِ حصر میں حصر کا مفہوم برقرار رہتا ہے اور بندے میں وہ صفت اللہ تعالیٰ کا مظہر قرار پاتی ہے۔

ہر گل میں ہر شجر میں اسی کا ظہور ہے

تمام صفات سے تمام خوبیاں اور تمام شانیں جو ہمیں عالم رنگ و بو میں ہر طرف منتشر نظر آتی ہیں وہ اللہ کی صناعی اور کاریگری کا مرقع ہیں۔ کلام الٰہی کا آغاز ہی مضمون حمد سے ہوتا ہے کہ وہ ذات تمام تعریفوں اور ستائشوں کی سزاوار ہے ارشاد فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○[1]

’’سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے‘‘ ○

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تعریف کسی خوبی اور شان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ تمام تعریفیں اللہ کی ہیں کا معنی ہے کہ تمام شانیں اور خوبیاں اللہ کی ہیں یہ اس اَمر کا ثبوت ہے کہ وہ تمام جہانوں کا رب ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ عالم کے حکم میں آتا ہے اور عالم لا تعداد ہیں جیسے عالم انس، عالم جن، عالم حیوانات، عالم نباتات، عالم جمادات، عالم سماوات وغیرہ جس طرح جہاں لاتعداد ہیں اِسی طرح جہانوں کے اندر شانیں بھی لا تعداد ہیں صرف حضرتِ انسان کو ہی اللہ تعالیٰ نے اتنی شانیں عطا کی ہیں کہ وہ حد شمار سے باہر ہیں۔ ہم ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شانیں مخلوقات اور تعریفیں اللہ کی ہیں چہ معنی دارد؟ اس سوال کا کافی وشافی جواب یہ ہے کہ جو شانیں عالمین میں پائی جاتی ہیں وہ سب ’’**الحمد ﷲ**‘‘ میں سمو دی گئی ہیں۔ الحمدللہ

(۱) الفاتحة، ۱: ۱

ایک حقیقت ہے جبکہ العالمین میں شانوں کا ظہور ایک واقعہ ہے۔ یاد رہے کہ کوئی حقیقت اس وقت تک حقیقت نہیں ہوتی جب تک وہ واقعہ کے مطابق نہ ہو حقیقت اور واقعہ میں گہرا ربط کارفرما ہوتا ہے؟ تو رب العالمین جو سب تعریفوں کا سزاوار ہے وہی سب شانوں کا مبداء، سرچشمہ اور منبع ہے۔ ساری شانیں اسی سے پھوٹ رہی ہیں۔

سب شانوں کا مالک ہونا اللہ کی شان ہے اور وہی ہے وہ کسی کو اپنی شان کرم نوازی سے سب شانوں کا مالک بنا دیتا ہے۔ اللہ کی معرفت اس کے چشمہ ربوبیت سے ہو رہی ہے اگر اللہ رب نہ ہوتا تو اس کی معرفت کیونکر ہوسکتی تھی۔ جب وہ ذات صرف اللہ تھی تو تمام شانیں اس میں مرکوز تھیں مگر ان شانوں کو نہ کوئی دیکھنے والا تھا اور نہ کوئی ان سے استفادہ کرنے والا اللہ نے چاہا کہ میری شانوں کو کوئی جاننے والا ہو تو اس نے رب العالمین کی صفت اختیار فرمائی اور فرمایا: اے افتادگانِ خاک اگر تم میری ان شانوں کا نظارہ کرنا چاہتے ہو تو العالمین کو دیکھو۔ میری شاہکار تخلیق انسان کو دیکھو، بچھی ہوئی بستر زمین کی چادر کو دیکھو نیلگوں آسمان کو دیکھو، گردش لیل ونہار کو دیکھو، بدلتے ہوئے موسموں کو دیکھو، خلاؤں کی وسعتوں کو دیکھو، آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے کہساروں کو دیکھو، دریاؤں کی روانیوں کو اور سمندروں کی طغیانیوں کو دیکھو، باپ کی شفقت کو دیکھو، ماں کی مامتا کو دیکھو، علماء کے علم کو دیکھو، اولیاء کی بصیرت کو دیکھو، تمہیں ہر طرف میری ہی شانوں کے بوقلموں جلوے نظر آئیں گے۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ.(۱)

”پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)۔“

الغرض ساری کائناتِ زیریں و بالا اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا پرتو اور مظہر ہے۔

(۱) البقرة، ۲:۱۱۵

شانِ ربوبیت کا مظہر اتم ...... ذاتِ مصطفیٰ ﷺ

اللہ تعالیٰ نے اپنے سرمدی حسن کی تمام شانوں اور جلووں کو بکھیرا تو کائنات وجود میں آگئی اور کائنات کی متنوع شانوں، رنگینیوں اور رعنائیوں کو سمیٹا تو وجاہتوں کا پیکر انسان بن گیا جس کے لئے ارشادِ ربانی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍo (۱)

”بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہےo“

کائنات انسانی کے تمام کمالات کو یکجا کیا تو کائنات نبوت وجود میں آ گئی۔ اس کائنات نبوت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو پیکرِ حسن و جمال، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صاحب عصا اور صاحبِ یدبیضا بنا دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کو مثالی سلطنت وحکومت کا مالک بنا دیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اعجازِ مسیحائی عطا فرمایا۔ الغرض جدا جدا پیکرانِ نبوت آئے اور ان میں حسنِ ازل کے جلوے جدا جدا اپنی آب و تاب کے ساتھ رکھ دیئے گئے۔ اب منشائے خداوندی ہوا کہ ایک پیکر ایسا بھی حسن کے سانچے میں ڈھالا جائے جو تمام کمالات کو اپنے اندر جمع کر لے چنانچہ رب ذوالجلال نے وہ بے مثال پیکرِ نبوت تاجدارِ انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی صورت میں دنیا کو عطا کر دیا اور اس حسنِ لم یزل کے پیکر میں اپنے تمام جلووں اور شانوں کو اس طرح مجتمع فرمادیا کہ وہ چشمِ جہاں بیں میں تو محمد عربی ﷺ ہیں مگر حسن یوسف، دمِ عیسیٰ، ید بیضا سمیت تمام خوبانِ عالم میں جو جو کمالات و صفات فرداً فرداً اپنی تمام تر بوقلمونیوں اور شمائل و فضائل کی دیدہ زیب رعنائیوں کے ساتھ موجود تھے وہ تنہا چمنستانِ نبوت و رسالت کے اس گل سرسبز میں مجتمع کر دیئے گئے جس کے ڈنکے عالم ارض وسماوات میں محمد و احمد ﷺ کے نام سے بجائے جا رہے ہیں اور

---

(۱) التین، ۹۵: ۴

ابدالآباد تک بجتے رہیں گے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

خیمہ افلاک کا ایستادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

کائنات نبوت و رسالت کا ہر فرد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آپ کے نور ابد تاب سے مستنیر ہوا اسی لئے قرآن پاک آپ کی شان میں مدح سرائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ.(۱)

’’(یہی) وہ لوگ (یعنی پیغمبرانِ خدا) ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی ہے پس (اے رسولِ آخرالزماں!) آپ ان کے (فضیلت والے سب) طریقوں (کو اپنی سیرت میں جمع کرکے ان) کی پیروی کریں (تاکہ آپ ﷺ کی ذات میں ان تمام انبیاء و رسل کے فضائل و کمالات یکجا ہوجائیں)۔‘‘

خالق ارض و سماوات نے حضرت محمد ﷺ کو اپنی تمام شانوں کا مظہراتم بنا دیا ہے۔ اسی مظہریت میں الوہیت اور ربوبیت کے تمام جلوہ ہائے حسن کی کارفرمائی بہ درجہ کمال ضوء فگن ہے پھر نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ کو تمام شانوں کا جامع پیدا کیا بلکہ صحیح بخاری کی درج ذیل روایت کے مطابق آپ ان شانوں اور رب ذوالجلال کی عطا کردہ نعمتوں کے قاسم بھی ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إنّما أنا قاسم و الله يعطي.(۲)

’’میں تو صرف تقسیم کرتا ہوں اور اللہ رب العزت عطا فرماتا ہے۔‘‘

---

(۱) الانعام، ۶: ۹۰

(۲) بخاري، الصحيح، کتاب العلم، باب من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين، ۱: ۳۹، رقم: ۷۱

علمه کے تیسرے معنی کے اعتبار سے آیت الکرسی کے مذکورہ حصے کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہوا کہ اصلاً اور حقیقتاً علم اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا مگر جس کسی کے پاس بھی علم ہے وہ اسی کے علم کا پرتو ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی شانِ علم کا ذکر یوں فرماتا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ○[1]

''اور اللہ ہر چیز سے بہت واقف ہے○''

اللہ تعالیٰ تو علیم ہے ہی مگر جب اس کا پرتو علم اپنے کسی بندے پر پڑتا ہے تو وہ بھی علیم بن جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم اس بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ○[2]

''اور ہر صاحبِ علم سے اُوپر (بھی) ایک علم والا ہوتا ہے○''

حقیقتاً علیم اللہ تعالیٰ ہے اور بندہ اس کی صفتِ علمیت کا مظہر ہے۔ علمِ الٰہی کے بہترین مظہر انبیاء کرام علیہم السلام کے نفوس قدسیہ ہیں اور گروہِ انبیاء کرام علیہم السلام میں بہترین مظہر سید الانبیاء حضور تاجدارِ کائنات ﷺ ہیں۔ اولیاء اور علماء کا مبلغ علم انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع میں ہے۔ علم انبیاء کی میراث ہے اور اس کے وارث علمائے حق ہیں۔

آیۃ الکرسی کے مذکورہ حصے کی تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ علم غیب ذاتی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کی ملک ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو اس طرح کا علم غیب حاصل نہیں۔ مخلوق کا علم محض عطائی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطاء کوئی روک نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ انبیاء کو غیب پر مطلع فرماتا ہے۔ حضور ﷺ بھی بلاشبہ مطلع علی الغیب ہیں۔ اس بات کا انکار آیت مذکورہ کے انکار کے مترادف ہوگا۔

(۱) المائدہ، ۵: ۹۷

(۲) یوسف، ۱۲: ۷۶

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا معنٰی

”اس کی بادشاہی اور علم آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے۔“

قرآن حکیم کا اُسلوب یہ ہے کہ وہ معنوی اُمور کی تعبیر محسوس انداز میں کرتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کی کائنات رنگ و بو پر مکمل بالادستی اور اقتدارِ اعلیٰ کو ایک حسی تعبیر سے بیان کیا گیا ہے، کیوں کہ اس حسی تعبیر سے اللہ تعالیٰ کے مقتدرِ اعلیٰ ہونے کی حقیقت قلب میں مضبوطی اور گہرائی کے ساتھ اتر جاتی ہے اور پیوست ہو جاتی ہے۔ کرسی سے اشارہ ہے بادشاہت کی جانب اور کرسی کے زمین و آسمان کو محیط ہونے سے اشارہ ہے کہ اس کی مملکت میں تمام زمین و آسمان شامل ہیں۔ یہ تو اِس تعبیر کا ذہنی اور فکری پہلو ہے مگر اس کا حسی پہلو فکری پہلو سے کہیں زیادہ جاندار مضبوط اور دلنشین ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں۔ اِس تعبیر سے مقصود قدرت کاملہ کی جانب اشارہ کرنا ہے مگر تعبیر میں دشواری کے نہ ہونے اور عدم تکان کی محسوس تعبیر اختیار کی تاکہ زیادہ گہرائی، بھرپور قوت و توانائی اور اپنی پوری تاثیر کے ساتھ سننے والے کے قلب میں جاں گزیں ہو جائے۔ قرآن حکیم کے انداز بیان اور اسلوبِ تعبیر سے بخوبی واقف ہوجانے کے بعد اس امر کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ حفیظ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ہے۔ اس کے بنیادی معنی نگران، محافظ، حفاظت کرنے والے۔ نگرانی میں رکھنے والے کے ہوتے ہیں۔ حفیظ کا بنیادی مادہ ح ف ظ ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے حفاظت کرنا، نگرانی کرنا، بچائے رکھنا، حفظ و امان میں رکھنا، قبضہ میں رکھنا، اس اعتبار سے حفیظ حفاظت کرنے والا ہوتا ہے اور نگہبانی کرنے والا اور محافظت میں رکھنے والا۔ حفیظ وہ ہے جو ہر حوالے اور ہر اعتبار سے کلی طور پر محافظ اور حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔ بحوالہ صفت

’’حفیظ‘‘ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا محافظ، نگہبان، نگرانی کرنے والا اور حفاظت میں رکھنے والا ہے۔ اللہ الحفیظ تو پاسبانی کرنے والا ہے۔ وہ بچاؤ کرتا ہے۔ سلامتی میں رکھتا ہے، تحفظ فراہم کرتا ہے۔ بطور ولی انسانوں پر مقرر اور متعین رہتا ہے۔ ’’حفیظ‘‘ نگہداشت، حفاظت، کفالت اور قائم و برقرار رکھنے والا ہوتا ہے۔ اس حفاظت کے اندر اللہ تعالیٰ کا صرف حفاظتی نظام ہی نہیں بلکہ نشوونما اور پرداخت و بالیدگی بخشنے والا نظام بھی کارفرما رہتا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ اس حفاظتی نظام کے تحت صحیح معنوں میں حق پاسبانی اور نگہداری بھی انجام دیتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حفظ و تحفظ کے اندر امن و سکون بھی موجود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ غیر محدود حاکمیت والا ہے اور اسی طرح اس کے اختیارات بھی مطلق ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی شریک و سہیم نہیں ہے اور اس کے فیصلے اور احکامات سب صادر ہو کر رہتے ہیں وہ اس ساری کائنات کا مالک ہے اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے اس سے واقف اور آگاہ ہے۔ بلکہ کائنات کی ساری مصلحتوں کو بھی خوب سمجھتا ہے۔ اس ذات باری کے بارے میں انسان ہوں یا جن یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی بھی نظر محیط نہیں ہے۔ نظام عالم تو بہت بڑا ہے۔ اِنسان تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔ بلکہ ان کو سمجھنے کا بھی وہ اہل ہی نہیں ہے، اسی اللہ تعالیٰ ہی کا سب پر غلبہ اور قبضہ ہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ان سب کی حفاظت اور نگہبانی بڑی ہی آسانی کے ساتھ کر لیتا ہے اور اس نگرانی سے اسے کوئی تکان یا تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سب سے بلند و برتر ذات ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن پر محافظ اور نگہبان ہے اور اس کے لیے یہ نگرانی اور حفاظت کوئی مشکل نہیں ہے۔ سورۂ ھود میں حضرت ھود علیہ السلام نے مشرکین سے کئی حوالوں سے سمجھانے کی بھرپور کوشش کی اور اپنے بارے میں علی الاعلان فرمایا ہے کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم لوگ گواہ رہو کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک کر رکھا ہے۔ میں ان تمام سے بیزار ہوں اور میرا بھروسہ تو میرا رب ہی ہے اور اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور پھر یوں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ جان لو:

اِنِّیۡ تَوَکَّلۡتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ○ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖۤ اِلَیۡکُمۡ ؕ وَ یَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۚ وَ لَا تَضُرُّوۡنَہٗ شَیۡئًا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَفِیۡظٌ ○(۱)

’’بیشک میں نے اللہ پر توکل کر لیا ہے جو میرا (بھی) رب ہے، تمہارا (بھی) رب ہے اور کوئی چلنے والا (جاندار) ایسا نہیں مگر وہ اسے اس کی چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے (یعنی مکمل طور پر اس کے قبضۂ قدرت میں ہے)۔ بیشک میرا رب (حق و عدل میں) سیدھی راہ پر (چلنے سے ملتا) ہے ○ پھر بھی اگر تم روگردانی کرو تو میں نے واقعۃً وہ (تمام احکام) تمہیں پہنچا دیئے ہیں جنہیں لیکر میں تمہارے پاس بھیجا گیا، ہوں اور میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو قائم مقام بنا دے گا، اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ بیشک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے ○‘‘

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

فَاللّٰہُ خَیۡرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ ہُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ○(۲)

’’تو اللہ ہی بہتر حفاظت فرمانے والا ہے اور وہی سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے ○‘‘

اس تاریخی قرآنی واقعے میں بتایا یہ گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب اپنے والد سے کہا کہ اب کی بار ہم غلہ لینے مصر جائیں گے تو بنیامین بھائی کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

---

(۱) ہود، ۱۱: ۵۶، ۵۷

(۲) یوسف، ۱۲: ۶۴

اس پر ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں پر ہرگز اعتماد نہیں کروں گا، بلکہ میرے لیے میرا بہترین محافظ اور ارحم الرحمین اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اب میں یہ کام اللہ تعالیٰ کی حفاظت و رحمت کے بھروسہ پر کروں گا تمہارے اعتماد پر نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ حافظ و ناصر اور حفیظ کا نظام حفاظت بڑا ہی فعال، مؤثر، راست اور مبنی برحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ الحفیظ اسی نظام کے اندر معجزیاتی انداز سے بھی جس کی حفاظت اور نگہبانی کرنا چاہتا ہے، بآسانی کر لیتا ہے اور وہ ایسا ہی نگران اور محافظ ہے کہ اس کے نظام میں جو چیز بگڑ جاتی ہے اس کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری نئی چیز لا دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک مرتبہ اس دنیا کو بنا کر پھر اس سے بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہو بلکہ وہ برابر اس کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ اس نظام میں اگر کوئی قوم اپنے حدود سے گزر جاتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس کو درست بھی کر دیتا ہے اور یہی ایک بہتر اور احسن پاسبان کا کام ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی اللہ الحفیظ بہترین محافظ اور خیرالحافظین ہے کہ وہ خوب سمجھتا ہے کہ کس کو درست کر کے قائم رکھنا اور کس کو بدل کر اس کی جگہ پر نئی چیز یا افراد یا قوم کو لانا ہے۔ یہ سمٰوٰت اور پوری کائنات جو اللہ تعالیٰ نے اس قدر بڑی اور عظیم الشان بنائی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ بجا طور پر اس کی اپنے خاص نظام حفاظت کے تحت نگہبانی اور نگرانی اور حفاظت بھی کرتا ہے۔

کائنات میں حفاظتِ سمٰوات کے بارے میں اللہ الحفیظ کے بڑے ہی واضح ارشادات موجود ہیں:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ○ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ○ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ○ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ○ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ○ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ○ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ

لَّآزِبٍO(۱)

”(جو) آسمانوں اور زمین کا اور جو (مخلوق) اِن دونوں کے درمیان ہے اس کا رب ہے، اور طلوعِ آفتاب کے تمام مقامات کا رب ہےO بے شک ہم نے آسمانِ دنیا (یعنی پہلے کرّۂ سماوی) کو ستاروں اور سیاروں کی زینت سے آراستہ کردیاO اور (انہیں) ہر سرکش شیطان سے محفوظ بنایاO وہ (شیاطین) عالمِ بالا کی طرف کان نہیں لگاسکتے۔ اور اُن پر ہر طرف سے (انگارے) پھینکے جاتے ہیںO اُن کو بھگانے کے لیے اور اُن کے لیے دائمی عذاب ہےO مگر جو (شیطان) ایک بار جھپٹ کر (فرشتوں کی کوئی بات) اُچک لے تو چمکتا ہوا انگارہ اُس کے پیچھے لگ جاتا ہےO اِن سے پوچھئے کہ کیا یہ لوگ تخلیق کیے جانے میں زیادہ سخت (اور مشکل) ہیں یا وہ چیزیں جنہیں ہم نے (آسمانی کائنات میں) تخلیق فرمایا ہے، بے شک ہم نے اِن لوگوں کو چپکنے والے گارے سے پیدا کیا ہےO“

گویا یہ سب کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، اس حقیقت کی کہ اشیائے فطرت خود قوانین خداوندی کے تابع سرگرم عمل ہیں ان میں سے کسی کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہیں، لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ان حقائق سے منہ پھیرتے رہتے ہیں۔

کائنات اور سمٰوٰت کے بارے میں جس وضاحت اور تفصیلات کے ساتھ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ کسی اور سماوی پیغام میں اس طرح سے نہیں بتایا گیا اور یہ سب اس لیے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کی بلندیوں اور زمین کی وسعتوں کا پروردگار ہے اور جو کچھ ان کے مابین ہے سب کا اور ہر روز نئے نئے مطلع بدلنے والے مشرقوں کا بھی وہی رب ہے۔ اور پھر اس طرح سے ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِO وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ

(۱) الصافات، ۳۷: ۵۔۱۱

مَّارِدٍo[1]

”بے شک ہم نے آسمانِ دنیا (یعنی پہلے کرّۂ سماوی) کو ستاروں اور سیاروں کی زینت سے آراستہ کر دیاo اور (انہیں) ہر سرکش شیطان سے محفوظ بنایاo“

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے قریبی آسمان کوئی حوالوں سے انسان کے لئے خوبصورت، زینت والا اور خوش نما لگنے والا بنایا ہوا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ: ”خدا نے مختلف اجرامِ فلکی کو جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے تھا ویسا ہی انہیں بنا دیا ہے اور جس قانون کے مطابق انہیں چلنا تھا وہ انہیں القاء کر دیا۔ یعنی وہی قانون اور قاعدہ کی ساخت کے اندر رکھ دیا گیا اور جو فضاء سب سے قریب نظر آتی ہے، اس میں اس قسم کے اجرام بکھیر دیئے جو تمہیں آسمان کی قندیلوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور انہیں ایسا محفوظ بنا دیا کہ یہ نہ آپس میں ٹکرائیں اور نہ انسانوں کے اُوپر گریں۔

بحوالہ سبع سمٰوات یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سات بلند طبقات معرض وجود میں آئے ہوئے ہیں اور سب کو بذریعہ وحی ان کا کام اور منصب سونپا جا چکا ہے اور انہیں جگمگاتے چراغوں سے سجایا ہوا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے محفوظ اور مامون کیا ہوا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں اس طرح سے ارشادِ الٰہی ہوتا ہے کہ:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ؕ اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ.[2]

”پھر (بھی) اگر وہ رُوگردانی کریں تو ہم نے آپ کو اُن پر (تباہی سے بچانے کا) ذمّہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ پر تو صرف (پیغامِ حق) پہنچا دینے کی ذمّہ داری ہے۔“

(۱) الصافات، ۳۷: ۵، ۶

(۲) الشوریٰ، ۴۲: ۴۸

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اوروں کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات خود نمٹ لے گا کیونکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم اور نگرانی میں ہیں، اگر یہ لوگ تمام تنبیہہ و تذکیر کے باوجود اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں تو اس کی کوئی پرواہ اور فکر اے رسول! آپ کو نہیں ہونی چاہیے، اصل صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کڑی نگرانی کر رہا ہے۔ گویا جونہی وہ اپنی مہلت پوری کر لیں گے، اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کے پنجہ میں وہ گرفتار ہو کر رہ جائیں گے کہ یہی اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور پاسبانی کا قانون ہے۔

کرسی کا معنی و مفہوم

کرسی کے معنی پر مفسرین کے متعدد اقوال بیان کئے گئے ہیں، چار مشہور ترین اقوال حسب ذیل ہیں:

۱۔ بعض نے کہا کہ کرسی وہی عرش ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کا تعلق قائم کرنے کے لئے ہے ورنہ عرش کوئی معین و مشخص نہیں ہے۔ اس لئے قاضی بیضاویؒ نے بیان کیا کہ حقیقت میں نہ کرسی ہے اور نہ اِس پر بیٹھنے والا بلکہ یہ صرف تمثیل ہے یعنی ذات واجب الوجود کی عظمت کو اِنسانوں کے ذہن میں بقدر امکان ڈال دیا۔

۲۔ بعض مفسرین نے کہا کہ کرسی بمعنی قدرت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی عظیم ہے کہ اس سے یہ آسمان و زمین قائم رہتے ہیں اور اِس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

۳۔ بعض نے کہا کہ کرسی سے مراد علم ہے کہ اُس کا علم تمام آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے۔

۴۔ بعض مفسرین کے نزدیک کرسی سے مراد عظمت ہے اور اِس سے مقصود اُس کی سلطنت و بادشاہی کا بیان ہے۔

خلاصۂ اقوال

کرسی کا معنی عرش ہو یا عرش سے الگ یا عرش کے نیچے تخت ہو یا اِس سے مراد علم الٰہی ہو یا قدرتِ باری تعالیٰ اِن تمام معانی کی حقیقت کا ادراک عقل انسانی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عرش پر یا کرسی پر جلوہ افروز ہونا اپنی شایان شان کے مطابق ہے اِس کو عام معنی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ لیس کمثلہ شیئ کوئی شے اِس کی مثل نہیں ہے۔ کرسی وعرش سے اللہ تعالیٰ کے جاہ وجلال اور اُس کی شہنشاہیت کا بیان کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر سات آسمان اور سات زمینوں کو بچھا دیا جائے تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے ایک انگوٹھی کسی لق ودق صحرا میں پڑی ہو۔

امام ابن جریرؒ اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اُنہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کرسی کے بارے میں دریافت کیا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوذر رضی اللہ عنہ

> ’’سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلہ میں اِس طرح ہیں جیسے کسی جنگل میں انگوٹھی کا چھلہ پڑا ہو اور عرش کی فضیلت کرسی پر اس طرح ہے جیسے صحرا کی فضیلت اُس انگوٹھی کے چھلے پر ہے۔‘‘(۱)

کسی چیز میں پائی جانے والی وسعت اور گنجائش کو مادی اعتبار سے دیکھا جائے اور پھر معنوی اعتبار سے اس کے ظرف کا جائزہ لیا جائے تو ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ہم ایک برتن کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں پانچ پیالوں کے برابر گنجائش ہے یعنی اس کی داخلی فضا اپنے اندر اتنی مقدار مائع کو جگہ دے سکتی ہے۔ کبھی ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا صاحب ظرف اور وسعت کا مالک ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ سنگین

(۱) سیوطی، الدر المنثور، ۱: ۳۲۸

حوادث کے مقابلے میں آپے سے باہر نہیں ہوتا اور اپنی خودی کو بھول نہیں جاتا یا یہ کہ وہ دوسروں کے راز اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہے اور ہر کس و ناکس کو نہیں بتاتا۔ پس اس مثال میں ظرف اور وسعت ایک معنوی اور روحانی اَمر کو کہا گیا ہے اور اس کے معنی روح کی بزرگی اور نفس پر قابو رکھنے کی قدرت اور اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی قوت ہے۔ آیت الکرسی یہ کہہ رہی ہے: اللہ تعالیٰ کی کرسی آسمانوں اور زمین سے وسیع ہے۔

اگر کرسی بمعنی علم مراد ہو تو اس بنیاد پر آیت کے اس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام آسمانوں اور زمین پر وسعت رکھتا ہے کیونکہ علم کمالاتِ معنویہ میں ہے اِس لئے اس کی وسعت و ظرفیت بھی مادی نہیں معنوی وسعت مراد ہے۔ اس جملہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ اس ذاتِ اقدس کا لامحدود علم تمام آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔

جب ''کرسی'' کا معنی علم ہو تو اس جملے کا گذشتہ آیات سے اس طرح ربط قرار دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ''**له مافی السموات وما فی الارض**'' کے ذریعے اعلان فرمایا ہے کہ کائنات کی ساری مخلوقات اور ان آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات اس ذات اقدس الٰہی کی ملکیت ہیں پھر ''**یعلم مابین ایدیهم وما خلفهم**'' کے ذریعے واضح فرمایا کہ وہ مالکِ حقیقی اپنی ملکیت سے غافل اور بے خبر نہیں اور وہ ان کے ماضی و مستقبل اور ظاہر و باطن غرض کہ ان کے تمام مادی اور معنوی حالات سے بخوبی آگاہ ہے یعنی ان مملوکات کی ساری جزئیات و خصوصیات اس کے کامل علم کے اندر گھری ہوئی ہیں اور وہ ان سب پر پوری طرح محیط ہے۔ ان دو جملوں میں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے اندر پائی جانے والی ساری مخلوقات کی مالکیت اور علم کی بات کی تھی، لیکن خود آسمانوں اور زمین کے بارے میں کچھ نہ فرمایا تھا، اب ''**وسع کرسیه السموات والارض**'' کے جملے سے تصریح فرما دی۔ خود تمام آسمان اور زمین بھی اللہ تعالیٰ کے علم کے احاطے کے اندر ہیں۔ بالفاظ دیگر پہلے جملے میں آسمانوں اور زمین کے مظروف کی طرف اشارہ کیا اور اب

اس جملے میں خود اس ظرف آسمان و زمین کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔

بعض روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ کرسی ایک بہت بڑا آسمانی جرم ہے جو اپنی وسعت و عظمت کے لحاظ سے تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ گویا کرسی ایک عظیم مخلوق ہے جس کے اندر تمام آسمانوں اور زمین کے سما جانے کی وسعت و گنجائش موجود ہے۔ ایک اِنسان کے لئے کرسی نامی ایسے باعظمت جرم کا تصور کرنا سخت مشکل ہے جو اپنے اندر سارے آسمانوں اور زمین کی وسعت رکھتا ہو۔ لیکن اہمیت اس بات کی ہے کہ مفسرین نے کرسی کی ظرفیت کا یہی تعارف کروایا ہے کہ وہ ان آسمانوں اور زمین کے مجموعی حجم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس کرسی سے بزرگ تر اور وسیع تر ایک دوسری مخلوق بھی موجود ہے اور وہ بھی پروردگارِ عالم کی قلمرو میں داخل ہے۔ روایات کے مطابق کرسی ایک ایسے بڑے افلاکی جرم کا نام ہے کہ جس میں تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سما لینے کی گنجائش موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا:

وسع کرسیه السموات والارض.

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے آیت الکرسی کے اس جملے کے بارے میں سوال کیا کہ آیا آسمانوں اور زمین نے کرسی کو گھیرا ہوا ہے یا کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیا ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمام اشیاء کرسی کے اندر ہیں یعنی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سما لینے کی گنجائش موجود ہے۔[1]

کرسی سے مراد وہ تسلط و حکومت الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اس جہان ہستی پر حاصل ہے۔ عربی زبان میں ستون اور سہارے کو بھی کرسی کہتے ہیں جو کسی دیوار کو گرنے اور ٹیڑھا ہونے سے بچانے کے لئے اس کی تکیہ گاہ کے طور پر بنایا جاتا ہے۔ بنابریں آیت کا معنی یہ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت آسمانوں اور زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس نے انہیں سہارا دے رکھا ہے۔ جب ہم ''کرسی'' کو اللہ تعالیٰ کی سلطنت و قدرت کے معنی میں

(۱) البیان، ۱: ۳۳۵

لیں تو آیت کے اس جملے کا سابقہ جملوں سے ربط کچھ اس طرح بنے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ’’له مافی السموات وما فی الارض‘‘ کے الفاظ سے یہ فرمایا کہ میری مالکیت تمام سماوی اور ارضی اشیاء کو حاوی ہے۔’’**یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم**‘‘سے واضح کیا کہ میرا علم تمام موجودات عالم کو شامل اور ہر طرح سے جامع اور کامل ہے پھر’’وسع کرسیه السموات والارض‘‘ کے ذریعے لوگوں کو سمجھایا کہ نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ پورے جہان کا مالک ہے اور اپنی مملوکات کے تمام احوال سے آگاہ ہے بلکہ وہ اس پورے وجودِ ہستی اور آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات و اشیاء پر پوری طرح قادر ہے۔ سارا جہان رب العالمین کی سلطنت اور قبضے میں ہے اور تمام ذرات کائنات پر اس کی حکمرانی، فرماں روائی اور حکومت قائم ہے۔اس ذات باری نے اس باعظمت جہاں کو پیدا کیا۔ اس کے لئے قواعد وضوابط اور قوانین تکوینی معین فرمائے۔ پھر اس جہان ہستی کو اس راہ پر چلا دیا جس پر چلانے کا اس نے ارادہ فرمایا تھا۔ یاد رہے کہ عالم ہستی کا مادہ اور اس کے تمام قوانین تکوینی اب بھی اسی کے اپنے قبضہ قدرت میں ہیں اور تمام اشیاء بلا قید وشرط اس کی مطیع و فرماں بردار ہیں۔

بَلۡ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّـهٗ قٰنِتُوۡنَ ○(۱)

’’بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (سب) اسی کی (خلق اور ملک) ہے، (اور) سب کے سب اس کے فرماں بردار ہیں○‘‘

اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاۡتِ بِاٰخَرِيۡنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيۡرًا ○(۲)

’’اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں نابود کر دے اور (تمہاری جگہ) دوسروں کو لے آئے، اور اللہ اس پر بڑی قدرت والا ہے○‘‘

(۱) البقرة، ۲: ۱۱۶

(۲) النساء، ۴: ۱۳۳

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی مطلق سلطنت اور زبردست حکومت کے بارے میں متعدد آیات موجود ہیں اور ان سب میں جامع ترین یہ دو جملے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ○[۱]

’’بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے ○‘‘

اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ ○[۲]

’’یقیناً اللہ جو ارادہ فرماتا ہے کر دیتا ہے ○‘‘

مخفی نہ رہے کہ باری تعالیٰ کی سلطنت و قدرت بھی اس ذات مقدس کی دیگر تمام صفات کی طرح ازلی، ابدی اور لامحدود ہے۔ اس کی قدرت کا کسی مخلوق کی قدرت و توانائی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ مخلوق کے پاس جو کمال ہے وہ اکتسابی اور محدود ہے جب کہ اس ذات اقدس کا کمال عین ذات اور لامحدود ہے۔ وہ فقط اللہ تعالیٰ ہے جو قوی، مطلق، کائنات کا واقعی مالک، عالم بدون تعلم اور قادر بدون عجز ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو لامحدود سلطنت و حکومت کا مالک ہے اور اس کی ازلی و ابدی قدرت نے تمام آسمانوں، زمین اور ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

(۱) المائدۃ، ۵: ۱

(۲) الحج، ۲۲: ۱۴

www.MinhajBooks.com

وَلَا يَؤُوْدُهٗ حِفْظُهُمَاۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ○ کا معنٰی

”اور اِس پر اِن دونوں یعنی زمین و آسمان کی حفاظت ہرگز دشوار نہیں، وہی سب سے بلند رُتبہ بڑی عظمت والا ہے○“

ذاتِ الٰہی اپنی تمام صفات کمال کے ساتھ بذات خود قائم ہے اور وہ کسی غیر کی طرف معمولی احتیاج بھی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس تمام موجودات عالم اور پورا جہان ہستی اس ذات واجب الوجود کے سہارے قائم ہے۔ چونکہ امکان تھا کہ اس آیت کریمہ کے سامعین اللہ تعالیٰ کی حیات کو بھی اس طرح تصور کرنے لگیں کہ اللہ ”حیّ“ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے ”قیوم“ رہے، کیونکہ ہر زندہ قطعی طور پر خواب و استراحت کی احتیاج رکھتا ہے۔ جب کسی کو نیند آجاتی ہے تو وہ غافل ہو جاتا ہے اور اپنی حفاظت کے قابل نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ وہ دیگر افراد کی حفاظت کر سکے۔ پس قبل اس کے کہ لوگوں کے اذہان میں یہ تصور آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ”لا تاخذہ سنۃ ولا نوم“ کے جملے سے ان سوالوں کا راستہ بند کر دیا، قطعی جواب پیش کر دیا اور فرمایا کہ اونگھ اور نیند اس ذات پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ فی الواقع اللہ تعالیٰ اس جملے کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہے کہ خالق کی زندگی کو مخلوق کی زندگی پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ نیند، اونگھ اور ایسی چیزیں مخلوق کی زندگی کے عوارض ہیں اور خالق و مالک ان امکانی نقائص اور مادی عوارض سے منزہ اور مبرّا ذات ہے۔ یہ جملہ ”ولا یؤدہ حفظھما“ بھی ”تاخذہ سنۃ ولا نوم“ کی مثل ہے کیونکہ کرسی کا ایک معنی یہ ہے: المراد بالکرسی ھنا الملک والسلطان القدرۃ فیکون معناہ

احاط قدرتہ بالسموات والارض وما فیھا۔ یہاں کرسی سے مراد حکومت سلطنت اور قدرت ہے لہٰذا معنی یہ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت آسمانوں، زمین اور ان میں پائی جانے والی تمام اشیاء پر حاوی ہے۔

یہاں ممکن تھا لوگ کائنات پر حاصل قدرت و سلطنت الٰہی کو اپنی قدرت و سلطنت پر قیاس کرنے لگیں جو انہیں اپنے گھر، زندگی اور اموال وغیرہ پر حاصل ہے۔ یہ کہنے لگیں: ہم تو محنت اور کوشش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور اس سے ہماری حاکمیت کی قدرت کمزور پڑ جاتی ہے۔ کیا خالق کائنات بھی اس جہان کی حفاظت کے کام اور اس میں اپنی قدرت کے اِستعمال کرنے سے تھک جاتا ہے یا نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے ’’ولا یؤدہ حفظھما‘‘ کے جملے سے اس سوال کا جواب دے دیا اور صراحت کر دی کہ اللہ تعالیٰ اس جہان کی حفاظت کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ اس جملے کے ذریعے یہ واضح فرمانا چاہتا ہے کہ لوگوں کو خالق کی لامحدود قدرت کا قیاس مخلوق کی قدرت کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی طرح سمجھنے لگیں کیونکہ تھکاوٹ، کمزوری وغیرہ مادی قوت کے عوارض ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ تمام مادی نقائص سے منزہ و مبرّا ہے۔ اِنسانی وجود میں پائی جانے والی محنت و کوشش کی توانائی مادے سے قائم ہے، چونکہ مادہ محدود ہے اس لئے اس میں پوشیدہ توانائی بھی لازماً محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دیر محنت و کوشش کرنے کے بعد انسان کی توانائی کمزور پڑنے لگتی ہے اور اس کے بدن میں تھکاوٹ اور خستگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ غذا کھائے اور استراحت کرے تاکہ اپنی قوت کی تجدید کرے اور دوبارہ کام، کاج اور محنت کے قابل ہو سکے۔ محنت کے نتیجے میں ہمارے بدن میں ایک تھکاوٹ پیدا ہوتی ہے جو عموماً ایک نشاط آور نیند اور استراحت کے ساتھ دور ہو جاتی ہے۔ اگر ہماری محنت توانائی سے تجاوز کر جائے، بالخصوص جب کہ ہم ایسا کام کرنے لگیں جس کی ہمیں عادت نہیں ہے تو یہ ہمیں بیمار کر دیتی ہے۔ پھر بلافاصلہ یا چند گھنٹے یا چند روز بعد ہمیں بخار

کمزوری، کوفت اور طرح طرح کی تکلیفیں ہو جاتی ہیں۔ تیز دوڑنے سے حیوان کا مر جانا۔ فوری طور پر یا کچھ دیر بعد مرنا، یہ بتا تا ہے کہ کسی نے شکار کے لئے اس کا پیچھا کیا ہوگا اور اس وجہ سے اسے سخت دوڑ لگانا پڑی۔ اس سے اس کو بے انتہاء تھکاوٹ ہوئی کہ جو اس کے لئے بیماری کی شکل اختیار کر گئی لہٰذا اللہ تعالیٰ مادہ و مادیات سے منزہ ہے، اس لئے وہ مادی نقائص اور جسمانی عوارض سے بھی مبرّا ہے۔ اس کی قدرت اس کے لئے عین یعنی لازم ذات ہے اور اس کی ذات لازم قدرت ہے۔ کمزوری، سستی، فرسودگی، خستگی، تھکاوٹ وغیرہ سب مادی موجودات کے عوارض ہیں۔ اس لئے ان کی اس ذاتِ کبریا کے حریمِ قدس اور اس کی دائمی و ابدی قدرت کے احاطہ میں داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لا يتغير حال ولا يتبدل فى الاحوال ولا تبديل الليالى والا يام ولا يغيره الضياء ولاضلام ولا يوصف بشئ من الاجزاء ولا بالجوارح والاعضاء ولا بعرض من الاعراض. (۱)

”اللہ تعالیٰ کسی حالت سے متغیر نہیں ہوتا اور نہ حالات کے بدلنے سے اس میں تبدیلی آتی ہے۔ شب و روز کا گزرنا اسے پرانا اور بوسیدہ نہیں بنا سکتا اور روشنی و تاریکی اس کی ذاتِ مقدس پر کوئی اثر مرتب نہیں کرتی۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ اجزاء، اعضاء اور جوارح سے متصف نہیں ہو سکتی اور ان کے عوارض (مثلاً نیند، کمزوری، تھکاوٹ) وغیرہ اِسے لاحق نہیں ہو سکتے۔“

زیادہ کام کرنے سے تھکاوٹ کا احساس اور کسی عضو کی بیماری کے وقت درد کا احساس، یہ دونوں ایسی مفید اور سود مند حالتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ فیصلے کے تحت انسان کے وجود میں پیدا فرمائی ہیں۔ یہ دونوں حالتیں خطرے کی گھنٹی کی طرح ہیں

(۱) نهج البلاغة :۲۲۸/شرح ابن الحديد

کہ جو بر موقع آواز دینے لگے اور آدمی کو راستے میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کر دے۔ جس کا معدہ ناقص ہو جائے یا گلا خراب ہو جائے یا کوئی دانت خراب ہو جائے تو فقط درد کا احساس ہی واحد راستہ ہے جس سے وہ اپنی اس بیماری کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور خطرے کے وجود سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ درد کا یہ احساس بیمار کے لئے اعلان کرتا ہے کہ تیرا مزاج راہِ صحت سے منحرف ہو چکا ہے لہٰذا فوراً کسی طبیب کی طرف جا اور اس بیماری کو بڑھنے سے روک دے، نہیں تو تمہاری زندگی اور سلامتی خطرے میں ہے۔ جو شخص زیادہ محنت کرنے سے تھکنے لگتا ہے اور اس میں تھکاوٹ کا احساس پیدا ہوتا ہے تو درحقیقت یہ احساس اسے آگاہ کر رہا ہوتا ہے کہ تمہارے وجود کی توانائی کم ہو چکی ہے اور تمہاری قدرت و طاقت کمزوری و ناتوانی کا شکار ہو رہی ہے۔ لہٰذا اپنی صحت و زندگی کی حفاظت کے لئے اب کام سے دست بردار ہو جاؤ، کچھ دیر لیٹ کر آرام کرو اور اپنے آپ کو خطرات سے بچاؤ۔ خستگی اور تھکن ایک طبعی عمل ہے اور یہ ہر زندہ مادے کی خاصیت ہے۔ وہ تمام مشینیں اور چیزیں جو بے جان مادے سے بنائی جاتی ہیں، وہ بھی رفتہ رفتہ فرسودگی، بوسیدگی اور ناقابل مرمت نقائص کی طرف سفر کرتی ہیں۔ جبکہ زندہ مادے میں پیش آنے والی بوسیدگی عموماً عارضی ہوتی ہے، خود بخود درست ہوتی رہتی ہے اور بدن خود اس کی تلافی کر لیتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک واضح فرق ہے، لیکن صرف یہی فرق ہی ان دونوں کو باہم جدا نہیں کرتا۔ بلکہ جوں ہی تھکاوٹ عادی مراحل سے گزر جاتی ہے اور بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو وہاں یہ خطرہ پیدا ہوجاتا ہے کہ پھر سے پلٹ آنے والے عملی نقائص پیدا ہو جائیں اور تھکاوٹ کے ساتھ مل کر ایک دائمی بیماری کی صورت اختیار کر لیں۔ ایسے عوارض کے بارے میں امکان ہوتا ہے کہ وہ ہڈیوں کی شکل تبدیل کر دیں یا گوناگوں دیگر نقصانات کا موجب بن جائیں مثلاً ایک خصوصی کمزوری جو بہت مدت تک زیادہ دور کی آواز سننے سے کان کے اندرونی حصے میں پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض ایسے دقیق اور باریک کام ہوتے ہیں جو زیادہ عضلاتی محنت نہیں چاہتے

لیکن ایک خصوصی ہم آہنگی اور ظرافت کے طلب گار ہوتے ہیں کہ جن سے اضطراب، دلی پریشانی اور بالآخر تھکاوٹ اور خستگی پیدا ہو جاتی ہے، عضلاتی تھکاوٹ کا اثر فقط متعلقہ عضو تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ بدن کے دیگر حصوں پر بھی تھکن کے آثار مرتب کرتا ہے۔ پس اس لحاظ سے ایک زہریلا اثر پورے بدن میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ عضلات بھی جو اس کام میں شریک نہیں ہوتے ان پر اور دیگر اعصابی حصے پر بھی اس کے آثار مرتب ہو جاتے ہیں۔ اس تھکاوٹ کے دور کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس عضو میں سے نکلے ہوئے زائد مواد اور بدن پر موجود زائد مواد کو دھو دیا جائے اور وہ ختم ہو جائے۔ تھکے ہوئے آدمی کی سانس اور پسینہ زہریلے مواد سے بھرے ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بدن سے ایک ناپسندیدہ بو آنے لگتی ہے۔ نوافل اور مستحب عبادات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود متعدد روایات میں یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ لوگوں کو نوافل کی ادائیگی میں میانہ روی اور اعتدال کی راہ اپنانا چاہیے اور ان عبادات کو تھکاوٹ اور بے دلی کا موجب بنا کر اپنے اوپر بوجھ نہ بنانا چاہیے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں ہر عبادت کے لئے ایک نشاط اور شدید رغبت کا مرحلہ ہوتا ہے تو ایک سستی اور تنگی کا مرحلہ بھی ہوتا ہے، جس نے عبادت کی طرف اپنے شدید میلان کو میری سنت کے مطابق کر لیا تو وہ ہدایت پا گیا اور جس نے میری سنت کی مخالفت کی وہ گمراہ ہو گیا اور اس کا عمل تباہی میں پڑ گیا میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام کی نیند بھی سوتا ہوں، ہنستا بھی ہوں اور روتا بھی ہوں، جو بھی میری سنت سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔(۱)

اِسلام ایک سہل اور مشقت سے خالی دین ہے، لہٰذا اِس میں بڑی نرمی کے ساتھ قدم اُٹھاؤ۔ بندگانِ خدا پر عبادتِ خدا کو سوار نہ کرو اور ایسے سوار کی طرح نہ بن جاؤ

---

(۱) بخاري، الصحيح، كتاب النكاح، باب الترغيب في النكاح، ۵: ۱۹۴۹، رقم: ۴۷۷۶

جو اپنی سواری کو تھکا ماندہ کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ سفر طے ہوتا ہے اور نہ سواری صحیح سالم رہتی ہے۔

حضرت سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ اپنے شہزادے امام حسن رضی اللہ عنہ کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

واقتصد یابنی فی معیشتک واقتصد فی فسادتک وعلیک بالامر الدائم الّذی تطیقہ. (۱)

''اے میرے بیٹے! اپنے اُمور زندگی میں میانہ روی اپناؤ اور اپنی عبادت میں بھی میانہ رو رہو۔ افراط سے پرہیز کرو اور ایسی روش کا انتخاب کرو جو تمہاری طاقت کے اندر ہوتا کہ اسے دائمی طور پر انجام دے سکو۔''

مختصر یہ کہ دینِ اِسلام ایک سہل اور آسان دین ہے جو مشقت اور تکلف سے خالی ہے۔ وہاں اِسلام اس بات پر بھی قطعاً راضی نہیں ہے کہ انسان زیادہ مال کمانے اور دولت اکٹھی کرنے کے لئے حد سے زیادہ محنت کرتا ہوا دکھائی دے اور حد سے زیادہ کام کر کے خود کو اس قدر خستہ اور فرسودہ کر دے کہ اپنے جسم و جان کو خطرناک عوارض اور ناقابل تلافی نقصانات کا نشانہ بنا لے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اور میری اُمت کے متقی لوگ تکلف سے بری ہیں یعنی ہم سب ایسے کاموں سے منزہ اور مبرّا ہیں جن میں تصنع ریا اور مشقت ہو اور انہیں بے دلی کے ساتھ اپنے اوپر بوجھ سمجھ کر انجام دینا پڑے۔ اس کے پیش نظر کہ تھکاوٹ اس زہریلے مواد کا نام ہے جو عضلاتی یا دماغی کام میں حد سے زیادہ مصروف رہنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ امر فقط زندہ مادی موجودات کے عوارض میں سے ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ذاتِ الٰہی مادہ اور مادی عوارض سے منزہ و مبرّا ہے۔ یہ نتیجہ بالکل آسانی سے برآمد ہوجاتا ہے کہ بنیادی طور پر ذات باری تعالیٰ کے حریم قدس میں تھکاوٹ اور بوریت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انسان کسی جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل

(۱) نہج البلاغۃ خطبہ: ۳۱۵

کرنے کے لئے اپنی عضلاتی توانائی سے استفادہ کرتا ہے اور کسی علمی مطلب کو سمجھنے کے لئے اپنی دماغی طاقت کو کام لاتا ہے۔ ان دونوں کاموں میں اگر حد سے زیادہ محنت کرے تو تھک جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک خداوند قدوس کی ذات کا تعلق ہے تو وہ کائنات کی خلقت اور اس جہان کے نظام کو چلانے کے تمام اُمور میں فقط ارادہ کرتا ہے اور اس کی مراد متحقق ہو جاتی ہے لہٰذا پروردگار عالم کے لئے عضلاتی یا دماغی فعالیت کے ثابت ہونے کا کوئی معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ○ (۱)

’’اس کا امرِ (تخلیق) فقط یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو (پیدا فرمانا) چاہتا ہے تو اسے فرماتا ہے ہو جا، پس وہ فوراً (موجود یا ظاہر) ہو جاتی ہے۔ (اور ہوتی چلی جاتی ہے)○‘‘

لیکن ذات الٰہی چونکہ فقط ارادہ کرنے سے تخلیق کرتی ہے اور اپنی مخلوق کے نظم کے لئے اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے اس لئے وہ ایک انسان کو یا ایک ارب انسانوں کو خلق کرنا چاہے۔ اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ط اِنَّ اللهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ○ (۲)

’’تم سب کو پیدا کرنا اور تم سب کو (مرنے کے بعد) اٹھانا (قدرتِ الٰہیہ کے لئے) صرف ایک شخص (کو پیدا کرنے اور اٹھانے) کی طرح ہے۔ بیشک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے○‘‘

ولا یؤدہ حفظھما والے جملے کو گزشتہ جملوں سے اس طرح مربوط کیا جا سکتا

(۱) یٰس، ۳۶: ۸۲

(۲) لقمان، ۳۱: ۲۸

ہے: آیت الکرسی نے ابتداء سے یہ اعلان کیا کہ قابلِ بندگی معبود فقط وہ اللہ تعالیٰ ہے جو ’’حیّ و قیوم‘‘ ہے، تاکہ لوگ یہ جان لیں کہ اس ذاتِ الٰہی کے لئے مسلسل قیومیت ثابت ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ پھر فرمایا: ’’لا تاخذہ سنۃ ولا نوم‘‘ اس پر اونگھ یا نیند غالب نہیں آ سکتی اور بتایا کہ معبود واقعی تمام ارضی و سماوی موجودات کا مالک ہے ’’لہٗ مافی السموات وما فی الارض‘‘ اس کے بعد ’’یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم‘‘ کے ذریعہ اطلاع دی کہ اس جہان کا حقیقی مالک اس کی مالکیت رکھنے کے علاوہ اپنی مملوکہ اشیاء کی تمام خصوصیات اور جزوی تفصیلات کہ وہ گذشتہ ہوں یا آئندہ سب سے مکمل طور پر باخبر اور آگاہ ہے۔ آخر میں ’’وسع کرسیہ السموات والارض‘‘ کے ذریعے واضح فرمایا کہ اس مالک و عالم خدا نے اس جہان کو اپنی طاقت وقوت کے ساتھ نظم بخشا اور اس کی لم یزل ولا یزال قدرت ان تمام جہانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ پھر اس لئے کہ مبادا لوگ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو اپنی محدود توانائی پر قیاس کرنے لگیں اور انہیں اس غلط تصور سے دور رکھنے کے لئے فرمایا ’’ولا یؤدہ حفظھما‘‘ کہ وہ پروردگارِ عالم اس جہان آفرینش کی حفاظت و نگہبانی سے ضعف و سستی و ناتوانی و خستگی سے دوچار نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ عوارض اس کی ذات مقدس کو لاحق نہیں ہو سکتے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی قدرت و توانائی، انسان اور دیگر اشیاء کی توانائی سے دو اعتبار سے جدا ہے۔

اوّل: یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس لئے لازم و عین ذات ہے اور اس کی ذات سے ہی قائم ہے۔ جبکہ دیگر تمام ممکنات کی توانائی ان کی ذات کو عارض ہوتی ہے اور سب کی ذاتیں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں اور از خود قائم نہیں ہیں۔

دوم: یہ کہ تمام ممکنات کی توانائی محدود ہے اور ہر ممکن اپنے سے قوی تر توانائی والے کے سامنے مغلوب اور عاجز ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام اشیاء پر ہمیشہ غالب اور قاہر ہے۔ وہ کسی شے سے ہرگز مغلوب نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے قرآن حکیم میں خداوند تعالیٰ کی صفتِ قدرت ’’عزیز‘‘ کے ساتھ آتی ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ٥[(۱)]

’’بیشک آپ کا رب ہی طاقتور غالب ہے٥‘‘

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں: ’’والعزیز الّذی یقهر ولا یقر‘‘ عزیز وہ ہوتا ہے جو غالب رہے مغلوب نہ ہو۔

نتیجہ یہ ہے کہ اس جہانِ ہستی کا محافظ ونگہبان اللہ قوی وعزیز ہے۔ وہ اللہ کہ جس کی قدرت ہر چیز پر غالب وقاہر ہے اور کوئی شے حق تعالیٰ کی قدرت کو مغلوب ومقہور نہیں کرسکتی۔ اسی لئے خالق و مالک کے لئے اس جہانِ ہستی کی حفاظت، مشقت اور تھکاوٹ کا باعث نہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت آسمانوں اور زمین کی نگہبانی سے بھی مغلوب نہیں ہوتی۔ آیت الکرسی کے بارے میں بہت سی روایات منقول ہیں۔ ان سے اس آیت کریمہ کی متعدد جہات کی معنوی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ من جملہ ان کے، یہ ہے کہ آیت الکرسی کا پڑھنا آدمی کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت وحمایت میں قرار دیتا ہے اور اس کی جان و مال اور عزت ہر بلا اور خطرے سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو کوئی سوتے وقت آیت الکرسی پڑھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ معین کیا جاتا ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے تا آنکہ وہ بسلامت صبح کرتا ہے۔

ایک ایمان دار شخص جو اپنی حفاظت کے قصد سے آیت الکرسی پڑھتا ہے وہ خود کو خدا کے سپرد کرتا ہے۔ جب وہ ’’لا یؤده حفظهما‘‘ تک پہنچتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ جس سے اپنے پورے وجود میں آرام و اُمید کی ایک موج محسوس کرتا ہے۔ وہ خود کو ایک قابلِ اطمینان نظام کے اندر محسوس کرتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو اس خداوند قدیر کی حفاظت ونگہبانی میں دے دیا ہے جو اس بزرگ ترین جہان ہستی کی بغیر کسی مشقت و زحمت کے حفاظت کر رہا ہے، تو پھر یہ ضعیف سے انسان کی حفاظت اس کے لئے کیا مشکل ہے؟ وهو العلي العظيم.

(۱) هود، ۱۱:٦٦

ذاتِ الٰہی نے اپنے لئے ایسے اسماء کا انتخاب فرمایا جو بڑے بلند اور عظیم معانی پر مشتمل ہیں۔ اس نے لوگوں کو حکم فرمایا ہے کہ دُعا کے وقت اسے اس کی صفات اور اسماء کے ذریعے پکاریں۔

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا. (۱)

’’اور اللہ ہی کے لئے اچھے اچھے نام ہیں، سو اسے ان ناموں سے پکارا کرو۔‘‘

پروردگارِ عالم کے بعض اسماء اس کے صفاتِ ذات کے ترجمان ہیں مثلاً عالم و قدیر، سمیع و بصیر اور بعض اسماء صفات فعل سے عبارت ہیں مثلاً شافی، رازق، محی، ممیت۔

عليّ و عظیم، باری تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارک میں سے دونوں عالی ترین اسماء ہیں اور خود اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے لئے منتخب فرمایا ہے تاکہ لوگ اسے ان اسماء کے ذریعے پکاریں۔ کیونکہ اگر اِسے اس کے نام سے نہ پکارا جائے تو نام والے کی شناخت نہ ہو سکے گی۔ سب سے اوّلین نام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے منتخب فرمایا وہ ’’العليّ العظيم‘‘ ہے، کیونکہ یہ نام تمام اسماء الٰہی میں عالی ترین اسم ہیں۔ اس لئے کہ اس میں کلمہ ’’عليّ‘‘ آیا ہے کہ جو علو و برتری و بلندی کا معنی دیتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بلند و برتر ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

والعلي هو الرفيع القدر وإذا وصف الله تعالى به فمعناه يعلو أن يحيط به وصف الواصفين بل علم العارفين. (۲)

’’علي‘‘ کا معنی ہے رفیع القدر اور عالی منزلت، جب اس سے اللہ تعالیٰ کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ خداوند کریم اس سے بلندتر و

(۱) الاعراف، ۷: ۱۸۰

(۲) راغب اصفهانی، المفردات: ۳۵۹

بالاتر ہے کہ توصیف کرنے والوں کی توصیف اور معرفت حاصل کرنے والوں کا علم اس بلند ترین ذات کا احاطہ کر سکے اور اس مقدس حقیقت تک پہنچ سکے۔‘‘

العظيم أي العظيم الشان القادر الّذى لا يعجزه شئ والعالم الّذى لا يخفى عليه شئ لا نهاية لمقدور أنّه ولا.[1]

’’عظیم‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان الٰہیت کمال عظمت پر ہے۔ وہی وہ قادر ہے کہ کوئی شے اس کو عاجز نہیں کر سکتی اور وہ ایسا عالم ہے کہ کوئی چیز اس سے مخفی و پوشیدہ نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس کی قدرت لامحدود اور اس کا علم بے پایاں ہے۔‘‘

تمام مادی توانائیوں کا محدود ہونا تمام زندہ موجودات کا محنت اور کام سے تھک جانا اور اللہ تعالیٰ کا تمام مادی نقائص سے منزہ و مبرّا ہونا اور اس لم یزل و لایزال قدرت کا لامحدود ہونا۔ ان تمام اُمور کے بارے میں ہماری پیش کردہ معروضات کو سامنے رکھا جائے اور پھر ’’العليّ العظيم‘‘ کے اس مفہوم کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ جو آیت کے آخر میں ذکر ہوا ہے تو آیت الکرسی کے آخری جملے کی تفسیر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

وَلَا یَؤُوْدُهٗ حِفْظُهُمَاۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۝[2]

’’اور اس پر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) کی حفاظت ہرگز دشوار نہیں، وہی سب سے بلند رتبہ بڑی عظمت والا ہے۝‘‘

یعنی آسمانوں، زمین اور پورے جہان کے باعظمت محل کی حفاظت اس خداوند قادر و قدیر کے لئے بوجھل اور تھکا دینے والی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ذاتِ الٰہی تمام مادی نقائص سے بالاتر اور عجز و ناتوانی سے بلندتر ہے۔

قرآنِ حکیم میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ آیت کے آخر میں

---

(۱) راغب أصفهاني، المفردات: ۳۶۰

(۲) البقرة، ۲: ۲۵۵

اپنی چند صفات کا ذکر فرماتا ہے اور اس پر آیت کا اختتام فرما دیتا ہے۔ یہاں قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان تمام مقامات میں انہیں صفات کا ذکر فرماتا ہے جو اس آیت کے مضمون سے بہت زیادہ مناسبت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً جن آیات میں اللہ تعالیٰ اپنی حکومت اور کائنات پر فرماں روائی کی بات کر رہا ہوتا ہے تو وہاں آیت کا اختتام انہیں صفات پر فرماتا ہے جو اس کی سلطنت اور قدرت کو بیان کرتے ہیں۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ ز وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُo(۱)

''وہ ذات نہایت بابرکت ہے جس کے دستِ (قدرت) میں (تمام جہانوں کی) سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہےo''

الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاللهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌo(۲)

''جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی (ساری) بادشاہت ہے، اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہےo''

بعض ایسی آیات جن کے مضامین الٰہی نعمات پر مشتمل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی دو صفات عزیز اور حکیم پر ختم ہوئی ہیں۔ صفت ''عزیز'' کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اس سے لوگوں کو اُمید بندھ جاتی ہے۔ صفت ''حکیم'' بے جا توقعات رکھنے سے منع کرنے کے لئے ہے اور لوگوں کو سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم غیر معقول اور بے نظم نہیں بلکہ وہ پروردگار لوگوں پر اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق اپنی نعمتیں نازل کرتا ہے۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ الْعَزِيْزِ الْحَکِيْمِo(۳)

---

(۱) الملك، ۶۷: ۱

(۲) البروج، ۸۵: ۹

(۳) آلِ عمران، ۳: ۱۲۶

''اور مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بڑا غالب حکمت والا ہےo''

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَاِنَّ اللهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌo(۱)

''جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے تو (اللہ اس کے جملہ اُمور کا کفیل ہو جاتا ہے) بیشک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہےo''

ایسی آیات کہ جن میں لوگوں کو توبہ کی طرف راغب کرنے، اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانے اور رجوع کرنے کا بیان ہے، ان کا اختتام رحمت، مغفرت اور مہربانی کی صفات پر کیا گیا اور ایسی صفات کو لایا گیا ہے جو لوگوں کے لئے اُمید بخش ہوتے ہیں۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ ؕ اِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُo(۲)

''آپ فرما دیجئے: اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر لی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے، وہ یقیناً بڑا بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہےo''

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌo(۳)

''اور تم اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کے حضور (صدقِ دل سے) توبہ کرو، بیشک میرا رب نہایت مہربان محبت فرمانے والا ہےo''

جن آیات میں مشرکین کے عقائد کا بطلان اور خدا پرستی کی طرف دعوت دینے کا مضمون ہے انہیں عليّ، عظیم اور کبیر جیسی صفات پر ختم کیا گیا ہے۔

(۱) الانفال، ۸: ۴۹

(۲) الزمر، ۳۹: ۵۳

(۳) ھود، ۱۱: ۹۰

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِيْرُo(۱)

’’یہ اس لئے کہ اللہ ہی حق ہے اور بیشک وہ (کفار) اس کے سوا جو کچھ (بھی) پوجتے ہیں وہ باطل ہے اور یقیناً اللہ ہی بہت بلند بہت بڑا ہےo‘‘

آیت الکرسی کا بنیادی ہدف انسانی افکار کو بیدار کرنا اور بشر کو خود ساختہ معبودوں کی غلامی اور بندگی سے نجات دِلانا ہے۔ یہ آیت بھی ’’**العلي**‘‘ اور ’’**العظيم**‘‘ کی دو صفات پر ختم ہوئی ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ ان دو صفات کے ساتھ مشرکین کو ان کی جہالت کی طرف متوجہ کر رہا ہے اور انہیں سمجھا رہا ہے کہ تم کس قدر نادان لوگ ہو کہ عقل کا خون کر رہے ہو اور اپنی انسانیت کو پامال کر رہے ہو۔ تم اپنے نادان آباء واجداد کی پیروی میں چند ایک ایسی سماوی اور ارضی اشیاء کو معبود بنائے بیٹھے ہو جنہیں اس خداوند خالق نے خلق فرمایا ہے۔ تم ان چیزوں کو اس خداوند قدیر کا شریک قرار دیئے ہوئے ہو اور ان گھٹیا اور پست اشیاء کے سامنے بندگی اور پرستش کے لئے سر جھکا دیتے ہو۔ اگر تم اپنے عقول سے کام لیتے اور انصاف کے برخلاف کسی جاہلانہ چیز یا کسی حیوان کو خداوند عظیم کا شریک مان لو کہ اللہ تعالیٰ علي و عظیم ہے۔ وہ خدا تو اس سے بلند و بالا ہے کہ کسی قسم کی کوئی مخلوق اس کی شریک بن سکے۔ وہ اس سے برتر ہے کہ یہ عاجز و ناتواں اس کے ہمسر قرار پائیں اور ان کی پرستش کی جائے۔

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِکُوْنَo(۲)

’’اس کی ذات پاک ہے اور وہ ان سب چیزوں سے بلند و بالا ہے جنہیں یہ (اس کا) شریک گردانتے ہیںo‘‘

(۱) الحج، ۲۲: ۶۲

(۲) یونس، ۱۰: ۱۸

آیت الکرسی توحید اور عبادت کے حوالے سے تعارف کروا رہی ہے اور انسان کو ایک خدا کی پرستش کی ہدایت کر رہی ہے کہ یہ توحید پرستی ہی انسانوں کی آزادی کی بنیاد ہے۔ وہ لوگوں کو اس حقیقی معبود کی شناخت کروا رہی ہے جو عبادت کے لائق ہے اور انہیں ایسے بناوٹی خداؤں کی پرستش سے نجات دلا رہی ہے کہ جنہیں خود رائی کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرتی ہے اور معاشرے کے اندر ایک فکری حرکت کو جنم دیتی ہے۔ وہ لوگوں کو شرک و بت پرستی کے تاریک ماحول سے باہر نکالتی ہے اور انہیں توحید و آزادی کی نورانی فضاؤں کی سیر کراتی ہے۔ مختصر یہ کہ آیت الکرسی انسانوں کی آزادی کا نعرہ اور ان کی سعادت ابدی کا اعلان ہے۔

آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان میں یہ آخری صفت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و بلندی کو بیان کیا اور بتایا گیا کہ عظمت و بلندی صرف اِسی کی ذات کے ساتھ خاص ہے اور وہ تنہا عظمت و بلندی والا ہے اور تمام دیگر صفات کی طرح اِس صفت میں بھی اِس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ کوئی انسان جب بھی کبریائی اور بلندی کے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اِسے دوبارہ پستی اور ذلت میں پہنچا دیتا ہے اور اُسے عذابِ آخرت اور دنیا کی رسوائیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

انسان خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ ہو جائے اور کتنی ہی عظمتیں حاصل کر لے مگر مقامِ عبودیت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا اور یہی حقیقت اگر نفسِ انسانی میں پوری طرح جاں گزیں اور قلب اِنسان میں پوری طرح مرتسم ہو جائے تو انسان کبھی بھی تکبر، غرور، انحراف اور سرکشی اختیار نہ کرے۔ بلکہ ہر وقت اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ وخوف وخشیت رہے اور اس کا شعور و ادراک اس کے جلالِ عظمت و کبریائی کے سامنے جھکا رہے اور وہ اُس کے ادب اور اُس کے حقوقِ بندگی میں کوتاہی نہ کرے اور نہ اُس کے بندوں پر اپنی بڑائی کا سکہ جمانے کی کوشش کرے۔ گویا اس صفت کا جہاں اعتقادی ونظری پہلو ہے وہاں اس کا عملی پہلو بھی ہے جو اِنسان کو ہمہ وقت پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

العظیم، عظیم کا مطلب ہوتا ہے نہایت باعظمت، بہت ہی بلند و بالا مرتبے والا، یہ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی ایک صفت ہے۔ یہ عظمت سے صفتِ مشبہ واحد مذکر ہے۔ اس کے دیگر معانی میں نہایت بزرگی والا، بہت ہی ناز والا ہر طرح کی بڑائی اور عظمت کا مالک۔ **العليّ العظيم** وہ ہے جو انتہائی عظمتوں والا ہے۔ سب کی سب بڑائیاں اور عظمتیں اسی کے لیے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس اللہ العظیم میں بدرجہ اتم موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عظیم تمام تر بڑائیوں، تمام تر برتریوں، تمام تر شانوں، تمام تر کی بزرگیوں ہر طرح کی شان وشوکت ہر طرح کے فخر اور غرور وتکبر والی ہے۔ اس لفظ کا ایک مطلب بہت بڑا اور سب سے بزرگ تر کا بھی ہوتا ہے۔ اللہ العظیم کی ذات اور ہستی بڑی ہی بلند و بالا، عظیم الشان اور تمام تر اوصاف اور عظمتوں والی ہے۔ اس کے علم، اس کی قدرت وحکومت وسلطنت اور اس کی وسعت کو انسان الفاظ و جذبات کے حوالے سے بیان کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی ذاتِ اقدس کو انسان اپنے محدود اور مادی پیمانوں پر قیاس کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو دنیاوی اور مادی پیمانوں سے ناپنے کی ہرگز کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کوئی اس طرح کی کوشش کرتا ہے تو وہ گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہیں سے اس کے لیے غلط فہمیوں اور شکوک وشبہات کی راہیں کھلتی ہیں اور وہ وادی شرک میں گر جاتا ہے۔ اس لیے اللہ ''**العليّ العظيم**'' اپنی صفات کے بارے میں جو خود بتاتا ہے ہمیں اسی پر ایمان لانا چاہیے۔ اس لیے ہر طرح کے ظن و قیاس اور تشبیہ وتمثیل سے ہمیں بچنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت اور عظمت و جلالت بیان کرنے کی خاطر محض خیال آرائیوں ہی کے تانے بانے نہ بنے جائیں بلکہ صرف اسی پر توجہ دی جائے کہ جس حد تک اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود ہی اپنے بارے میں بحوالہ قرآن و صاحبِ قرآن ﷺ بتایا ہے۔

اللہ تعالیٰ عظیم ترین قوتوں اور اختیارات کا مالک ہے۔ یہ اسی عظیم ہستی کا نظام ہے کہ یہ اتنی بڑی کائنات کا ہر معاملہ اور ہر نظام چل رہا ہے۔ اس کائنات میں اور کوئی

صاحب اقتدار نہیں ہے۔ وہی عظیم سب کو زندگی عطا کرتا ہے لیکن وہ عظیم اپنی زندگی کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ وہ ہر شے کو توازن اور قیام عطا کرتا ہے۔ لیکن اسے اپنے قیام کے لیے کسی بھی سہارے کی ضرورت اور حاجت نہیں۔ وہ کائنات کی حفاظت سے نہ کبھی غافل ہوتا ہے نہ بے خبر۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو کسی کا ساتھی بن کر قانونِ خداوندی کے خلاف اس کی مدد کر سکے۔ یہ مدد بھی قانونِ خداوندی کے مطابق ہوسکتی ہے جو کچھ اس کائنات میں سامنے ہے اور جو کچھ اس کے پیچھے ہے اور جو کچھ ہے پوشیدہ ہے اللہ تعالیٰ سب کا علم رکھتا ہے اور اس کے علم ذاتی میں سے کسی کو ذرّہ برابر بھی نہیں مل سکتا۔ بجز اس طریق کے جو اس کے قانون مشیت نے رکھا ہے یعنی علم غیب عطائی۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عظیم اس کے فضل کے ساتھ مرکب صورت میں بھی زیادہ بار استعمال ہوئی ہے اور اس فضل کو بھی یہ صفت بے پایاں اور وسیع تر کر دیتی ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ الواقعہ میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت عظیم بطور ''ربِ عظیم'' آئی ہے اور اس عظیم رب کی اس عظیم صفت جمالی کے ساتھ ایک تنبیہ کے طور پر حکمیہ انداز واسلوب میں کہا گیا ہے کہ اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو کیونکہ اس نے تمہیں بے شمار نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ ''کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اس کا درخت تم نے پیدا کیا یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو گویا یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے سامان زیست بنایا ہے۔ پس اے نبی! اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔

یہاں پر اللہ العظیم کی تسبیح کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس رب عظیم کا مبارک نام لے کر یہ اظہار واعلان کیا جائے کہ وہ اللہ العظیم ان تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو کفار و مشرکین اس سے منسوب کرتے ہیں اور جو کفر وشرک کے ہر عقیدے اور منکرین آخرت کے ہر استدلال میں مضمر ہیں لیکن وہ اللہ تعالیٰ تو ہر حال میں عظیم تر عظمتوں والا ہے۔ اللہ تعالیٰ صاحب عظمت، بزرگ و برتر ہے۔ اپنی عظمت اور برتری میں

بے مثال ہے۔ ستائش بنانے کے لیے سرگرم عمل رہو یعنی اسے اس انداز میں متشکل کرو کہ ساری دنیا پکار اُٹھے کہ فی الواقعہ قابل صد ہزار حمد و ستائش اور عظیم الشان وہی ذات ہے جس کا نظام ایسے خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج پیدا کرتا ہے اور یہی اس ذات کی حمد اور تسبیح ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ اپنی صفتِ عظیم کے باعث اپنے بندوں پر بے پناہ فضل و کرم، عظمتوں کے سائے اور عظمت بھری نعمتوں کی فراوانیاں جاری و ساری رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت اور فضل و کرم کے لیے چن لیتا ہے اور وہ تو عظیم ترین عظمتوں والا ہے۔ بس وہی اللہ تعالیٰ ہی ایک سب سے بڑی اور سب سے بزرگ و برتر ذات ہے۔ اس کی عظمتوں کا کوئی ثانی ہی نہیں ہے۔ ہر طرح کا شرف و فضل اور عظمت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور وہ اپنی عظیم سے عظیم تر عظمتوں کے ساتھ بڑا ہی وسیع النظر بھی ہے اور ہر شے پر قادر اور مقتدر ہے۔ اس کا فضل بہت بڑا ہے اور یہ سب اس لیے ہے کہ وہ ”ذو الفضل العظیم“ ہے۔ اس کی عظمتیں بے حد و حساب ہیں۔ اللہ العظیم اپنی بلندیوں، رفعتوں اور عظمتوں کی بے پناہ وسعتوں اور دامانِ عظمت میں اس قدر کشادگی ہے کہ وہ انسانوں کی مغفرت کرنے میں بھی دریا دلی سے کام لیتا ہے اور ہر طرح کی خطاؤں کو اپنی شان غفاری کے تحت بخش دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل فرمانے والا اور بے پناہ عظمتوں والا ہے۔ اس العلي العظیم کی اس ساری کائنات میں خدائی ہے اور پوری کائنات اور اس کے اندر جہاں جہاں جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب اسی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کا مالک و خالق ہے۔ اس مالک کے ساتھ اس کی ملکیت میں کسی اور کی خداوندی نہ تو چل سکتی ہے اور نہ اس کی کوئی گنجائش ہے وہ دوسرے جو اپنی خداوندی چلانا چاہتے ہیں کہ وہ تو خود اسی اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور پھر وہ تو سب سے برتر اور عظیم ہے۔ یعنی اس سے بالاتر اور بزرگ تر اور اس کا کوئی ہمسر ہو ہی نہیں سکتا، وہ اپنی عظمتوں میں سب سے عظیم اور یکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی کو ایک اور انداز سے بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باتوں

اور اس کے علم اور اس کے منصوبوں کو اپنے محدود علم سے ناپنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ عالی اور العلی تمام غائب و حاضر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ بڑی ہی عظیم ہستی ہے اور اس کی بارگاہ بہت بلند ہے، وہ اپنے ارادوں کے بھیدوں کو خود ہی جانتا ہے۔ دوسرے اس میں سے صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا وہ ان پر ظاہر کر دیتا ہے۔

نظامِ کائنات اور معرفتِ ربانی

قرآن حکیم مختلف طریقوں سے عام لوگوں کو معرفتِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر ان کے اذہان کو دنیا کی آفرینش اور اس نظام کی طرف متوجہ کرتا ہے جو اس دنیا میں حکومت کر رہا ہے اور جاری و ساری ہے اور پھر انفس و آفاق کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنی چند روزہ زندگی میں جو راستہ یا طریقہ بھی اختیار کرے یا جس حالت میں زندگی گزارے وہ دنیائے فطرت اور اس میں موجودہ نظام کی حکومت سے ہرگز باہر نہیں نکلا جا سکتا اور اس کا شعور و ادراک زمین و آسمان کے عجیب و غریب مناظر کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ وسیع جہانِ ہستی نظام کائنات جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس کا ہر ایک جزو اور ذرہ کلی طور پر ہمیشہ تغیر و تبدل کا شکار ہے اور ہر لحظہ اس کی شکل و صورت دگرگوں ہو کر ایک نیا روپ دھار لیتی ہے جو پہلے سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور پھر قوانین کے زیر اثر جس میں استثناء موجود نہیں ہے، حقیقت اور اثبات کا لباس پہن لیتی ہے اور اس طرح بہت بلند اور دور کہکشاؤں سے لے کر چھوٹے چھوٹے ذرے تک جن سے اس جہان کی تشکیل و تکمیل ہوئی ہے، ہر چیز ایک خاص اور واضح نظام میں حرکت کرتی ہے۔ بڑے حیرت انگیز طریقے سے یہ ساری چیزیں اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں لہٰذا سب اشیاء اپنے دائرہ عمل کو بہت ہی پست اور نچلی سطح سے مکمل ترین حالت کی طرف بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ تکمیل کے مرحلے تک پہنچ جاتی ہیں اور خصوصی نظاموں، عمومی نظاموں اور آخرکار عام دنیاوی نظام سے بالاتر جن کے بے شمار اجزاء ایک دوسرے کو آپس میں مربوط کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے نظاموں کو آپس

میں ملاتے ہیں اور اپنی دائمی حرکت میں ہرگز کسی استثناء کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی ان نظاموں میں کسی قسم کا کوئی ہرج پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر فطرت کا نظام انسان کو زمین میں جگہ دیتا ہے تو اس زمین کے وجودی ڈھانچے کو اس طرح ترکیب دیتا ہے کہ اس کی زندگی اور ماحول کے ساتھ سازگار ہو اور پھر اس زندگی اور ماحول کو اس طرح بناتا ہے کہ ایک مہربان دایہ کی طرح مہر و محبت کے ساتھ اس کی پرورش کرتے ہوئے کائنات کی ہر چیز مثلاً سورج، چاند، ستارے، پانی، مٹی، دن، رات، سال کے موسموں، بادل، ہوا، بارش، زمین کے نیچے اور زمین کے اوپر موجود ذخائر اور خزانے اور آخر کار اپنی قدرت اور طاقت کے تمام وسائل اور سرمائے کو اس کے آرام و آسائش کی خاطر کام پر لگائے رکھتا ہے۔ ہم ایسے رابطے اور تعلق کو دنیا کے ہر مظہر اور اس کے اردگرد اور ہمسایہ چیزوں کے درمیان مشاہدہ کرتے ہیں یعنی دنیا کے تمام مظاہر جن میں انسان زندگی گزارتا ہے آپس میں مربوط ہیں۔ کائنات کے ہر مظہر کے داخلی نظام میں بھی اس قسم کا تعلق اور ربط موجود اور ظاہر ہے۔ اگر فطرت نے انسان کے لئے روٹی مہیا کی ہے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ اور کھانے کے لئے منہ اور چبانے کے لئے دانت بھی دیئے ہیں اور ان تمام چیزوں کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک قسم کے منقسم ذرائع کے ساتھ آپس میں منضبط کر رکھا ہے یعنی ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے۔ دنیا کے ماہرین اور دانشور اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رکھتے کہ وہ بے شمار تجربے جو اُنہوں نے اپنی چھ ہزار سالہ علمی کاوشوں کے ذریعے حاصل کئے ہیں وہ فطرت اور کائنات کے اسرار میں سے ایک بہت ہی معمولی جلوہ ہیں جس کے پیچھے ایک بہت ہی طویل اور بے انتہاء سلسلہ موجود ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ ہر تازہ انکشاف انسان کے سامنے بے شمار مجہولات یعنی جن چیزوں کا علم نہ ہو لے آتا ہے اور جس میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وسیع جہان ہستی کائنات جس کے تمام اجزاء الگ الگ ہوتے ہوئے بھی آپس میں ایک مضبوط اتحاد اور وحدت و اتصال اور حیرت انگیز اتفاق رکھتے ہیں اور یہ سب ایک لامتناہی طاقت اور علم کو بیان کرتے ہیں۔ ان کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے اور یہ سب کچھ اپنے آپ عبث اور

فضول پیدا ہو گیا ہے۔ آیا یہ جزئی اور کلی نظامات اور آخر کار دنیا کا عمومی نظام جس نے دنیا کے لا انتہاء اجزا کو آپس میں مربوط اور مستقل کر کے ایک بڑا متحدہ کائناتی نظام (One Unit Universal System) بنا دیا ہے۔ اپنے منظّم قوانین کے ساتھ جس میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ کیا یہ سب کچھ بغیر کسی نقشے کے اتفاقیہ طور پر بن گیا ہے؟ یا ان میں سے ہر ایک مظہر اور کائنات کے چھوٹے بڑے ماحول نے اپنی پیدائش سے پہلے ہی اپنے لئے ایک خاص نظام اور طریقہ انتخاب کر لیا ہے؟ اپنی پیدائش کے بعد اس نظام کو خاص موقع و محل کے مطابق نافذ اور جاری کرتا ہے۔ البتہ وہ انسان جو ہر حادثے واقعے اور مظہر کو ایک علت اور سبب حادثے سے منسوب کرتا ہے اور کبھی کبھی ایک مجہول سبب اور علت کو پیدا کرنے کے لئے مدتوں بحث، کوشش اور جستجو میں گزار دیتا ہے اور کبھی کبھی علمی کامیابیوں کے پیچھے چکر لگاتا رہتا ہے، وہ انسان جو ان چند اینٹوں کو دیکھ کر جو بڑی ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے اُوپر نیچے رکھی گئی ہوں، اس کو ایک طاقت اور علم کے ساتھ منسوب کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے اتفاق اور حادثے کی نفی کرتے ہوئے اس کو ایک نقشے اور مقصد کا نتیجہ سمجھتا ہے، وہ ہرگز اس بات پر تیار نہیں ہو گا کہ اس کائنات اور جان ہستی کی پیدائش کو بے سبب اور بے علت سمجھے یا دنیا کے نظام کو ایک اتفاقیہ حادثہ خیال کرے۔ پس یہ جہاں اور کائنات ایک خاص نظام کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں اور وہی نظام اس میں حکومت کرتا ہے اور اس کا پیدا کرنے والا بہت ہی عظیم ہے، جس نے اپنے بیکراں اور ختم نہ ہونے والے علم اور طاقت کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اور اس کو ایک خاص نہج اور طریقے یا ہدف کی طرف چلا رہا ہے اور وہ وقتی اور چھوٹے چھوٹے حوادث اور بعض دوسرے اتفاقات جو اس جہاں میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب حالات و واقعات اسی نکتے تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں ہر طرف سے اسی خدا کی تسخیر اور احاطے میں واقع ہیں ۔ ہر چیز اپنی زندگی میں اسی پروردگار کی محتاج ہے اور وہ کسی چیز کا محتاج یا نیاز مند نہیں ہے اور اس کا کوئی منبع یا سرچشمہ نہیں ہے نہ اس کو کسی نے پیدا کیا اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ **لم یلد ولم یولد**.

آیت الکرسی اور عقیدۂ توحید

آیت الکرسی میں بنی نوع انسان کو دنیا کی تخلیق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ وہ انہیں دعوت دیتی ہے کہ وہ موجوداتِ دنیا اور ’’اپنے نفسوں‘‘ کے بارے میں غور و فکر کریں کیونکہ اپنی چند روزہ دنیاوی زندگی میں انسان خواہ کوئی راستہ اختیار کرے یا کسی حالت میں بھی ہو عالمِ ہستی سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس کی عقل اور قوتِ ادراک آسمان اور زمین کے ان عجیب و غریب نظاروں کو نظر انداز نہیں کر سکتی جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں یہ وسیع عالمِ ہستی جو ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ پورے کا پورا اور اس کے تمام اجزا مسلسل تغیر و تبدل کی حالت میں ہیں۔ یہ ہر لحظہ اپنے آپ کو ایک نئی اور انوکھی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ ان قوانین کے زیرِ اثر حقیقت کا روپ دھارتا ہے جن میں کوئی استثناء نہیں۔ بعید ترین کہکشاؤں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذروں تک جو اس کائنات کے اجزاء ہیں مخلوق کا ہر حصہ ایک اندرونی نظام رکھتا ہے۔ جو حیرت انگیز طریقے پر ایسے قوانین کے تحت چلتا ہے جن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ دنیا اپنا دائرہ کار پست ترین حالت سے کامل ترین حالت تک وسیع کرتی ہے اور خود اپنے کمال کی منزل تک پہنچتی ہے۔ ان نظاموں سے بالاتر زیادہ عالمگیر نظام ہیں اور بالآخر مجموعی کائناتی نظام ہے جو دنیا کے لاتعداد حصوں کو یکجا کرتا ہے اور مخصوص نظاموں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ یہ نظام مسلسل جاری ہے اور کسی استثناء یا خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیتا۔ تخلیق کا نظام ایسا ہے کہ مثال کے طور پر اگر وہ کسی شخص کو زمین پر وارد کرتا ہے تو اُسے ایسی بناوٹ عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول میں خوش اُسلوبی سے رہ سکے وہ ماحول کو یوں ترتیب دیتا ہے کہ وہ اس شخص کی پرورش ایک مہربان دایا کی طرح کرتا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پانی، زمین،

رات، دن، سال کے مختلف موسم، بادل، ہوا، بارش، زمین کی سطح پر بکھرے ہوئے اور اس کے اندر چھپے ہوئے خزانے۔ غرض کہ فطرت کی تمام قوتیں اس شخص کی بہبود اور تسکین خاطر کے لئے سرگرم عمل ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کی یگانگت اور ہم آہنگی مظاہر کے درمیان اور خود اس کے گھر میں موجود ہوتی ہے۔ اس قسم کا تسلسل اور ہم آہنگی دنیا کے ہر مظہر کی اندرونی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر تخلیق نے انسان کو خوراک عنایت کی ہے تو اسے وہ خوراک تلاش کرنے کے لئے پاؤں، پکڑنے کے لئے ہاتھ، کھانے کے لئے منہ اور چبانے کے لئے دانت دیے ہیں۔ اس نے متعدد ذریعوں سے جو ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں انسان کو تخلیق کے آخری مقصد سے منسلک کر دیا ہے۔

صفاتِ خداوندی سے ربط و تعلق کی اہمیت

آیت الکرسی میں وارد صفاتِ الٰہی کی رو سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے بلند، پاکیزہ اور مکمل تصور اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کے مقصود و منتہٰی کا تعین، خدا کے تصور پر موقوف ہے۔ جس قسم کے خدا کا تصور کسی کے ہاں ہوگا۔ اُسی قسم کی اُس فرد کی زندگی اور اس جماعت یا قوم کا معاشرتی نقشہ ہوگا۔ لہٰذا اللہ کا جو تصور قرآن حکیم نے پیش کیا ہے، وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاروانِ انسانیت کو جو راہنمائی قرآن حکیم کی رُو سے ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس قسم کا خدا کا تصور ہمارے سامنے ہو گا اسی قسم کی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی ہو گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی کا خدا کے تصور کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی تعلق ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

صفاتِ خداوندی کا اعمالِ اِنسانی پر اثر

اللہ تعالٰی کے اسماء و صفات کا عقیدہ دینِ اِسلام میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یعنی اس کے یہ محامد و اوصاف اخلاق انسانی کا معیار ہیں، ان

اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں اور جو بندہ کی حیثیت سے طاقت سے زیادہ ہیں۔ بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لئے قابل تقلید ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ سے نسبت کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور ان کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی پیروی کی خواہش کرے۔ محامد الٰہی گویا اُستاد اصلی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صفاتِ خداوندی کا پہلا سبق یہ ہے کہ ''اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً'' (البقرہ: ۳۰) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔ خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا۔ یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ (۱)

''(کہہ دو ہم) اللہ کے رنگ (میں رنگے گئے ہیں) اور کس کا رنگ اللہ کے رنگ سے بہتر ہے اور ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں ○''

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس خدائی رنگ سے مقصود خدا کا دین فطرت ہے۔ حدیث شریف ہے:

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ. (۲)

''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔''

---

(۱) البقرہ، ۲: ۱۳۸

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن ضرب الوجه، ۴: ۲۰۱۷، رقم: ۲۶۱۲

۲۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۳: ۱۸، رقم: ۵۷۱۰

صورت سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل وصورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور انسان کو اخلاق وصفت میں مالائے اعلیٰ سے تشبیہ اور ہمشکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیاء اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ تخلقوا باخلاق اللہ، ''خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو'' کا مطلب ہے، حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ

حسن الخلق خلق اللہ الأعظم.(۱)

''حسن خلق اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کاملہ کی تین قسمیں ہیں، جلالی، کمالی اور تنزیہی صفات۔ جلالی جو کبریائی عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی وعبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں۔ ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں۔ یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری۔ اسی لئے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اِسی لئے حضرت آدم علیہ السلام جنہوں نے فروتنی اختیار کی اور عجز وقصور کا اعتراف کیا وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوئے اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ وَکَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ○(۲)

''اس نے انکار اور تکبر کیا اور (نتیجۃً) کافروں میں سے ہو گیا ○''

قرآن حکیم میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں:

(۱) طبراني، المعجم الأوسط، ۸: ۱۸۴، رقم: ۸۳۴۴

(۲) البقرۃ، ۲: ۳۴

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ص وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○[(۱)]

’’اور آسمانوں اور زمین میں ساری کبریائی (یعنی بڑائی) اسی کے لئے ہے اور وہی بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے ○‘‘

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

العظمة إزاري والكبرياء ردائي فمن نازعني واحدا منهما ألقيته في النّار.[(۲)]

’’عزت میرا لباس اور کبریائی میری چادر ہے جو کوئی عزت و کبریائی میں سے کسی ایک میں بھی میرا حریف بنے گا میں اسے دوزخ میں ڈال دوں گا۔‘‘

دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

’’اللہ کے نزدیک سب سے برا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے اللہ کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک حقیقی نہیں۔‘‘[(۳)]

اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (الحشر ۵۹: ۲۳) اسی کی شان ہے البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزّت و جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور اُمتوں پر نازل کرتا ہے اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے۔ مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح اُمتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور

---

(۱) الجاثية، ۴۵: ۳۷

(۲) ۱۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۵: ۳۲۹، رقم: ۲۶۵۷۹

۲۔ مقدسي، الأحاديث المختارة، ۱۰: ۲۷۳، رقم: ۲۸۵

(۳) مسلم، الصحيح، كتاب الآداب، باب تحريم التسمى بملك الأملاك وبملك الملوك، ۳: ۱۶۸۸، رقم: ۲۱۴۳

ربّانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سر نیاز اظہار بندگی کے لئے اِس کے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص اللہ تعالیٰ کی شان تھی جس کا فیضان رسول ﷺ پر ہوا اور رسول ﷺ کی وساطت سے مومنوں پر ہوا یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ.(۱)

’’حالانکہ عزّت تو صرف اللہ کے لئے اور اس کے رسول (ﷺ) کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔‘‘

مستدرک حاکم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

’’اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں وہ اپنی عزت و جلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے تو جو شخص اسی عزت کے سوا جو اللہ کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے، معزز بننا چاہتا ہے تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنا تھا اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے اللہ اس پر رحمت کرتا ہے کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ اللہ کی اس چادر کو اُتارنا چاہتا ہے جو اللہ ہی کے لئے تھی۔‘‘(۲)

اللہ کی صفاتِ کمال میں سے وحدانیت اور بقائے ازل و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے، صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں،

(۱) المنافقون، ۶۳: ۸

(۲) ۱۔ حاکم، المستدرك على الصحيحين، ۲: ۴۸۹، رقم: ۳۶۸۵

۲۔ سيوطي، الدر المنثور، ۷: ۴۳۱

ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

اللہ کی صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لئے حسب دستور کھلا ہوا ہے۔ ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفوو درگزر ہے۔ عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر، جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں۔ اِسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے اس کے ہاں یہ ہے کہ ’’اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جوکوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا‘‘ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ○ (۱)

’’اگر تم کسی کارِ خیر کو ظاہر کرو یا اسے مخفی رکھو یا کسی (کی) برائی سے درگزر کرو تو بیشک اللہ بڑا معاف فرمانے والا بڑی قدرت والا ہے ○‘‘

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی۔ سزا کا منظر دیکھ کر حضور نبی اکرم ﷺ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ ادا شناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ’’امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو۔ اللہ معاف کرتا ہے اور عفو و درگزر کو پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا

(۱) النساء، ۴: ۱۴۹

ہے۔(۱)

حضور نبی اکرم ﷺ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا۔ وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا: اِنَّ اللہ ﷻ جمیلٌ یحبُ الجمال ’’اللہ تعالیٰ اچھا ہے، جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ غرور تو حق کو چھپانا اور لوگوں کو کمتر سمجھنا ہے۔‘‘(۲)

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرتا اور انسانوں کو دباتا ہے۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی انہی الفاظ کے ساتھ ہے، خدا جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔‘‘ یہ روایت بھی ہے ’’خدا جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے، سخاوت کو پسند کرتا ہے۔ صاف ستھرا ہے، صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔‘‘ روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔ وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاق عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔

ایک موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں: ’’اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔‘‘(۳)

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔ رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی

---

(۱) حاکم، المستدرك علی الصحیحین، ۴: ۴۲۴، رقم: ۸۱۵۵

(۲) مسلم، الصحیح، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر وبیانه، ۱: ۹۳، رقم: ۹۱

(۳) ۱۔ بخاري، الصحیح، کتاب استتابة المرتدین والمعاندین وقتالهم، باب إذا عرض الذمي وغیره بسب النبي، ۶: ۲۵۳۹، رقم: ۶۵۲۸

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الرفق، ۴: ۲۰۰۳، رقم: ۲۵۹۳

رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے، لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''(۱)

رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''رحم کی جڑ رحمان سے ہے، اللہ فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع رحم کرے گا میں ان کو قطع کروں گا، جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا۔ ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے'' میں خدا ہوں میں رحمان ہوں، میں نے رحم پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا، جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔'' پھر فرمایا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اِس پر رحم نہیں کرتا۔'' بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں'' جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے رحم کے سو (۱۰۰) حصے کئے ۹۹ اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ مخلوق کو عطا فرمایا۔''

بخل خدا کی صفت نہیں، مگر آپ ﷺ نے فرمایا ''تم اپنی تھیلی کے منہ بند نہ کرو، ورنہ تم پر بھی تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔'' یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا، یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ ''جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمہاری مدد میں ہے۔'' ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا سے بڑھ کر کوئی غیرتمند نہیں، اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔'' اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا بھی غیرت والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔'' اللہ

(۱) أبو داود، السنن، کتاب الأدب، باب فی الرحمة، ۴: ۲۸۵، رقم: ۴۹۴۱

تعالیٰ ظلم سے پاک ہے:

وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ۝[۱]

"اور بیشک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۝"

اس لئے اس کے بندوں پر فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

یا عبادِي إِنِّي حرّمت الظّلم علی نفسي وجعلته بینکم محرماً فلا تظالموا.[۲]

"اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔"

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک و صاف رہنا چاہیے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إنّ اللہ طیب یحبّ الطّیب، نظیف یحبّ النظافة، کریم یحبّ الکرم، جوّاد یحب الجود فنظفوا أراہ قال: أفنیتکم ولا تشبھوا بالیھود.[۳]

---

(۱) آل عمران، ۳: ۱۸۲

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، ۴: ۱۹۹۴، رقم: ۲۵۷۷

۲۔ ابن حبان، الصحیح، ۲: ۳۸۵، رقم: ۶۱۹

(۳) ۱۔ ترمذي، السنن، کتاب الأدب، باب ما جاء في النظافة، ۵: ۱۱۱، رقم: ۲۷۹۹

۲۔ أبو یعلی، المسند، ۲: ۱۲۱، رقم: ۷۹۰

’’اللہ تعالیٰ پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے، پاک و صاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند فرماتا ہے، کریم ہے کرم کو پسند فرماتا ہے، سخی ہے سخاوت کو پسند فرماتا ہے۔ سو تم بھی پاک و صاف رہا کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے شاید فرمایا کہ اپنے گھروں کو صاف ستھرا رکھو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو۔‘‘

عقیدۂ توحید کے ثمرات و برکات

صحیح عقیدۂ توحید سے انسان نے انسانیت کا مرتبہ پہچانا اور مخلوقات کا خوف نکل گیا۔ سورج، چاند، سیارے، ستارے، دریا، پہاڑ اور تمام چیزیں جو آقا کے منصب پر فائز تھیں اب بجائے آقا کے غلام بن گئیں۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں اور راہبوں کی حکومت نے بلند و پست، نشیب و فراز اور شریف و ذلیل کے مختلف طبقات میں منقسم کر دیا تھا جس کی وجہ سے دنیا سے مساوات عنقا ہو گئی تھی۔ عقیدۂ توحید کی تعلیم نے ان کو مساوی حقوق کا حق دار قرار دیا۔ اِسلام نے بتایا کہ اگر کوئی وجہ امتیاز ہے تو تقویٰ اور صرف خدا کی فرمانبرداری پر۔ نہ گورے کو کالے پر فضیلت اور نہ کالے کو گورے پر فضیلت، نہ آقا کو غلام پر فضیلت اور نہ غلام کو آقا پر فضیلت ہے۔ اِسلام نے تہذیبِ نفس، تربیتِ اخلاق، اُخوت و محبت کی نعمت کو عام کیا۔ تمام کائنات کو مساوات و اُخوت کی روشنی سے منور کیا۔ خاندانی گروہ بندیوں اور نسل و نسب کے بتوں کو توڑ کر چکنا چور کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے تمام انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ تمہارا خدا ایک ہے، ایک قانون ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو، سب کا درجہ برابر ہے، سب کو مساویانہ حقوق حاصل ہیں۔ قوانین کے معاملہ میں سب برابر کے جواب دہ ہیں۔ شاہ و گدا کو قانون کے سامنے کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ اسلام کو صرف ایک مذہب کے نام سے تعبیر کرنے سے اس کی عالمگیر افادیت کو محدود نہیں کرنا چاہئے بلکہ اِسلام ایک فطری ضابطۂ حیات، ایک لائحہ عمل، نوعِ انسانی کے لئے ایک عادلانہ نظام اور ایک صحت مند فکری انقلاب ہے اور چونکہ یہ قانون، یہ ضابطہ حیات اور ہمہ گیر پروگرام خدا کے تصور

سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اس کے قبول کرنے کی استعداد رکھی ہوئی ہے۔ اس سے بڑھ کر بقائے نسلِ انسانی کا ضامن اور اس کی قدروں کا محافظ کوئی قانون نہیں ہوسکتا۔ اس نظام میں دنیا کے تمام انسان اللہ کی رعیت ہیں نہ کوئی خادم نہ مخدوم، نہ کوئی آقا نہ غلام، سب کی حیثیت برابر، سب کے حقوق یکساں، کسی خاندان یا قبیلہ یا گروہ کو کوئی امتیاز یا فوقیت حاصل نہیں ہے۔ تمام انسان ایک سلسلہ کی کڑی اور ایک ہار کے موتی ہیں۔ نسل و رنگ و زبان اور فوقیت وغیرہ وجہ امتیاز نہیں بن سکتی۔ اِسلام کے نزدیک صرف ایک اُصول ہے۔ ''اِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاکُمْ'' ''جو سب سے زیادہ تقویٰ سے نکھرا ہوا ہے وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم ہے۔''

عقیدۂ توحید کا قائل کبھی تنگ نظر نہیں ہوسکتا۔ نسل و رنگ خاندان وقبیلہ میں وہ کبھی محصور نہیں ہوتا بلکہ ساری دنیا کو اپنا وطن اور تمام انسانوں کو ایک ہی برادری تصور کرتا ہے۔ عقیدۂ توحید جرأت، غیرت، خودداری اور عزت نفس کا جوہر پیدا کرتا ہے۔ عقیدۂ توحید فلاح ونجات کا ضامن ہے۔ عقیدۂ توحید پر ایمان رکھنے والا صرف گفتار کا غازی نہیں ہوتا بلکہ جو کہتا ہے وہ کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک اَن دیکھی بالاتر قوت موجود ہے جو اس کے ارادوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ عقیدۂ توحید کا قائل حوصلہ مند، اولو العزم اور صبر و توکل کا پیکر ہوتا ہے اور اس کے ضمیر و ایمان کو نہ کچلا جا سکتا ہے اور نہ خریدا جا سکتا ہے۔ موحد کے پاؤں پر چاہے اشرفیوں کے انبار لگا دیں یا اس کے سر پر تلوار چلا دیں لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے اس کو نہ خوف ہوتا ہے نہ اُمید۔ عقیدۂ توحید شرفِ انسانیت کی بنیاد ہے۔ انسان کو کائنات میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے اور ان فرائض و واجبات سے جو خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے عائد ہیں عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقیدۂ توحید پر یقین رکھتا ہو۔ ایک مسلم کی زندگی کا محور یہی عقیدہ ہے اور یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے اخلاق و اعمال کی تمام لہریں پھوٹتی ہیں جو انسانوں کی زندگی کو پُربہار بناتی اور مرنے کے بعد اسے نعیم جنت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ عقیدۂ توحید انسان کو صرف اس کی

انفرادی زندگی ہی میں کامیاب و کامران نہیں بناتا بلکہ وہ اس مثالی سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے۔ جہاں سب انسان برابر ہوں، سب کو حقوقِ انسانیت یکساں حاصل ہوں۔ سب ایک کنبہ بن کر محبت و یگانگت کے ساتھ رہتے سہتے ہوں۔ ایک ہی قانون کے آگے سر جھکاتے ہوں، سب کا مطمع نظر ایک ہی ذات والا صفات کی رضا ہو اگر قرآن و سنت کی بتلائی ہوئی توحید اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں قائم نہ رہی تو نہ یہاں دین رہے گا نہ اِسلامی رشتہ، نہ ایمانی قوت نہ ملک وملت کے لئے قربانی اور جہاد کا جذبہ۔ توحید کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا ورثہ ہے۔ اس محبوب ورثہ کی حفاظت اور آئندہ نسلوں کو پہنچانے کا فریضہ اُمتِ مسلمہ کی گردنوں پر ہے۔ اسلام کی ساری شادابی جذبۂ توحید پر موقوف ہے۔ آج اس مادیت کے ایمان سوز دور میں جب کہ نئے نظریات جنم لے رہے ہیں۔ اس مسئلہ کی حفاظت و اشاعت کی اہمیت کو سمجھنا چاہیئے یہ مسئلہ جملہ اہلِ اِسلام کا ایک مشترکہ سرمایہ ہے اور مشترکہ مقصد ہے اس پاکیزہ مقصد کی خاطر مبارک ہیں وہ ہستیاں جو خوشی خوشی تمام صعوبتیں اور سختیاں برداشت کرتی ہیں اور بلا کسی مداہنت کے توحید کی دعوت لوگوں تک پہنچاتی ہیں۔

عقیدۂ توحیدِ کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت پر اثرات

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو انسانی خدمت گزاری پر مامور کر کے انسان کا مرتبہ بلند و برتر بنایا ہے اس کو کسی کا غلام نہیں بنایا۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا غلام ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی غلامی اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ نہ خدا کے سوا یہ کسی کا غلام بن سکتا ہے اور نہ کسی سے خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ ایک موحد اور مومن انسان کسی دوسرے کے آگے گردن نہیں جھکائے گا۔ وہ وسیع النظر ہوگا۔ کلام الٰہی نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ تمام طاغوتی طاقتوں کا جو اس کی گردن سے اُتار کر صرف ایک اکیلے خدا کی حکومت کی اطاعت کا سبق اسے پڑھایا ہے یقیناً وہ دنیا کے ہر انسان کے لئے اپنے نہاں خانہ قلب میں محبت کا جذبہ رکھتا ہے۔ وہ بالیقین بنی نوع انسان کا سب سے بڑا

محسن، سب سے زیادہ خیر خواہ ہوتا ہے۔ اس کا رشتہ تمام بنی نوع انسان سے کرتا ہے۔ اس نے قومیت، نسل، خاندان اور رنگ کے بتوں کو پاش پاش کیا اور انسانی عظمت، تفوق اور برتری کی بنیاد قابلیت اور صفات حسنہ پر رکھی۔ اِسلامی نظامِ معاشرت کی بنیاد ایک مافوق الفطرت و لا ادراک ہستی کو حاکمِ اعلیٰ اور معبودِ حقیقی تسلیم کر لینے پر ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد تمام طاغوتی طاقتیں مسند خدائی سے اُتر کر ''الملک للہ والحکم للہ'' کہتی ہوئی بساطِ عبودیت پر سجدہ ریز نظر آتی ہیں۔ کلمہ ''لا الہ الّا اللہ محمد رسول اللہ'' کہنے سے پیدائش سے لے کر موت تک تمام مراحل زندگی میں اللہ اور بندے کے درمیان عابد و معبود اور حاکم و محکوم کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کی گردن سے ماسوا اللہ ہر طاقت کے خوف، غلامی اور محکومیتِ بندگی کا طوق اُتر جاتا ہے۔ اس کا نظریۂ حیات ایک ایسی ذاتِ برتر و اعلیٰ کی طرف سے ہے جو ساری دنیا کا خالق ہے۔ عقیدۂ توحید کی پختگی سے جو معاشرہ تیار ہوگا وہ ایک زندہ اور متحرک معاشرہ ہوگا۔ اس معاشرہ کے مقاصد میں ثریا کا اُوج اور آفتاب کی رفعت پائی جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی معاشرہ اس قسم کا بلند مقصد پیش نہیں کر سکتا۔ یہی ایک ایسا معاشرہ ہے جو ذاتی نفع اندوزی اور ذاتی مفاد سے بلند ہے اور یہی ایک ایسا معاشرہ ہے جو بلا لحاظ قوم و ملت کل انسانوں کی فلاح و بہبود کر سکتا ہے اور تمام دنیا والوں کے لئے قابلِ قبول ہوسکتا ہے کیونکہ یہی ایک ایسا معاشرہ ہے جس نے طبقاتی امتیاز اور نسل و رنگ کے فرق کو یکسر مٹا کر عالم انسانیت کو ایک ہی رشتۂ اُخوت میں منسلک کر دیا ہے۔ اس معاشرہ میں انسان خود مختار نہیں ہے بلکہ ایک باعظمت و بے مثال قادرِ مطلق اور ایک پرجلال اور زبردست محاسب کا خوف اس کے سر پر مسلط ہے جس کے ہاں اس کے اعمال کی جواب دہی اور باز پرس ہوگی۔ وہ ہستی ہر طرح علیم وخبیر ہے۔ اس معاشرہ کا ضابطۂ حیات اس ذات کا پیش کردہ ہے جو تمام قبیلوں اور تمام ملکوں کا مسبب ہے جہاں تنگ نظریوں اور تعصّبات کے پائے جانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ وہ ذات ساری دنیا کی خالق ہے۔ اس کا علم حدود نا آشنا اور اس کی قدرت بے پایاں ہے۔ اس کا کسی قوم یا قبیلہ سے کوئی نسبی یا وطنی تعلق نہیں۔ وہ زبان و مکان کی قیود سے بلند تر ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ

میں بسنے والا اپنے آقا اور مالک کا تجویز کردہ دستور اور ضابطۂ حیات پورے شرح صدر کے ساتھ اختیار کرے گا اور اس کے اختیار کرنے میں اجنبیت اور غیریت محسوس نہیں کرے گا۔ مسلکِ توحید اختیار کرنے والا اپنے مسلک کو کسی دنیوی غرض کے لئے، جاہ و عزت کے لئے، مال و دولت کے حصول کے لئے یا دیگر نفسانی مفادات کی تکمیل کے لئے اختیار نہیں کرتا۔ اس کے پیشِ نظر صرف صداقت اور محض صداقت ہوتی ہے۔ وہ ہر مصیبت اور ہر مشکل سے دوچار ہونے کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر حصول دنیا کی توقع یا کسی مادی فرض کی تکمیل تو ہوتی نہیں، وہ فراخی اور تمول کے لئے توحید کا قلادہ اپنے گلے میں نہیں پہنتا۔ وہ صرف اس لئے اس کو اختیار کرتا ہے کہ اسی کو وہ زندگی کا مطلوب سمجھتا ہے اور اسی مقصد کے لئے اپنی جان عزیز کو قربان کرنا عزیز سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ بھوک پیاس سے مر جائیں، انہیں تن ڈھکنے کو کپڑا بھی نصیب نہ ہو، انہیں آسائش و آرام چھوڑ کر آگ کے انگاروں پر بسر کرنا پڑے۔ پھولوں کے گلدستوں کو چھوڑ کر کانٹوں سے کھیلنا پڑے۔ ہر حالت میں وہ حق و صداقت ہی سے محبت رکھیں گے وہ باطل کا کبھی ساتھ نہیں دیں گے۔ وہ اس مقصد عزیز کی خاطر مال و دولت، قوت و صلاحیت، اعزہ و اقربا، دنیا کی تمام قرابت داریاں اور رفاقت و محبت کے جملہ تعلقات قربان کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں گے جو چیز ان کے اس محبوب نصب العین کے راستہ میں آڑے آئے گی اسے کانٹا سمجھ کر نکال پھینکیں گے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا بھی انہیں بھینٹ چڑھانی پڑے تو وہ اسے گھاٹے کا سودا نہیں سمجھیں گے بلکہ ان کے نزدیک ایک کامیاب تجارت ہوگی جنہوں نے اس تصور کے ساتھ اس راہ کو منتخب کیا ان کا ہر قدم حق و صداقت کے قریب رہا وہ زندگی کے میدان میں سیل رواں کی طرح آگے بڑھے ان کی کوشش رائیگاں اور ضائع نہیں کی گئیں۔ ان کی جدوجہد مثمر ہوئی۔ ان کی زندگی ایک مسلسل حرکت و عمل کا مظہر تھی، پیہم عمل اور دائمی جدوجہد ان کی زندگی کا خواص تھا۔ اِسلام کا عقیدۂ توحید ایک اعلیٰ تصور پر مبنی ہے۔ یہ عقیدہ وقتی، فوری اور ذاتی مفادات سے بلندتر ہے۔ اس کے اندر کائنات کی حقیقت اور اس کے قوانین مضمر ہیں چونکہ یہاں

شخصی، ذاتی، نسلی اور قومی مفادات سے ایک بلند اجتماعی تصور کارفرمائی کر رہا ہے۔ اس لئے ایسے اشخاص دیگر اقوام یا جماعتوں کے آلہ کار نہیں بن سکتے اور نہ ہی ایسے اشخاص کو دوسری قوم کے اغراض و مقاصد اپنے تابع بنا سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ ذاتی اغراض و منافع کی پرستش سے بلند ایک اجتماعی نفع وضرر کے اُصول پر تمام دنیا کو جمع کرتا ہے اور خیر وشر کا ایک مشترک وسیع معیار پیدا کرتا ہے اس اجتماعی زندگی کو شاہراہ ترقی پر آگے بڑھانا اور بقائے حیات کی جدوجہد میں مدد دینا اس کا خاصہ ہے۔ قرآنِ حکیم کی عظیم آیت ''آیت الکرسی'' نے جس معبود کا تصور پیش کیا ہے وہ کل انسانیت کا خالق اور رب ہے اس کی نگاہ میں تمام انسان یکساں اور برابر ہیں اور جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت میں یکسانیت اور ہم آہنگی ہے یعنی ہر وجود کی پرورش کا سامان ہر گوشے میں ایک اسلوب اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے۔ اسی طرح روحانی اور معنوی نظام تربیت اور پرورش ونشوونما کا سامان بھی اس نے ہی تجویز کیا ہے اس اجتماعی وحدتِ نسلِ انسانی کے شعور کے اندر تمام قومی اورنسلی گروہ پناہ لے سکتے ہیں۔ گویا اب وہ ایک وسیع تر معاشرہ کے رکن بن گئے ہیں۔ جہاں ان کے مادی وجود کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس معاشرہ کے اندر تمام گروہوں کے حقوق کی یکساں پاسبانی کا لحاظ ہے۔ اسلامی عقیدۂ توحید کے اندر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں اور متعدد حقیقتوں کو ایک واحد اُصول فکر میں جمع کیا ہے۔ دیگر اقوام وملل نے زندگی کی وحدت کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر رکھا تھا جن میں ہر شعبہ اپنی جگہ مستقل اور قائم بالذات بن گیا تھا۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹا کر مختلف عناصرِ حیات کو یکجا جمع کیا اور اِسلام نے اس کا جائز اور صحیح مقام عطا کیا۔ غرض کہ اس امتزاج وترکیب اور جمع وتالیف سے تمام ضروری صداقتوں کو ایک کلی وحدت میں ایک حقیقت پیدا کی جس کا نام توحید ہے۔ اِسلام نے نسل وخون اور قومیت کے بتوں کو توڑا لیکن خون وقوم اورنسل کے رشتوں کو جائز حد تک اہمیت بھی دی بشرطیکہ وہ مذہبی عقائد کی یکسانیت کو مجروح نہ کریں اور نہ ہی مذہبی اور اعتقادی رشتوں پر غالب آسکیں۔

بعض مذاہب کے ہاں یہ غلط تصور پیدا ہو گیا کہ دنیا سے قطع تعلق کرنے سے ہی اُخروی زندگی اور ابدی نجات نصیب ہوسکتی ہے۔ اس غلط تصور نے رہبانیت اور ترک دنیا کی ترغیب دی۔ لیکن اِسلام نے دُنیوی زندگی اور اُخروی زندگی کو ہم آہنگ کیا۔ اسلام نے کہا کہ دنیوی زندگی بے حقیقت نہیں ہے بلکہ اُخروی زندگی کا ایک ابتدائی زینہ ہے اور اُخروی اور روحانی زندگی کو حاصل کرنے کے لئے اس سے گزرنا ضروری و لابدی ہے۔ اسی نظریہ کے ماتحت اِسلام نے نصاریٰ اور یہود کے افراط و تفریط کو مٹا کر اعتدال پیدا کیا۔ اِسلام نے مذہب و سیاست کے تناقض کو رفع کیا۔ دنیاداروں اور دینداروں کے امتیازی طبقات کا خاتمہ کیا۔ اِسلام سے پہلے مذہبی پروہت حکومت اور اس کے تمام کاموں سے متنفر اور حاکمانہ اختیارات کو اِستعمال کرنا منافی مذہب سمجھتے تھے لیکن اِسلام نے سکھایا کہ مذہب و سیاست میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ صرف یہ کیا کہ سیاست کو اخلاق کے تابع اور حکومت کو مذہب کا خادم بنا دیا۔ اِسلام سے پہلے عبادت صرف پوجا پاٹ کی چند رسوم کا نام تھا۔ کچھ دعائیں تھیں، روزے تھے، ریاضتیں تھیں لیکن باقی تمام شعبوں میں انسان آزاد تھا، اپنی ذاتی، خاندانی قبائلی اور قومی خواہشات کے مطابق وہ عمل کرتا تھا، غرض کہ عبادت اور زندگی کے باقی فرائض کے درمیان کوئی تعلق و ربط نہ تھا۔ اِسلام نے عبادت کا مفہوم یہاں تک وسیع کر دیا کہ عملی زندگی کا کوئی پہلو اس کے دائرۂ اثر سے خالی نہ ہو، بلکہ کھانا، پینا، شادی، ازدواجی اور معاشرتی فرائض کی بجا آوری حصولِ علم کی جدوجہد وغیرہ تمام معاشرتی، تمدنی اور سیاسی مہمات عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اِسلام کے اندر عبادت کا تعلق صرف انفرادی اور شخصی کردار سے نہیں ہے بلکہ معاشرہ کی اصلاح اور خرابیوں کو بدلنے کی جدوجہد کرنا بھی عبادت ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور تمدن کے متضاد تقاضوں اور متفرق محرکات کو متصادم ہونے سے بچانا اور ہر ایک کو اس کا جائز حق اور جائز مقام دے کر معاشرہ میں صلح، عدل و مساوات اور ہم آہنگی قائم کرنا۔ یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اِسلام اپنے قانون میں اشیاء کی قدر و قیمت کا معیار عارضی اور وقتی مصالح کی بناء پر نہیں ٹھہراتا بلکہ مجموعی نتائج کو قرار دیتا ہے۔ وہ قانون بناتے وقت کسی عادت، رواج یا قانون کے

مادی تقاضوں اور منافعوں کو ہی اہمیت نہیں دیتا۔ بلکہ اخلاقی تربیت اور تشکیل سیرت و کردار کو اس نے زیادہ دخل دیا ہے۔ جس طرح حضور نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں جامعیت پائی جاتی ہے۔ اِسلام اپنے پیروؤں سے بھی توقع رکھتا ہے اسی جامعیت کی جھلک ان میں نظر آئے مسلمان صرف ایک طرفہ نہ ہو وہ شہری اور مدنی معاملات میں بھی دلچسپی رکھے، علم وفضل کے ذوق سے بھی آشنا رہے، سیاسی بصیرت بھی رکھے، عائلی زندگی میں ایک شفیق باپ اور محبوب شوہر کے فرائض ادا کرے، یہ توازن و اعتدال اور توسط اسلام کے صحیح توحید کے تصور سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔

توحید کا سچا جذبہ ہی مخلوق سے محبت کرنا سکھاتا ہے

قرآن حکیم نے خدا پرستی کی بنیاد اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان خدا کی صفات کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے اور صرف صفاتِ الٰہی سے تعلق اور تشبہ ہی اسے حیوانات کی سطح سے بلند اور ممتاز کرتا ہے۔ اگر یہ چیز نہیں تو اس میں اور حیوان میں کچھ فرق نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم نے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ انسان کتنا ہی گناہ گار ہو، عمر بھر خدا کی نافرمانی کی ہو جب خدا کے دروازہ پر دستک دے گا۔ رحمت و قبولیت اس کا استقبال کرے گی۔

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ○(۱)

”آپ فرما دیجئے: اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر لی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے، وہ یقیناً بڑا بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے ○“

اللہ تعالیٰ نے اس تمام کارخانہ ہستی کی بنیاد رحمت پر رکھی ہے۔ اس کے جملہ

(۱) الزمر، ۳۹: ۵۳

احکام کے اندر ہر گوشہ میں اس کی رحمت کارفرمائی کر رہی ہے۔ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کو اور رحمت کے مترادف الفاظ کو اس کثرت سے دہرایا ہے کہ قرآنِ حکیم اوّل سے آخر تک صرف رحمتِ الٰہی کا پیغام ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء میں رحمٰن اور رحیم آتے ہیں۔ ان اسماء کے معانی ملاحظہ ہوں۔

لفظ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہے اور وصف عالی پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی کسی مصدر سے خاص صفت کا صدور بدرجۂ عظیم ہو رہا ہے۔ رحمٰن اس ذات پر دلالت کرتا ہے جس سے رحمت کا ثبوت عظیم الشان وسعت اور نہایت ہی زبردست قوت کے ساتھ ہو اور اس کی رحمت سے عالم کا ذرہ ذرہ سیراب ہو رہا ہو۔ لفظ رحیم بروزن فعیل کسی صفت ثابتہ اور قائم پر دلالت کرتا ہے۔ رحمٰن اور رحیم دونوں کا اشتقاق رحمت سے ہے۔ یہ دونوں اسماء بتلاتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد رحمت پر ہے۔ ان اسماء سے تخلّق پیدا کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمدردئ عامہ اور خیر خواہی تامہ کے خوگر بنیں۔ ان کے سینہ میں ایسا دل ہونا چاہیے جو بے کسوں کی حالت پر پگھل جائے، دل میں درماندگان کی حالت کا احساس ہو۔ ان کا دروازہ دوست دشمن سب کے لئے کھلا رہے۔ قرآن حکیم نے اپنی صفت یوں بیان کی ہے:

وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱)

’’اور بے شک یہ ہدایت ہے اور مومنوں کے لیے رحمت ہے ○‘‘

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو بھی رحمت فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (۲)

’’اور (اے رسولِ محتشم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر ○‘‘

(۱) النمل، ۲۷: ۷۷

(۲) الأنبياء، ۲۱: ۱۰۷

رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَةً وَّ عِلۡمًا.(۱)

’’اے ہمارے رب! تو (اپنی) رحمت اور علم سے ہر شے کا احاطہ فرمائے ہوئے ہے۔‘‘

كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ.(۲)

’’اس نے اپنی ذات پر رحمت لازم فرما لی ہے۔‘‘

اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَo(۳)

’’بیشک اللہ کی رحمت احسان شعار لوگوں (یعنی نیکوکاروں) کے قریب ہوتی ہےo‘‘

قرآنِ حکیم میں یہ دونوں کلمات یعنی رحمٰن اور رحیم بڑی کثرت سے کہیں تنہا اور کہیں دوسرے اسماء الٰہی سے مل کر اِستعمال ہوئے ہیں ان دو اسماء کی فیض بخشی ہے کہ مخلوق کے اندر رحم کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اسماءِ الٰہی میں سے ایک اسم ’’الرؤف‘‘ بھی ہے۔ رؤف اس ذات کو کہتے ہیں جس کا احسان تمام مخلوق پر بلا کسی سبب، بلا کسی استحقاق اور بلا کسی درخواست کے عام ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ایک نام ’’ودود‘‘ بھی ہے۔ ’’ودود‘‘ ودّ، یود سے ہے۔ ودود کا درجہ محبت سے اعلیٰ ہے اس کے معنی پاکیزہ محبت کے ہیں۔ گویا محبت کے خلاصہ کا نام ودود ہے یعنی ایسی محبت جس میں کامل اخلاص ہو اور اغراض کا شائبہ تک بھی اس میں نہ پایا جائے۔ ودود لغت عرب میں بمعنی مفعول بھی آتا ہے اور بمعنی فاعل بھی۔ بمعنی مفعول اس سے مراد وہ ذات ہے جس سے شدید محبت کی جائے۔ ایسا محبوب جو ہر طرح کی محبت کا مستحق ہے اور انسان اپنی جملہ محبوبات سے حتیٰ کہ اپنی جان سے بڑھ کر اس

(۱) المؤمن، ۴۰: ۷

(۲) الأنعام، ۶: ۱۲

(۳) الاعراف، ۷: ۵۶

سے محبت کرے۔ ودود بمعنی فاعل بھی آتا ہے یعنی وہ ذات جو اپنے بندوں سے محبت کرتی ہے۔ ودود مبالغہ کا صیغہ ہے۔ سورۂ ھود میں آتا ہے:

اِنَّ رَبِّیۡ رَحِیۡمٌ وَّدُوۡدٌ ○(۱)

’’بیشک میرا رب نہایت مہربان محبت فرمانے والا ہے○‘‘

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ○(۲)

’’اور وہ بڑا بخشنے والا بہت محبت فرمانے والا ہے○‘‘

سورۂ مریم میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ○(۳)

’’بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے تو (خدائے) رحمٰن ان کے لئے (لوگوں کے) دلوں میں محبت پیدا فرما دے گا○‘‘

مقصود یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں جس قدر اللہ تعالیٰ کی محبت زیادہ ہوگی وہ اسی قدر اس کی مخلوق سے زیادہ محبت کرے گا۔ رحمتِ عالم حضور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے کس قدر بے پناہ محبت تھی۔ کتبِ حدیث میں اس موضوع پر بے شمار روایات موجود ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ اس بارے میں ظاہر و باہر ہیں یعنی نوعِ انسان کی محبت کا سچا جذبہ صرف اسی شخص کے قلب میں پیدا ہو سکتا ہے جو اپنے اللہ کے ساتھ محبت کا صحیح تعلق رکھے۔ جسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا صحیح علاقہ نہیں وہ اس کی

(۱) ھود، ۱۱: ۹۰
(۲) البروج، ۸۵: ۱۴
(۳) مریم، ۱۹: ۹۶

مخلوق کے ساتھ کبھی محبت نہیں رکھ سکتا۔

قرآنِ حکیم میں آیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ.(۱)

”اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔“

توحید کے مذاہب اور اقوامِ عالم پر اثرات و برکات

جن اقوام و مذاہب نے براہِ راست اِسلام قبول نہیں کیا اِسلامی توحید سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اِسلام نے اللہ تعالیٰ کی سچی توحید کو پورے جوش و خروش اور اعتقاد و یقین کے ساتھ پیش کیا اور ساتھ ہی اصنام پرستی اور شرک کی بنیادوں پر تیشہ چلایا۔ شرک اور بت پرستی کی مذمت و ہجو کر کے اسے پوری طرح ذلیل و بے وقعت کیا دنیا کی قوموں کو اپنے آپ کو کھلم کھلا بت پرست کہنے اور شرک کا اعلانیہ اقرار کرنے سے شرم آنے لگی۔ گو وہ زبان سے اقرار نہیں کرتے مگر توحید کے اُصول و حقائق خود بخود ان کے دل و دماغ میں جاں گزین ہونے لگے۔ اگرچہ اسلام سے انتساب میں انہیں حجاب رہا مگر آہستہ آہستہ اسلام کے قریب ہوگئے۔ ان کے اندر وقتاً فوقتاً جو اصلاحی تحریکات پیدا ہوئیں وہ اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ اسلام نے ان کے باطن اور ان کے ظاہر پر کتنا اثر کیا۔ اب انہوں نے اپنے شرکیہ اور بت پرستانہ مذاہب کے اعمال و رسوم کی تاویل و توجیہہ میں ایسی کوششیں شروع کر دیں کہ اُن کے مذاہب میں توحید نظر آئے۔ غرض متمدن اور آباد دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن ظہورِ اسلام کے بعد یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے متاثر نہیں ہے۔ اسلام کے حقائق روئے زمین پر مشتہر ہو گئے۔ توحید اور اِسلام سے ایک مسلمان کے اندر ایسا جوش پیدا ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ حقائقِ اِسلام کو

(۱) البقرة، ۲: ۱۶۵

تحریراً اور تقریراً لوگوں پر ظاہر نہ کرے چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اس وجہ سے اِسلام کے حقائق روئے زمین پر پھیلے اور لوگوں کے دل و جان میں پیوست ہو گئے۔ آج روئے زمین پر لوگ خواہ کسی مذہب و ملت سے وابستہ ہوں لیکن بت پرستی شراب خوری اور زنا وغیرہ سے پوری طرح نفرت کرتے ہیں یہ اسلام کی برکت نہیں تو اور کیا ہے۔

توحید کا فکر و عمل پر اثر

اس حقیقت کو جان لینا ضروری ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ عقیدہ نہ خشک منطق اذعان کا نام ہے اور نہ اسے کسی بھی صورت میں محض تحکم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک فعال جدوجہد کا انقلابی عنصر ہے جس کے مان لینے کے بعد عمل و سیرت کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ یہ ایک قوت کا نام ہے ایک محرک اور زندہ عامل سے تعبیر ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ آپ جس طرح کے عقائد کو اپنے فکر و ذہن کا جزو بنائیں گے۔ آپ کی زندگی اسی انداز کی غماز ہو گی کیونکہ عقیدہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے لئے پسند اور ناپسند کے کچھ پیمانے مقرر کر لئے ہیں اور زندگی سے متعلق کسی واضح تصور کو حرزِ جان بنا لیا ہے۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ تسلیم و رضا کا یہ اُسلوب آپ کی زندگی، آپ کی سیرت اور روزمرہ کے معمولات کو ایک خاص روپ عطا کرے اور اگر یہ عقیدہ اس کے برعکس محض ذہن کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے اور زندگی کی مشکلات میں آپ کے لئے صحیح ثابت نہیں ہوتا تو اس کو عقیدہ و ایمان نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک خیال ہو سکتا ہے، اس کو ذہنی عیاشی بھی کہہ سکتے ہیں اور کسی اور نام سے بھی اس کو پکارا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ اس لائق ہرگز نہیں کہ عقیدہ و ایمان کی جگہ لے سکے۔ توحید کے ذہن و قلب یا کردار و سیرت پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اس استثناء کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ان میں وہ کیفیات داخل ہیں جن کا تعلق یکسر ہمارے داخل و باطن سے ہے۔ یعنی اس سے انسان کن لذتوں کو دامن دل میں سمیٹتا ہے، کن معارف و تجلیات کا ہدف بنتا ہے، کن لطائف کی بیداری سے بہرہ مند ہوتا ہے اور کن انوار و تائیداتِ غیبی سے شب و روز دوچار

ہوتا ہے یا ایک موحد، اللہ اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھنے والا انسان کس درجہ سرور و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ وہ اُمور ہیں جن کو کسی خارجی حوالہ سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے کچھ وہی پاکیزہ نفوس آشنا ہیں جو ان سے براہِ راست دوچار ہیں۔ توحید اور مجاہدہ و ریاضت کو اوّلین اساس قرار دیتے ہیں اور سیر الی اللہ کے مرحلہ میں اسی کو اپنا مبداء و منتہا ٹھہراتے ہیں۔ جو توحید ہی کی صاف ستھری آب و ہوا میں سانس لینے کے عادی ہیں اور توحید ہی کے تغذیہ پر جن کی قوتِ روحانی کا دار و مدار ہے۔ یہ وہ احوال ہیں جن سے اہلِ قال قطعی آگاہ نہیں ہو سکتے۔ ان احوال و کوائف سے آشنائی پیدا کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تعلق باللہ کو محبت و عشق کی بنیاد پر استوار کیا جائے یعنی اللہ کو اس طرح چاہا جائے کہ اس کی آرزو میں راتیں کٹیں، دن بیتیں، ہر رات نالۂ صبح گاہی پرختم ہو اور ہر صبح نئی آرزوؤں اور تمناؤں کا آفتاب لے کر طلوع ہو، خشوع و اخلاص سے محبت کے اس دبستان کی آبیاری کی جائے اور اس راہ میں پیش آمدہ مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی خو ڈالی جائے۔ یاد رہے کہ تعلق باللہ کی نوعیت یک طرفہ نہیں ہو گی بلکہ جانب قدس سے بھی محبت کا جواب محبت ہی سے دیا جائے گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ○ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ○ (۱)

”بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اِس پر مضبوطی سے) قائم ہوگئے، تو اُن پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم خوف نہ کرو اور نہ غم کرو اور تم جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا○ ہم دنیا کی زندگی میں (بھی) تمہارے دوست اور مددگار ہیں اور آخرت میں (بھی)، اور

(۱) حم السجدۃ، ۴۱: ۳۰، ۳۱

تمہارے لئے وہاں ہر وہ نعمت ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہاں وہ تمام چیزیں (حاضر) ہیں جو تم طلب کرو0‘‘

جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ توحید پر عمل پیرا انسان کھلے بندوں اللہ تعالیٰ کی تائیدات کا مشاہدہ کرے گا اور خوف و حزن کی چیرہ دستیوں سے اپنے کو محفوظ پائے گا۔

عقیدۂ توحید اور احساسِ یکتائی

توحید کا پہلا اور عظیم تر اثر فکر و ذہن پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یکتائی سے اس میں اپنی یکتائی کا احساس بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور انسان یہ سچ مچ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ بہتر و احسن ہی نہیں اللہ کا بندہ بھی ہے یا کائنات میں اس کی حیثیت صرف حیاتیاتی عنصر ہی کی نہیں، بلکہ اس کے سوا اور اس سے زیادہ یہ کسی بڑی حقیقت سے بھی تعبیر ہے۔ ایسی بڑی حقیقت جس کی جڑیں اگر ایک طرف زمین میں گڑی ہیں تو دوسری طرف اس کے امکاناتِ ارتقاء کی شاخیں آسمان کی پاکیزہ اور مقدس فضا کو چھو رہی ہیں اور احساسِ عبدیت کا یہی وہ مقام ہے جہاں اس کے اخلاقیات کی سرحدیں ایک ایسے انسان سے جدا ہوتی ہیں جس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ نہیں، جو صرف بشر ہے، صرف حیوان ہے اور عبدیت کی سطح پر فائز نہیں ہو پاتا۔ بات یہ ہے کہ اگر یہ انسان اپنی عظیم علمی فتوحات کے باوجود صرف حیاتیاتی ارتقاء کی آخری کڑی ہے اور اس نے تعلق باللہ کی رفعتوں کو نہیں اپنایا تو پھر اس کی زندگی کا نقشہ اونچے روحانی درجات سے محروم رہے گا۔ اس صورت میں اس کا منتہائے کمال زیادہ سے زیادہ یہی رہے گا کہ ایسی تہذیب ترتیب دے اور ایسی اقدار ترتیب دے جو اس کی خواہشاتِ نفس کی تکمیل کی ضامن ہوں۔ خواہشات اور جسمانی و نفسانی آرزوؤں کے آگے کے مقاماتِ ارتقا اس کی نظروں سے قطعی اوجھل رہیں گے۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ تہذیبِ انسانی کی معراج بس یہی ہے، انسان آزادی سے کھائے پیئے، جنسی جذبوں کی تسکین چاہے اور بالآخر چپکے سے موت کی آغوش میں جا سوئے۔ دراصل انسان کے بارے میں یہی وہ نقطہ نظر ہے جس نے موجودہ مغربی تہذیب

کی بے اعتدالیوں کو جنم دیا ہے۔ انفرادی سطح پر اس سے جو بے راہ روی اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے اس کو ہر کوئی جانتا ہے، اسی طرح سے یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو استحصال اور ظلم کی شیطانی قوتوں کو اُبھارنے کا باعث بنتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ جب لذت سے بہرہ وری ہی گھوم پھر کر زندگی کا نصب العین قرار پایا اور نفع و فائدہ کا حصول ہی انسان کی آخری منزل ٹھہرا تو وہ کون احمق ہے جو عاجل اور خود غرضانہ جنسی لذات سے خواہ مخواہ محرومی اختیار کرے۔ موجودہ تہذیب کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ایک طرف علم و ہنر کی تابش نے انسان کو آسمان تک اچھال دیا ہے۔ اس کے لئے بے اندازہ سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی ہیں۔ اسے صاف ستھرے رہن سہن کا عادی بنایا ہے، لیکن دوسری طرف یہ اپنی عادات و اخلاق کے اعتبار سے ہنوز حیوانیت کے عہدِ باریک سے آگے نہیں بڑھ پایا۔

توحید اور قربتِ خداوندی

جب ایمان کی سطح پر انسان کے دل میں کائنات کے بارے میں یہ حسن ظن پیدا ہو جائے تو پھر توحید اس سے آگے بڑھ کر یہ یقین بھی دلاتی ہے کہ تمہاری جدوجہد میں اللہ تعالیٰ برابر تمہارے ساتھ ہے۔ تم اگر وسائل و ذرائع اختیار کرنے کے سلسلہ میں صحیح راہ پر گامزن ہو تو کامیابی قطعی تمہارے قدم چومے گی۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○[1]

''اور آپ صبر کریں بیشک اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں فرماتا○''

اس دنیا کی کامرانیاں جہاں اسباب و وسائل کی رہینِ منت ہیں وہاں یہ بھی واقعہ ہے کہ بسا اوقات یا تو صحیح اسباب و وسائل کی تشخیص ہی نہیں ہو پاتی اور اگر وسائل کی تشخیص کا مرحلہ طے بھی ہو جائے تو پھر ان اسباب و وسائل تک رسائی کا مرحلہ ایک دشوار گزار وادی کے روپ میں آ کھڑا ہوتا ہے اور اسے بھی عبور کر لیجئے تو کچھ اور مخفی رکاوٹیں

(۱) هود، ۱۱:۱۱۵

اس طرح اُبھر کر راستہ روک لیتی ہیں۔ انسان جس سے حیران رہ جاتا ہے کیونکہ عین اس وقت مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کامیابی بظاہر یقینی ہوتی ہے یعنی اُمید اور آس کی کمند ٹھیک اس وقت ٹوٹ جاتی ہے جب اس میں اور لبِ بام میں دو چار ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ عقیدۂ توحید ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ہمیں توکل کا سبق دیتا ہے۔ توکل کے معنی ترکِ اسباب کے نہیں جیسا کہ عام خیال پایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس میں کامیابی کے جملہ امکانات و وسائل سے تعرض بھی کیا جائے تاکہ اس راہ کی دشواریوں کا سدِّ باب کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یقین واذعان کی اس کیفیت کی بھی دل میں پرورش کی جائے کہ کامیابی کی اصل کلید اسباب نہیں، مسبب الاسباب ہے۔ چنانچہ اگر کام صحیح ہے درست ہے اور مقصد نیک ہے تو اللہ تعالی اسباب کی فراہمی میں میرے ساتھ ہے۔ میرے ارادوں اور منصوبوں میں اس کی کارسازی اور توفیق برابر شاملِ حال ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ. (۱)

''اور جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ (اللہ) اسے کافی ہے۔''

اس توفیق و عنایتِ الٰہی کی خاص صورت کو منطق کے مقدمات کی شکل میں بیان نہیں کیا جا سکتا اس کا تعلق سراسر تجربہ سے ہے۔ اس رابطہ سے ہے جو عبد و معبود کے مابین استوار ہے اور اس یقین و اذعان کی وجہ سے ہے جو اسباب و ذرائع سے انسان کو پھیر کر اس خالق کی چوکھٹ پر لا کھڑا کرتا ہے جس نے اُس وقت اس کی مدد کی جب اس میں اسباب و ذرائع کا شعور بھی پیدا نہیں ہوا تھا اور اس وقت اس کی تربیت اور پرورش کا اہتمام کیا جب یہ ایک گوشت کے ایک لوتھڑے سے زیادہ کچھ اور نہ تھا۔

(۱) الطلاق، ۶۵: ۳

توکل کی اقسام

توکل کے دو مقام ہیں ایک مقام تو عوام کا ہے اور ایک خواص کا۔ عوام کے لئے بھی ضروری ہے کہ اسباب و ذرائع کو کبھی بھی نظروں سے اُوجھل نہ ہونے دیں۔ اگر بیمار ہوں تو طبیب کی طرف رجوع کریں۔ بیکار ہوں تو کاروبار کی بوقلموں صورتوں پر غور کریں اور مناسب تدابیر اختیار کرنے سے گریز نہ کریں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق پہلے زانوئے اشتر بند پر عمل کریں اور اس کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔(۱)

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وہ ان لوگوں کی ہر طرح مدد کرے گا۔ ہم جب توکل کی اس نوعیت کو عوام کا توکل سمجھتے ہیں تو اس سے مراد اس گروہ کی توہین نہیں بلکہ محض اس فرق کو بیان کرنا ہے جو توکل کی دو صورتوں پر کیا جاتا ہے۔ ورنہ عام کاروبارِ حیات چلانے کے لئے اور تہذیب و تمدن کے تقاضوں کو آگے بڑھانے کے لئے اس مقام کا ہونا بجائے خود بہت ضروری ہے۔ توکل کی دوسری صورت خواص سے متعلق ہے۔ خواص سے مقصود ایسے بلند حوصلہ افراد ہیں جو اپنی محدود قوت اور آرزوؤں سے دستبردار ہو چکے ہیں اور اپنے سامنے رضائے الٰہی کے سوا اور کوئی تمنا نہیں رکھتے۔ جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے زندہ ہیں اور اسی پر خوش ہیں۔ ان کا توکل یہ ہے کہ اپنی تمام تر توانائیوں اور آزمائشوں کو اس آرزو کی تکمیل میں کھپا دیتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ سے ملنے کی سعادت نصیب ہو۔ کس طرح اللہ تعالیٰ راضی ہو، کس ڈھنگ سے وہ اُسے منائے اور کس جتن سے وہ اپنے آپ کو غلاموں اور حلقہ بگوشوں میں شامل کرے۔ اپنی ضروریات کا سارا بار اس محبوبِ حقیقی کی عنایاتِ بے پایاں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں جس کے ساتھ پائیدار وفا و محبت کا عہد و پیمان کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ از راہِ کرم اس توکل کے صدقے ان کی ضروریات کا کفیل اور ضامن ہو جاتا ہے۔

---

(۱) ترمذي، السنن، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب منه، ۴: ۶۶۸، رقم: ۲۵۱۷

اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبۡدَهٗ.(۱)

''کیا اللہ اپنے بندۂ (مقرب نبی مکرّم ﷺ) کو کافی نہیں ہے۔''

عقیدۂ توحید سے سیرت و کردار اور اخلاق کے گوشے مہک اُٹھتے ہیں

عقیدۂ توحید جان آفرین ہے یہ عقیدہ دل میں استغنا، خودداری اور جملہ خطرات کے مقابلہ میں بے خوفی و بے نیازی کے جذبات کی داغ بیل بھی ڈالتا ہے اور انسان کے باطن میں یقین کا ایسا دبستان سجا دیتا ہے جس کی شمیم آرائیوں سے کردار و سیرت اور اخلاق کے گوشے مہک اُٹھتے ہیں۔ جب ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے گا اور اس کے بابِ اجابت پر دستک دے گا اور وہ اس کو اور اس کی دعاؤں کو پذیرائی بخشے گا تو پھر اس کو اطمینان حاصل ہوگا اور اس میں اعتماد و حوصلہ پیدا ہوگا کہ وہ کشاکش حیات کا دلجمعی سے مقابلہ کر سکے۔ یہی نہیں اللہ تعالیٰ جب پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے کہ مانگو اور طلب و آرزو کا دامن پھیلاؤ تو کون ایسا محروم اور بدقسمت ہوگا جو اس کے ساتھ دوستی اور عبودیت کا رشتہ جوڑنے کی کوشش نہ کرے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادۡعُوۡنِيۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ.(۲)

''اور تمہارے رب نے فرمایا ہے تم لوگ مجھ سے دعا کیا کرو میں ضرور قبول کروں گا۔''

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيۡ عَنِّيۡ فَاِنِّيۡ قَرِيۡبٌ ؕ اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِيۡ وَلۡيُؤۡمِنُوۡا بِيۡ لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ○(۳)

''اور (اے حبیب!) جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں تو

(۱) الزمر، ۳۹: ۳۶

(۲) المؤمن، ۴۰: ۶۰

(۳) البقرۃ، ۲: ۱۸۶

(بتا دیا کریں کہ) میں نزدیک ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے، پس انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری اختیار کریں اور مجھ پر پختہ یقین رکھیں تاکہ وہ راہِ (مراد) پا جائیںo‘‘

اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور تقاضائے توحید کے جہاں یہ معنی ہیں کہ کوئی بھی اس کی صفات میں اس کا شریک اور ساجھی نہیں، وہاں یہ بھی ہیں کہ بخشش و رحمت اور دستگیری کے معاملہ میں بھی اس کی کوئی نظیر پائی نہیں جاتی۔ غور کیجئے بھلا اس کے سوا اور کون ہے جو انسان کے گوشت پوست اور روح و جان سے بھی زیادہ قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے۔

وَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِo(۱)

’’اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیںo‘‘

عقیدۂ توحید ذہنِ انسانی کو سائنسی اُسلوب کی بنیاد فراہم کرتا ہے

عقیدۂ توحید کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسانی فکر و تدبر خالصتاً سائنسی اور علمی اُسلوب اختیار کر لیتا ہے اور ذہن توہمات اور بُت پرستی کے تمام پردوں کو چاک کر کے اس روشنی کو پالینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات نظم و قاعدہ کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اس میں علل و اسباب کی ہم آہنگی اور استواری ہے۔ اس میں ایک ہی قانون کا چلن ہے اور ایک ہی فطرت کی کارفرمائی جلوہ گر ہے۔ کیونکہ اگر یہاں دو خدا ہوں دو قانون ہوں اور تخلیق و آفرینش کے اختیارات دو یا اس سے زیادہ طاقتوں میں انضمام پذیر ہوں تو یہ کارخانہ کھٹ سے برباد ہو کر رہ جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ اٰلِـہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَo(۲)

---

(۱) قٓ، ۵۰: ۱۶

(۲) الأنبیاء، ۲۱: ۲۲

’’اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور (بھی) معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے پس اللہ جو عرش کا مالک ہے ان (باتوں) سے پاک ہے جو یہ (مشرک) بیان کرتے ہیں o‘‘

کائنات کی وسعتوں اور بوقلمونیوں کے باجود اس میں قانون کی یک رنگی، استواری اور نتائج و اسباب میں نپے تلے ایک ہی نہج کی نشاندہی، ایسی چیزیں ہیں جن سے ان تمام غیر سائنسی افکار اور توہمات کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جن کو شرک نے پیدا کر رکھا تھا اور ہمیں کہنے کی اجازت دیجئے، کائنات کے بارے میں یہی وہ صاف ستھرا عقیدہ تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں میں علم و تحقیق کے دریچوں کو وا کیا جس نے سائنسی رجحانات کو پروان چڑھایا اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یونان کے خزائن فکری سے استفادہ کریں۔ ہم مستشرقین کے اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں کہ مسلمانوں میں علوم و فنون کے لئے تشنگی کا اظہار خارجی اسباب سے اُبھرا۔ یعنی اُنہوں نے محض اس وقت فلسفہ اور منطق کی طرف اپنی رغبت و میلان کا اظہار کیا، جب ان کو مختلف اقوام کے ساتھ بحث و مناظرہ کے درمیان اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور اُنہوں نے جان لیا کہ یونانی علوم سے آراستہ ہوئے بغیر اِسلامی تہذیب کی برتری ثابت کرنا دشوار ہے۔ ہم اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ مسلمانوں نے جب دوسرے فکری دھاروں کا سامنا کیا تو انہیں بحث و مناظرہ کی مصلحتوں کے پیش نظر اس دور کی ضیاء سے قلب و ذہن کو منور کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی مگر صرف اتنی سی بات سے مسلمانوں کے اس عظیم تر جذبہ تحقیق و تفحص کی توجیہ نہیں ہو پاتی جس کے پیش نظر یہ جملہ علوم و فنون کی طرف دیوانہ وار بڑھنے پر مجبور ہوئے کہ زمین کا کونہ کونہ چھانیں، علم النجوم کے رازوں کی دریافت کریں، طبیعیات میں نئے نئے تجربے کریں، طب، فلسفہ اور منطق کے سرچشموں سے پیاس بجھائیں اور اس جہاد علمی میں اپنی ہم عصر قوموں پر فائق ہو جائیں۔ اس جذبہ طلب و جستجو کے پیچھے جو اسباب کارفرما تھے وہ سراسر داخلی تھے۔ یہ قرآن حکیم کی اس تعلیم کا فیض تھا جس نے مسلمانوں کو

کائنات میں غور وفکر کی دعوت دی جس نے مشرکانہ توہمات پر کاری ضرب لگائی اور توحید کے ذریعہ اس یقین کو بیدار کیا کہ اس کارگاہِ حیات میں نتیجہ وسبب میں جو لزوم پایا جاتا ہے اور اسباب کی کڑیاں جس طرح مسببات سے وابستہ ہیں اس میں صرف ایک ہی قانون اور قاعدہ کا چلن ہے اس میں دورنگی پائی نہیں جاتی۔ کیونکہ اگر اس کائنات کا پروردگار ایک اور یقیناً ایک ہے تو منطقی طور پر اس میں دو ارادے، دو قانون اور فرماں روائی کے دو الگ الگ اسلوب پائے نہیں جا سکتے۔

عقیدۂ توحید علمی سے بڑھ کر اہم عملی حقیقت بھی ہے

توحید مجرد ایک علمی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت بھی ہے۔ انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، توحید کے تصور سے یک سر بدل کر رہ جاتی ہے۔ ان اثرات میں سے چند ایک کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

انسانی زندگی پر اس کا سب سے نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہ عقیدہ انسان کو آزادی وحریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے مستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لئے ہوتی ہے لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے، غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور اپنے شرف اور اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کے برخلاف عقیدۂ توحید انسان میں انتہا درجے کی خودداری اور عزت نفس پیدا کر دیتا ہے اس پر اعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ صرف ایک خدا تمام طاقتوں کا مالک ہے اس کے سوا کوئی نفع و نقصان پہنچانے والا نہیں، کوئی مارنے والا جلانے والا نہیں، کوئی صاحب اختیار اور بااثر نہیں۔ یہ علم اور یقین اس کو اللہ کے سوا تمام قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف کر دیتا ہے۔ اس کی گردن کسی مخلوق کے سامنے نہیں جھکتی، اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا۔ یہ صفات سوائے عقیدۂ توحید کے اور کسی عقیدے سے پیدا نہیں ہو سکتیں اور کفر کی لازمی خصوصیات یہ ہیں کہ انسان مخلوقات

کے آگے جھکے، ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھے، ان سے خوف کھائے اور ان ہی سے اُمیدیں وابستہ رکھے۔

عقیدۂ توحید اِنسان کو متواضع بناتا ہے

اس تمام خودداری اور عزّتِ نفس کے ساتھ یہ عقیدہ انسان میں تواضع اور انکسار بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کا قائل کبھی مغرور اور متکبر نہیں ہوسکتا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ اس کے مقابلے میں الحاد کا عقیدہ رکھنے والے کسی انسان کو کوئی دنیوی کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس کمال کو محض اپنی قابلیت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ عقیدۂ توحید رکھنے والا کبھی تنگ نظر نہیں ہوسکتا۔ وہ ایسے معبود برحق کا قائل ہوتا ہے جو زمین و آسمان کا خالق، مشرق و مغرب کا مالک اور تمام جہان کا پالنے والا ہے۔ اس ایمان کے بعد ساری کائنات کی کوئی چیز اسے غیر نظر نہیں آتی۔ وہ سب کو اپنی ذات کی طرح ایک ہی مالک کی ملکیت اور ایک بادشاہ کی رعیت سمجھتا ہے۔ اس کی ہمدردی محبت اور خدمت کسی دائرے کی پابند نہیں رہتی۔ اس کی نظر ویسی ہی غیر محدود ہو جاتی ہے جیسی خود خدائے تعالیٰ کی بادشاہی غیر محدود ہے۔ یہ بات کسی ایسے شخص کو حاصل نہیں ہوسکتی جو بہت سے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا قائل ہو۔ اس طرح عقیدۂ توحید پر ایمان لانے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور نیک عمل کے سوا اس کے لئے نجات اور فلاح کا کوئی ذریعہ نہیں کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جو بے نیاز ہے، کسی سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔ بے لاگ عدل کرنے والا ہے اور کسی کو اس کی خدائی میں کوئی دخل نہیں۔ اس کے مقابلے میں کفار و مشرکین ہمیشہ جھوٹی توقعات پر زندگی بسر کرتے ہیں ان میں کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا کا بیٹا ہمارے لئے کفارہ بن گیا، کوئی اپنے کو خدا کا چہیتا سمجھتا ہے، کوئی اپنے بزرگوں پر مغرور ہے، تو کسی کو گمان ہے کہ ہم نذر و نیاز دے کر چھوٹ جائیں گے۔ اس طرح کے اعتقادات انسان کو گمراہی میں پھنسائے رکھتے ہیں۔

عقیدۂ توحید یقین و اُمید کا نور پیدا کرتا ہے

اس عقیدے کا حامل کسی حال میں مایوس اور شکستہ دل نہیں ہوتا وہ ایک ایسے خدا پر ایمان رکھتا ہے جو زمین اور آسمان کے تمام خزانوں کا مالک ہے، جس کا فضل و کرم بے حد و حساب ہے جس کی قوتیں بے پایاں ہیں۔ یہ ایمان اس کے دل کو غیر معمولی تسکین بخشتا ہے۔ اس کو اطمینان سے بھر دیتا ہے اور ہمیشہ اُمیدوں سے لبریز رکھتا ہے۔ چاہے وہ دنیا کے سارے دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے۔ سارے اسباب کا رشتہ ٹوٹ جائے اور وسائل و ذرائع ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ دیں پھر بھی ایک خدا کا سہارا کسی حال میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اسی کے بل بوتے پر وہ نئ اُمیدوں کے ساتھ کوشش پر کوشش کئے چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف کفار و مشرکین کے دل چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کا بھروسہ محدود طاقتوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے مشکلات میں بہت جلد مایوسی ان کو گھیر لیتی ہے اور اکثر ایسی حالت میں وہ خودکشی تک کر گزرتے ہیں۔ عقیدۂ توحید انسان میں قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ حرص و ہوس اور رشک و حسد کے رکیق جذبات اس کے دل سے نکال دیتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے ناجائز اور ذلیل طریقے اختیار کرنے کا خیال تک اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ رزق اللہ تعالٰی کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے زیادہ دے، جس کو چاہے کم دے، عزت اور طاقت، ناموری اور حکومت سب کچھ اللہ تعالٰی کے اختیار میں ہے۔ اگر وہ دینا چاہے تو دنیا کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی اور نہ دینا چاہے تو کوئی طاقت دلوا نہیں سکتی۔ اس کے مقابلے میں مشرکین اور کفار اپنی کامیابی اور ناکامی کو اپنی کوششوں اور دنیوی طاقتوں کی مخالفت یا مدد پر موقوف سمجھتے ہیں، اسی لئے ان پر حرص و ہوس کا غلبہ رہتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے رشوت، خوشامد اور سازش اور ہر قسم کے بدترین ذرائع اختیار کرنے میں انہیں باک نہیں ہوتا۔ یہ عقیدہ انسان میں عزم و حوصلہ اور صبر و توکل کی زبردست طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ صبر و توکل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مومن کوشش اور سعی کو چھوڑ دیتا ہے اور ہاتھ پاؤں

توڑ کر بیٹھ جاتا ہے بلکہ اچھے مقاصد کے لئے سعی پیہم اللہ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ وہ جب دنیا میں بڑے کام انجام دینے کے لئے اُٹھتا ہے تو اس کے دل میں یہ یقین ہوتا ہے کہ میری پشت پر زمین و آسمان کے بادشاہ کی قوت ہے۔ ایسی قوت جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ خیال انسان کو پہاڑ کی سی مضبوطی عطا کرتا ہے اور دنیا کی ساری مشکلات اور ساری مصیبتیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اس کے عزم سے نہیں ہٹا سکتیں۔ پھر یہ اعتقاد انسان کو بہادر بنا دیتا ہے۔ انسان کو بزدل بنانے والی دراصل دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو جان و مال اور بچوں کی محبت اور دوسرے یہ خیال کہ خدا کے سوا کوئی اور مارنے یا جلانے کی طاقت رکھتا ہے اور یہ کہ انسان اپنی تدبیر سے موت کو ٹال سکتا ہے۔ توحید کا عقیدہ ان چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ پہلی چیز تو اس لئے نکل جاتی ہے کہ اس کا قائل اپنی جان و مال اور ہر چیز کا مالک خدا ہی کو سمجھتا ہے اور اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ رہی دوسری چیز تو وہ اس وجہ سے باقی نہیں رہتی کہ توحید کا عقیدہ رکھنے والے کے نزدیک جان لینے کی قدرت کسی انسان یا حیوان یا توپ یا تلوار میں نہیں، اس کا اختیار صرف خدا کا ہے اور اس نے موت کا جو وقت مقرر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی تمام قوتیں مل کر بھی چاہیں تو کسی کی جان نہیں لے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہوتا اس کے مقابلے میں تلواروں کی باڑھ اور گولیوں کی بوچھاڑ اور گولوں کی بارش اور فوجوں کی یورش سب ناکام رہ جاتی ہیں اور جب وہ اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے بڑھتا ہے تو اپنے سے دس گنا زیادہ طاقت کا بھی منہ پھیر دیتا ہے۔

عقیدۂ توحید، پابندِ قانون و اخلاق بناتا ہے

عقیدۂ توحید انسان کو خدا کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس عقیدے کا ماننے والا جانتا ہے کہ خدا ہر چھپی اور کھلی چیز سے باخبر ہے۔ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اگر ہم رات کے اندھیرے میں اور تنہائی کے گوشے میں بھی کوئی گناہ کریں تو خدا کو

اس کا علم ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارے دلوں کی گہرائی میں بھی کوئی برا ارادہ پیدا ہو تو خدا تک اس کی خبر پہنچ جاتی ہے۔ ہم سب سے چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ سب سے بھاگ سکتے ہیں مگر خدا سے فرار ممکن نہیں۔ سب کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں مگر خدا کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ یہ یقین جتنا مضبوط ہو گا اتنا ہی زیادہ وہ انسان اپنے خدا کے احکام کا مطیع ہوگا۔ جس چیز کو خدا نے حرام کیا ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ جس چیز کا اس نے حکم دیا ہے اُس کو تنہائی اور تاریکی میں بھی بجا لائے گا۔ کیونکہ اس کے ساتھ ایک ایسی پولیس لگی ہے جو کسی حال اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اس کو ایک ایسی عدالت کا کھٹکا لگا رہتا ہے جس کے وارنٹ سے وہ کہیں بھاگ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ہونے کے لئے سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان لانا ہے۔ مسلم کے معنی خدا کے فرمانبردار کے ہیں اور خدا کا فرمانبردار ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان اس بات پر یقین نہ لائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

عقیدۂ توحید اور اجتماعی زندگی

عقیدۂ توحید کا اجتماعی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قائم ہے اور کامل عدل اور صحیح مساوات عقیدۂ توحید کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا میں سائنس نے ترقی کی ہے اُس رفتار سے انسان کے شعور نے ترقی نہیں کی۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں، اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح مختصر کر دیا۔ رسل و رسائل کی آسانیوں نے اخبار و افکار کی نشر و اشاعت انتہائی سہل کر دی۔ اس وقت اقوام میں افراتفری کا عالم یہ ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے اور نہ آدم ۔ ہر قوم کا خدا الگ ہے، اس کی نسل الگ ہے، اس کی شہریت جدا ہے، اس کے معتقدات اور اخلاق جدا ہیں اور ہر قوم اس علیحدگی کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتی ہے بلکہ اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی

ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں اتحاد کے لئے کوئی مشترک رشتہ موجود نہیں۔ مشترک رشتہ صرف ایک ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ سب ایک ہی خدا کو مانیں۔ اس کے اُتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لئے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالم گیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہوسکتی ہے اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کی جائیں گی۔ وہ رشتے میں ایک اور گروہ کا اضافہ کریں گی اور کسی مشکل کو حل نہیں کرسکیں گی۔

عقیدۂ توحید امنِ عالم کی ضمانت فراہم کرتا ہے

توحید کامل کے بغیر دل میں اخلاق فاضلہ پیدا نہیں ہو سکتے۔ اطاعت خشوع، استقلال، توکل شجاعت اور اخلاص کی حالت اس وقت دل پر طاری ہوسکتی ہے جب یہ خیال ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، ضرورتوں اور اُمیدوں کی تکمیل کا مرکز ایک ہی ذات ہے جو شخص ایک کے سوا دوسروں کو بھی حاجت روا مانتا ہے اس کا سر ہر آستانے پر جھک جاتا ہے۔ تعمیر شخصیت کے لئے ایک عمدہ نمونے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی سیرت کی تعمیر اس بلند ذات کے نمونے پر کر سکے اور ایسی ذات صرف خالقِ کائنات ہے۔ جس کی نعمتوں کو دیکھ کر جذبہ سخاوت و فیاضی پیدا ہوتا ہے اس کے حکم کو ملاحظہ کر کے ضبط نفس کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اس کے علم و حکمت کو دیکھ کر علم و حکمت کا شوق بڑھتا ہے۔ عقیدۂ توحید سے اصلاحِ انسان اور بین الاقوامی امن قائم ہوتا ہے اور عدل و انصاف کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ جب ہر موحد کے دل میں یہ عقیدہ جم جاتا ہے کہ وہ ایک حاکم اعلیٰ کے علم و قدرت قاہرہ کے تحت ہے اور اس کے سامنے ہر فعل وعمل کے لئے مسئول ہے اور اس کی گرفت سے بچنے کے لئے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی تو وہ دل کسی ظلم اور بے انصافی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ چاہے انفرادی ظلم ہو یا اجتماعی اور اس طرح افراد اور حکومت دونوں کے مظالم کا سد باب ہو جاتا ہے جو اس عقیدے کے بغیر ممکن نہیں نہ قانون کے ذریعے نہ تعلیم،

پولیس اور فوج کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں پولیس، تعلیم، فوج، عدالتوں اور تمام تدابیرِ امن و انصاف کے باوجود امن و انصاف کا کہیں بھی وجود نہیں اور تمام تر تدابیر امن و انصاف ناکام ہو چکی ہیں۔ دنیا کے انسان قوی اور ضعیف، ظالم اور مظلوم میں تقسیم ہیں اور مادی اسباب کے لحاظ سے ضعیف اور مغلوب افراد و اقوام کے لئے جدوجہد کا کوئی محرک موجود نہیں لیکن عقیدۂ توحید ایسے بے سہاروں اور نااُمیدوں کے لئے ایک ایسی قوت ہے جس کی وجہ سے ان کے دل مضبوط اور قوی ہو جاتے ہیں اور یہی عقیدہ ان میں جوش عمل پیدا کر کے ان کو فاتح اور کامیاب بنا دیتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور گذشتہ مسلمانوں کی فتوحات کا بڑا سبب عقیدہ توحید کا پیدا کردہ جوشِ عمل تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے سے دس گنا طاقتور اقوام کو شکست دی جب موحد کا دل خالقِ کائنات کی عظیم طاقت کے ساتھ توحید کے رشتے کی وجہ سے مربوط ہو جاتا ہے تو حیرت انگیز کارنامے ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔

عقیدۂ توحید جرأت و شجاعت کا سرچشمہ ہے

عقیدۂ توحید یہ تصور عطا کرتا ہے کہ ہر مقصد کی کامیابی اور ہر جنگ میں فتح یابی کے لئے اگرچہ تمام مادی اسباب کی فراہمی ضروری اور فرض ہے لیکن کامیابی اور فتح یابی کا آخری فیصلہ خالقِ کائنات کی نصرت اور اس کی غیبی امداد پر موقوف ہے جس کی حکومت انسان کے ظاہر و باطن پر ہے اور اسی ہاتھ میں مادی اسباب کی مؤثریت اور بے اثر کر دینے کی باگ ڈور ہے۔ جب وہی عظیم قوت ایمان و عملِ صالح کے ذریعہ کسی فرد یا قوم کے ساتھ ہو تو اگرچہ وہ قوم تعداد میں اور اسباب و وسائل میں مقابل قوم سے کم ہو تو بھی اس کی نصرت قلیل التعداد جماعت کو کثیر التعداد اور کم وسائل رکھنے والی جماعت کو وسیع وسائل رکھنے والی قوم پر فتح دلا دیتی ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝[1]

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۴۹

’’کئی مرتبہ اللہ کے حکم سے تھوڑی سی جماعت (خاصی) بڑی جماعت پر غالب آ جاتی ہے، اور اللہ صبر کرنے والوں کو اپنی معیّت سے نوازتا ہےo‘‘

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَo(۱)

’’اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں بے سہارا چھوڑ دے تو پھر کون ایسا ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے؟ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیئےo‘‘

اس حقیقت کی صداقت کے لئے اِسلامی تاریخ کے سینکڑوں واقعات واضح دلائل ہیں۔

عقیدۂ توحید اور فکر و عمل کی یگانگت

ایک قوم و ملت کی قوت کے لئے اس کی تنظیم ضروری ہے۔ تنظیم اور اتحاد کی بنیاد فکر و عمل کی وحدت ہے۔ عقیدۂ توحید موحد قوم کو فکر و عمل کی یگانگت عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور دنیوی یا شخصی مفاد اس کی کامیابی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی اور منزلِ مقصود کی راہ کی تمام رکاوٹوں کو دریائے توحید خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

عقیدۂ توحید انسانی مسائل کا حل

خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب ہم پا چکے ہیں دلائل و شواہد کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر انسانی مسائل حل

(۱) آل عمران، ۳: ۱۶۰

ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ انسانی مسائل کیا ہیں؟ اگر ہم تمام انسانی مسائل کا استقصاء کرنے بیٹھیں تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے گا اور بحث کا حق پھر بھی ادا نہ ہو سکے گا۔

عقیدۂ توحید اور فلسفہ اخلاق

انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ اس کا اخلاقی مسئلہ ہے ہر چیز سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انسان انسان بنے، اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور احساس ذمہ داری کے تحت زندگی کے سارے کام انجام دے، ہر حال میں انصاف اور حق پر قائم رہے اور ہر حال میں حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے، صرف جائز اور صحیح مقاصد کو اپنا مطمع نظر بنائے اور ان کے حصول کے لئے جائز ذرائع ہی اختیار کرے، خیانت، بے ایمانی اور استحصال کی گندگی سے اپنا دامن ملوث نہ ہونے دے، جھوٹ، نفاق اور فریب دہی سے اس طرح بچے جیسے کوئی شیر کے منہ میں جانے سے بچتا ہو، عصبیت، بے جا طرفداری اور اقربا پروری سے گریزاں رہے۔ حق تلفی ایذا رسانی اور ظلم و نا انصافی، نفرت، عداوت اور بغض وحسد کے مذموم اور قابلِ نفرین جذبات سے اپنے دل کو پاک رکھے۔ انسانوں سے محبت کرے اور دُکھ درد میں ان کے کام آئے۔ انسانی جان و مال اور آبرو کو محترم سمجھے، عہد اور قول و قرار کو ہر قیمت پر ترجیح دے اور راست بازی اور ایفائے عہد کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ چھوڑے، دیانت، امانت اور حق شناسی و حق پرستی کو اپنا شعار بنائے اور حق ناشناسی، احسان فراموشی اور حمیتِ جاہلیہ سے اپنی زندگی کو پاک صاف رکھے۔ دورِ حاضر کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ انسان اخلاقی اوصاف سے جن پر اس کی فلاح و ارتقاء کا دارومدار ہے کیونکر متصف ہو؟ اس سوال کا تجزیہ کیجئے تو دو اہم سوالات سامنے آئیں گے۔ پہلا سوال یہ کہ اخلاقی اقدار کو تسلیم کیوں کیا جائے۔ ان اخلاقی اقدار کے پیچھے آخر کون سی تصدیق اور کونسا ایسا محرک ہے جس کے باعث انسان لازماً ان اقدار کو تسلیم کرے اور انہیں اپنی زندگی کی اساس بنائے۔ یہ بات کہ اخلاقی قدروں کو انسان ہمیشہ سے مانتا آیا ہے۔ آج کے انسان کے لئے کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں۔ ورنہ گزشتہ دور

کو دورِ جہالت سمجھتا ہے۔ اس نے تمام پرانے سانچوں اور نقشوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ کسی چیز کو تسلیم کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اسے تسلیم کرنے کی وجہ کیا ہے؟ آپ بعض اوصاف کو اچھا اور بعض کو برا کہتے ہیں، دورِ حاضر کا انسان پلٹ کر آپ سے پوچھتا ہے کہ اس کے اچھے اور اس کے بُرے ہونے کی سند کیا ہے؟ خیر و شر کے یہ پیمانے آپ کو کس مآخذ سے ملے؟ یہ سوال معقول اور فطری ہے۔ دورِ حاضر کے معلمینِ اخلاق نے اس بنیادی سوال کا جواب دینے کی اپنی سی پوری کوشش کی ہے مگر خدا سے بے نیاز ہوکر وہ کوئی ایسا مآخذ نہ پا سکے جو اخلاقی اقدار کے لئے واقعی سند بن سکتا۔ علم، عقل، وجدان اور تجربہ ان میں سے جسے بھی سند اور مآخذ کا مقام دیا جائے گا وہ سند صرف اس شخص کے لئے بنے گا جس کا علم، جس کی عقل، جس کا تجربہ یا جس کا وجدان اخلاقی قدروں کے حق میں شہادت دے، دوسرے انسانوں کے لئے یہ شہادت بیکار ہے اور متعلقہ شخص کے لئے بھی یہ شہادت اسی وقت کارآمد ہے جب تک اس کی رائے اور اس کا تجربہ بدل نہ جائے۔ پھر یہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ آخر ان چیزوں کا فیصلہ انسان کے لئے ایسا حکیمِ ناطق کیونکر بن سکتا ہے کہ انسان بے چون و چرا اُسے مان لے۔ مختلف چیزوں کو اخلاقی اقدار کا مآخذ ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قدریں متعین نہ رہیں۔ جس شخص نے جس اخلاقی قدر کو چاہا مان لیا اور اُس کے لئے جو دائرہ کار چاہا تجویز کر لیا اور جس اخلاقی قدر کا جی چاہا انکار کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بہت سے ذہنوں نے ان اقدار ہی کا انکار کر دیا۔ اُنہوں نے اس بات کے ثابت کرنے میں پورا زورِ استدلال صرف کیا کہ اخلاقی اقدار کوئی حقیقت اور کوئی قیمت نہیں رکھتیں۔ کچھ دوسرے افراد نے جن کا اثر موجودہ دور کے اجتماعی نقشہ میں بہت اُبھرا ہوا ہے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ قدریں خوبصورت اور سنہری جال ہیں، استحصال کرنے والے طبقات، جاگیردار اور سرمایہ دار کے بنے ہوئے جال جو غریب اور سیدھے سادے عوام کو پھانسنے کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اس بنیادی بات پر یہ پورا گروہ متفق تھا کہ اخلاقی اقدار انسان کے پیر کی بیڑیاں ہیں۔ جنہیں کاٹ پھینکا نہ گیا تو انسانی کارواں ٹھٹھر کر رہ جائے گا اور ارتقاء و کامرانی سے کبھی ہمکنار نہ ہو سکے گا۔ اِنسان

چلا کہاں سے تھا اور پہنچ کہاں گیا۔ انسان نے سفر کی ابتداء یہاں سے کی تھی کہ اخلاقی اقدار نوعِ انسانی کی فلاح وارتقاء کے لئے ناگزیر ہیں اور پہنچ یہاں گیا کہ اخلاقی قدریں انسانیت کے ارتقاء کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہیں اس لئے جس قدر جلد انہیں درمیان سے ہٹا دیا جائے بہتر ہے۔ ایسا کیوں ہوا انسان اس اتھارٹی کی جستجو میں نکلا تھا جس کے بل پر ان اقدار کو تسلیم کیا اور کرایا جا سکے۔ خدا سے بے نیاز ہو کر مسئلہ کو حل کرنا چاہا مگر مسئلہ نہ حل ہونا تھا نہ حل ہوا۔ اخلاقی اقدار کے لئے کوئی ایسی اتھارٹی نہ مل سکی جو اس مقام کی اہل ہوتی اور جس کے آگے انسان سر جھکا دیتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اخلاقی قدریں بے وزن اور بے سہارا ہو کر رہ گئیں۔ سوچنے والے دماغوں نے محسوس کیا کہ بلا کسی سند کے، بعض چیزوں کو اچھا اور بعض کو برا کہا جا رہا ہے اور بلا کسی معقول وجہ کے کچھ کاموں سے رُکنے اور کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان میں سے جو لوگ زیادہ جری تھے اُنہوں نے کھلم کھلا ان اقدار کا انکار کر دیا۔ جو لوگ جرأت کی کمی کے باعث انکار نہ کر سکے وہ بھی تذبذب کا شکار ہو گئے اور اخلاقی اقدار پر اعتماد انہیں بھی نہ رہا۔ جو اخلاقی اُصول قدیم ترین زمانے سے مسلمات میں شمار ہوتے تھے وہ اس طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیئے گئے گویا وہ جہالت وحماقت کا سب سے بڑا نشان ہوں۔ اِس صورتحال کے خوفناک نتائج منہ کھولے سامنے کھڑے ہیں۔ اخلاقی اقدار کے خاتمہ کا مطلب ہے انسانیت کا خاتمہ اور نوعِ انسانی کی مکمل تباہی و بربادی۔ جن افراد کو اس نازک صورتحال کا احساس ہے وہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اقدار کو اُن کا کھویا ہوا مقام واپس مل جائے۔ مگر یہ مقام کیسے ملے؟ اس بات کے سوچنے سے اُن کے دماغ عاجز ہیں۔ اخلاقی اقدار روحانیت کے لئے ناگزیر ہیں مگر وہ اس بنیاد پر مانی جاتی رہی ہیں کہ خدا اور مذہب نے انہیں بنیادی اہمیت دی ہے خدا اور مذہب کے انکار کے بعد اخلاقی اقدار کے لئے کوئی اتھارٹی باقی نہیں رہتی اور اُس کے بعد یہ توقع فضول ہے کہ انسان اپنی اُمنڈتی ہوئی خواہشات اور حسین و پُرکشش مفادات کے علی الرغم بے سہارا اور بے وُقعت اقدار کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے گا۔ نظری طور پر انکارِ خدا کا یہی نتیجہ نکلنا چاہیے اور انسانیت کا عملی تجربہ بھی اس کی تصدیق

کرتا ہے اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے بعد کسی کو یہ اُمید نہ رکھنی چاہیے کہ نوعِ انسانی ہلاکت و بربادی سے بچ سکے گی لیکن جونہی آپ خدا کے وجود کو تسلیم کر لیتے ہیں، اخلاقی اقدار کو اُن کا کھویا ہوا مقام واپس مل جاتا ہے۔ خدا کی ہستی فطری طور پر بھی ان اقدار کا ماخذ اور سند بننے کی اہلیت رکھتی ہے اور نوعِ انسانی کا عملی تجربہ بھی اس کے حق میں ہے کیونکہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ اسی بنیاد پر اخلاقی اقدار کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ خدا کو تسلیم کرتے ہی آپ اُسے اتھارٹی مان لیتے ہیں۔ خدا کائنات کا خالق اور مالک ہے اس لئے وہ اس کائنات کی آخری اور حقیقی اتھارٹی ہے۔ اُس کی ہر بات سند اور اٹل حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد کسی منظوری (Sanction) کی ضرورت نہیں جب اُس نے اخلاقی اُصولوں کو مستقل اقدار کا درجہ دے دیا اور انہیں نظامِ زندگی کی اساس بنا دیا تو کوئی نہیں جو اس کے فیصلہ کو چیلنج کر سکے۔ انسان اُس کا بندہ ہے اور بندہ کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مالک و آقا کو آخری اتھارٹی مانے اور اس کے فیصلہ اور حکم کے آگے بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دے۔ یہی نہیں، خالق کائنات کا علم اور مدبر کائنات کی حکمت شک و شبہ سے بالاتر ہے، جب اس کے علم و حکمت کی رُو سے اخلاقی اقدار انسان کے لئے بموجب فوز و فلاح ہیں تو انسان کا ناقص علم و دانش اس کی تصدیق کرے یا نہ کرے، بات ہمیشہ کے لئے طے ہو جاتی ہے اور بحث و نزاع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

خدا اور اُس کی تعلیمات کو ماننے سے صرف یہی سوال حل نہیں ہوتا بلکہ اس ضمن کی کئی اُلجھی ہوئی گتھیاں بھی آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں۔ خدا کا دین اخلاقی اقدار کی تصدیق و توثیق ہی نہیں کرتا۔ ان اخلاقی اقدار کو واضح اور غیر مبہم انداز میں بیان بھی کرتا ہے۔ پھر انہی کی بنیاد پر پوری انسانی زندگی کے لئے تفصیلی ضوابط بھی دیتا ہے اس طرح کہ زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی گوشہ اخلاقی اُصولوں کی گرفت سے نکلنے نہیں پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری انسانی زندگی اخلاق کے حسین سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ خدا کا انکار کرتے ہی یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے انکار کے ساتھ ہی خدائی

تعلیمات کا انکار خود بخود ہو جاتا ہے اور خدائی تعلیمات کے درمیان سے ہٹتے ہی اخلاقی اقدار واضح ومتعین نہیں رہتیں نہ وہ تفصیلی ضوابط باقی رہ جاتے ہیں جن کے ذریعہ اخلاقی اُصولوں پر انطباق ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر اخلاقی اقدار کو مارے باندھے کسی طرح مان بھی لیا جائے تو مسائل زندگی کی بھی کوئی عملی افادیت نہیں رہ جاتی اور اخلاقی مسئلہ جوں کا توں لاینحل رہتا ہے۔ دوسرا اہم سوال جس نے موجودہ دور کے علمائے اخلاقیات کو بری طرح پریشان کر رکھا ہے۔ جہاں تک اخلاق شکنی کے محرکات کا معاملہ ہے وہ ہر طرف موجود ہیں اقدار بکثرت موجود ہیں۔ انسان کے اپنے سینہ میں خواہشات و جذبات کا طوفان امنڈتا رہتا ہے جو اخلاقی اُصولوں کو بہا لے جانے کے لئے بالکل کافی ہے۔ پھر مادی مفادات اور عزت واقتدار کے بلند مناصب ہیں جو رہ رہ کر انسان کا دامن کھینچتے ہیں اور اُسے اخلاق شکنی ہی نہیں، خود فراموشی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان پہلے اور سنہرے فتنوں کے علاوہ قدم قدم پر شیاطین ملتے ہیں جو اس تگ ودَو میں لگے رہتے ہیں کہ بدی سے دور بھاگنے والا شخص کسی طرح بدی کا لذت آشنا ہو جائے پھر تو انسان مرتے مر جائے گا مگر بدی کو چھوڑنے کا نام نہ لے گا۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کچھ خیالی قسم کے فلسفی کہتے ہیں کہ اخلاقی اقدار کے لئے کسی محرک کی ضرورت نہیں ہے۔ نیکی کا نیکی ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ اسے اختیار کیا جائے اور بدی بدی ہونے کی حیثیت سے اس قابل ہے کہ انسان اس سے دور بھاگے۔ اس کے لئے کسی اور محرک کی ضرورت؟ بقول غالب:

طاعت میں تا نہ رہے مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کے بہشت کو

لیکن یہ اُس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حضرات انسانی فطرت سے قطعاً ناواقف

ہیں۔ اگر ان کی بات صحیح ہوتی تو انسان جانتے بوجھتے کبھی نیکی سے انحراف نہ کرتا اور نہ بدی کا عمداً کبھی مرتکب ہوتا۔ انسان کے ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے اور مخالف محرکات کی موجودگی میں تو ایجابی محرکات کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہمارے اندر اور ہمارے باہر اخلاق شکنی کے بے شمار محرکات موجود ہیں اور بعض اوقات یہ محرکات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ بدی کے تمام خارجی مواقع کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ کیا یہ صورتحال اس کی متقاضی نہیں کہ پیرویٔ اخلاق کے شدید اور پُر زور محرکات موجود ہوں تاکہ انسان اخلاق شکنی کے بجائے پیروی اخلاق کی طرف مائل ہو سکے۔ دورِ حاضر کے معلمینِ اخلاق نے خدا سے بے نیاز ہو کر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کسی نے کہا: اخلاق اُصولوں کو اختیار کرنے کا محرک خوشی کے حصول کی توقع ہے۔ کسی نے کہا، یہ محرک تحصیل کمالات کا جذبہ ہے، کسی نے کہا سوسائٹی کے خوف اور سوسائٹی میں نیک نام ہونے کی خواہش سے انسان برائیوں سے بچ سکتا ہے اور نیکیوں کو اختیار کر سکتا ہے۔ کسی نے اسٹیٹ کے خوف اور اس کی رضا جوئی کو محرک کا مقام دیا لیکن ان میں سے ایک شے بھی حقیقتاً نیکی کا محرک نہیں ہے۔ خوشی یقیناً نیکی سے بھی حاصل ہوتی ہے لیکن دنیا کے اکثر و بیشتر افراد خوشی ہی کے حصول کے لئے برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کمال ایک مبہم شے ہے اور بہت سے لوگ برائیوں میں سبقت لے جانے ہی کو کمال خیال کرتے ہیں اور اگر سوسائٹی میں منافی اخلاق قدریں عام ہو جائیں تو تحصیل کمال کا جذبہ ہی ہر شخص کو اخلاق شکنی پر آمادہ کرے گا۔ سوسائٹی اور اسٹیٹ کی بنیاد اخلاقی اُصولوں پر ہو۔ بصورتِ دیگر یہی جذبہ اخلاقی قدروں کی پامالی کا باعث بنے گا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ انسان سوسائٹی اور اسٹیٹ کو دھوکا دے دے اور یہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ خود سوسائٹی اور اسٹیٹ کیونکر پابند اخلاق ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ محرکات میں سے کوئی ایک محرک بھی انسان کو بدی و اخلاق شکنی سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ان میں سے کسی میں اتنا زور ہے کہ پابندیٔ اخلاق کا کوئی محرک موجود نہیں۔ اس صورتحال کے کتنے خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں اس کا آپ خود اندازہ کر

سکتے ہیں۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمہ اخلاقی اقدار کی پامالی عالمگیر و ہمہ گیر پامالی جس قدر اس دور میں ہوئی اور ہو رہی ہے چشم فلک نے ایسی پامالی کبھی نہیں دیکھی۔ یہ ہے خدا سے بے نیاز ہوکر اس مسئلہ کو حل کرنے کا حاصل لیکن خدا کو تسلیم کر لیجئے تو یہ لاینحل مسئلہ آپ سے حل ہو جاتا ہے۔ انسانی اعمال پر اِک نظر ڈالیے یا یہ اعمال کسی نقصان سے بچنے کے لئے ہوتے ہیں یا کسی فائدہ کے حصول کے لئے یا محبت و نفرت کے جذبات کے تحت۔ آگ سے ہر شخص بچتا ہے کیونکہ آگ سے نقصان پہنچ جانے کا خوف ہوتا ہے اور دوا کڑوی ہوتی ہے مگر فائدہ کی توقع میں انسان اسے پی جاتا ہے۔ بچہ کی پرورش سخت کٹھن کام ہے۔ مگر ماں باپ محبت کے باعث خوشی خوشی ساری کٹھنائیاں برداشت کرتے ہیں اور اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص ان کے بچہ کا جان لیوا ہے تو وہ اس سے شدید نفرت کرنے لگتے ہیں اور جذبۂ انتقام میں اندھے ہوکر وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے۔ خدا کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ سب محرکات پوری شدت کے ساتھ انسان کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ خدا کائنات کا خالق اور فرمانروا ہے اس سے یہ بات خود بہ خود سامنے آتی ہے کہ اس کی طاقت بے پناہ ہے۔ وہ اگر ناراض ہو جائے تو اس کا عذاب حد درجہ شدید ہوگا اور اگر وہ راضی ہو جائے تو اس کا اجر بھی بے پایاں ہوگا کیونکہ اس کے خزانے لامحدود ہیں پھر انسان دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے مگر خدا کو نہیں دے سکتا۔ انسان کا ایک ایک باطن اور اس کے دل کا ایک ایک ارادہ اور جذبہ سب کچھ اس کی نظر میں ہے اور وہ اندھیرے اُجالے، خلوت، جلوت، ہر حال میں اُسے دیکھ رہا ہے۔ انسان اُس کی گرفت سے بچ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر اس کی حکمرانی ہے۔ پھر جب خدا کی قدرت، حکمت اور اس کے اوصافِ کمال کا انسان تصور کرتا ہے، کائنات کے حسن و جمال میں شاہدِ حقیقت کے حسن کا پرتو دیکھتا ہے اور خود اس کی ذات پر خالق کائنات کی طرف سے انعامات و احسانات کی جو بے پایاں بارش ہر دم ہو رہی ہے، ان کا اسے ادراک و احساس ہوتا ہے تو اُس کا دل محبوب حقیقی اور محسنِ ازل کے شکر و محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اس کا رونگٹا رونگٹا اپنے محبوب رب کی حمد و ثناء کے ترانے

گاتا ہے اور جب اِسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محبوب آقا زندگی کو اخلاقی اقدار کے تحت دیکھنا پسند کرتا ہے اور بداخلاقی اور اخلاقی بے قیدی سے سخت ناراض ہوتا اور ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے جو بداخلاقی کے مجرم ہوتے ہیں تو وہ خوف، طمع اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ والہانہ اپنی زندگی کو اخلاقی اقدار کا پابند بنالیتا ہے اور اخلاق شکنی سے اس طرح نفرت کرنے لگتا ہے جس طرح کوئی شخص اپنے شدید دشمن یا اپنی محبوب ترین ہستی کے جانی دشمن سے نفرت کرتا ہو۔

الغرض آیت الکرسی ہر درد کی دوا اور ہر غم کا علاج ہے۔ اِس کے پڑھنے سے ہر آفت ٹل جاتی ہے، ہر مصیبت دور ہو جاتی ہے، ہر پریشانی ختم ہو جاتی ہے، ہر مشکل حل ہو جاتی ہے، ہر حاجت پوری ہو جاتی ہے، ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں، پہاڑ برابر قرض بھی ہو تو ادا ہو جاتا ہے، کاروبار میں وسعت پیدا ہوتی ہے، رزق میں برکت پیدا ہوتی ہے، عزّت میں اضافہ ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر سکونِ قلب نصیب ہوتا ہے اور اِس کو پڑھنے والا ہر وقت اللہ تعالیٰ کی امان میں رہتا ہے۔ آیت الکرسی کا وظیفہ صدیوں سے اولیاء و مشائخ کا معمول رہا ہے، کیونکہ یہ وہ آیت ہے کہ جس میں اِنسان کے ظاہری و باطنی، علمی و روحانی اور اعتقادی و عملی مسائل کی ہر اُلجھن کا حل موجود ہے۔

آیت الکرسی اِنسان کو ذہنی کرب اور فکری اُلجھنوں سے نجات دلاتی ہے۔ اِنسان اِس کارگاہِ حیات میں ہزاروں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہے، اُسے ہر وقت جس ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب و روح کی تلاش رہتی ہے وہ اُسے دنیا کی تمام آسائشیں اور سہولتیں مل کر بھی مہیا نہیں کرسکتیں۔ آیت الکرسی کے مضامین اور مطالب ایسے ہیں کہ جو غم و اندوہ کے مہیب اندھیروں اور رنج و الم کی محیط گھاٹیوں میں پھنسے ہوئے انسان کو سکونِ قلبی کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔

آیت الکرسی کی تاثیراتِ روحانی و ایمانی پر دیگر سورتوں کی طرح اجماعِ اُمت ہے۔ مخصوص اوقات یا مخصوص تعداد میں پڑھنے کی تاثیر برحق ہے۔ دراصل یہ تاثیرات بھی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس عالمِ اسباب کے اندر روحانی اسباب کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف معاملات میں حُصولِ مقاصد کے لئے مادی اسباب و ذرائع پیدا کیے ہیں۔ جن کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی علت و معلول کے تجزیئے سے اِنسانی فہم میں آ جاتی ہے۔ اِسی طرح اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ کے خرقِ عادت پہلو کے ظہور کے لئے روحانی اور غیر مادی اسباب و ذرائع بھی پیدا کیے ہیں، جن کی تاثیر کا ادراک و فہم صرف حجابات کے اُٹھنے سے حاصل ہوتا ہے، محض مادی پیمانوں سے نہیں۔ یہ معاملات صرف روح کے حیطۂ ادراک میں آتے ہیں، عقل کے بس میں نہیں، لہٰذا ایسے مسائل پر عقل کا فتویٰ معتبر نہیں ہو سکتا۔

الغرض کائنات کی اِبتداء سے انتہاء تک متصرفِ حقیقی، مستعانِ حقیقی اور حقیقی مُشکل کشا اور اصل فریاد رس ایک ہی ہستی ہے اور صرف اُسی کے سامنے جبینِ عبادت جُھکانے کی اجازت دی گئی ہے۔ آیت الکرسی کے پہلے جملے سے لے کر آخری جملے تک اگر غور سے دیکھیں تو کوئی مقام خُدائے ذوالجلال کے ذکر سے خالی نہیں اور نہ عقیدۂ توحید کے بیان پر کوئی التباس یا دھندلا پن دکھائی دیتا ہے۔

اِس میں اللہ تعالیٰ کے کسی ایسے اوتار، مظہر یا نمائندے کا ذکر نہیں جس کی عبادت اصالتاً یا نیابتاً روا رکھی گئی ہو۔ نہ آیت الکرسی کسی دیوتا کا تصور دیتی ہے اور نہ کسی ثنویت و تثلیث کا۔ یہ اوّل سے آخر تک پیغامِ توحید ہے اور توحید کا بھی ایسا واضح اعلان ہے کہ جس میں نہ شرک فی الذات کی گنجائش ہے اور نہ شرک فی الصفات کی۔

تصورِ وحدت کے اساسی و بُنیادی نظریات آیت الکرسی نے مہیا کر دیئے ہیں۔ پورے قرآن میں کہیں بھی اِس سے متضاد و متناقض نقطۂ نظر بیان نہیں کیا گیا اور نہ ہی اِس میں یہ گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ خواص تصوّرِ وحدت کو زیبِ نظر بنائیں اور عوام مشرکانہ معتقدات کو۔ پس عوام و خواص سب کے لئے توحید کا ایک ہی تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو بالواسطہ یا بلا واسطہ جزاءً یا کلیتاً، دائمی یا عارضی طور پر کسی حال

اور کسی رنگ میں بھی شریک نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ آیت الکرسی کی اجمالی دعوت تھی جس کو قدرے تفصیل کے ساتھ ہم نے بیان کیا ہے اور بے بنیاد اور من گھڑت اور خود تراشیدہ فاسد و باطل عقائد کی بھی بیخ کُنی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اِسے شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

www.MinhajBooks.com

مآخذ و مراجع

www.MinhajBooks.com

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

۱۔ القرآن الحکیم۔

۲۔ **آلوسی**، ابو الفضل شہاب الدین السید محمود (۱۲۷۰ھ)۔ **روح المعاني في تفسير القرآن العظيم و السبع المثاني**۔ بیروت، لبنان: دار الاحیاء التراث۔

۳۔ **ابن ابی شیبہ**، ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان کوفی (۱۵۹۔۲۳۵ھ/ ۷۷۶۔۸۴۹ء)۔ **المصنف**۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ الرشد، ۱۴۰۹ھ۔

۴۔ **ابن جوزی**، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (۵۱۰۔۵۷۹ھ/ ۱۱۱۶۔۱۲۰۱ء)۔ **زاد المسير في علم التفسير**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۰۴ھ۔

۵۔ **ابن حبان**، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان (۲۷۰۔۳۵۴ھ/۸۸۴۔ ۹۶۵ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء۔

۶۔ **ابن حزم**، علی بن احمد بن سعید اندلسی (۳۸۴۔۴۵۶ھ/۹۹۴۔۱۰۶۴ء)۔ **المحلی**۔ بیروت، لبنان: دار الآفاق الجدیدہ۔

۷۔ **ابن خزیمہ**، ابو بکر محمد بن اسحاق (۲۲۳۔۳۱۱ھ/ ۸۳۸۔۹۲۴ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء۔

۸۔ **ابن عباس**، صحابیٔ رسول حضرت عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ (۶۸ھ)۔ **تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۹۔ **ابن کثیر**، ابو الفداء اسماعیل بن عمر (۷۰۱۔۷۷۴ھ/۱۳۰۱۔۱۳۷۳ء)۔ **تفسیر**

القرآن العظیم۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء۔

۱۰۔ **ابن ماجہ**، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹۔۲۷۳ھ/ ۸۲۴۔۸۸۷ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۱۱۔ **ابن منظور افریقی**، امام العلامۃ ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور المصری (۷۱۱ھ)۔ **لسان العرب**۔ بیروت، لبنان: دار صادر۔

۱۲۔ **ابو حیان**، محمد بن یوسف اندلسی غرناطی (۶۵۴۔۷۵۴ھ)۔ **البحر المحیط**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۱۳۔ **ابو داوٗد**، سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۰۲۔۲۷۵ھ/ ۸۱۷۔۸۸۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء۔

۱۴۔ **ابو سعود**، محمد بن محمد العمادی (۹۵۱ھ)۔ **تفسیر ارشاد العقل السلیم إلی مزایا القرآن الکریم**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۱۵۔ **ابو نعیم**، احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶۔۴۳۰ھ/ ۹۴۸۔۱۰۳۸ء)۔ **دلائل النبوۃ**۔ حیدر آباد، بھارت: مجلس دائرہ معارف عثمانیہ، ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء۔

۱۶۔ **ابو یعلی**، احمد بن علی بن مثنی بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال موصلی تمیمی (۲۱۰۔۳۰۷ھ/ ۸۲۵۔۹۱۹ء)۔ **المسند**۔ دمشق، شام: دار المأمون للتراث، ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء۔

۱۷۔ **ابو یوسف**، یعقوب بن ابراہیم (م ۱۸۲ھ)۔ **کتاب الخراج**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔

۱۸۔ **احمد بن حنبل**، ابو عبد اللہ بن محمد (۱۶۴۔۲۴۱ھ/ ۷۸۰۔۸۵۵ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء۔

۱۹۔ **اقبال**، علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء)۔ **کلیات اقبال (فارسی)**۔ لاہور،

پاکستان: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء۔

۲۰۔ **اِسماعیل حقی**، علامہ اِسماعیل حقی حنفی (۱۱۳۷ھ)۔ **تفسیر روح البیان**۔ کوئٹہ، پاکستان: مکتبۂ اِسلامیہ کوئٹہ۔

۲۱۔ **بخاری**، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴۔۲۵۶ھ/ ۸۱۰۔ ۸۷۰ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان + دمشق، شام: دار القلم، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔

۲۲۔ **بغوی**، ابو محمد حسین بن مسعود بن محمد (۴۳۶۔۵۱۶ھ/ ۱۰۴۴۔۱۱۲۲ء)۔ **معالم التنزیل**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفۃ، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۲۳۔ **بغوی**، ابو محمد بن فراء حسین بن مسعود بن محمد (۴۳۶۔۵۱۶ھ/ ۱۰۴۴۔۱۱۲۲ء)۔ **شرح السنہ**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۲۴۔ **بیضاوی**، ناصر الدین ابی سعید عبد اللہ بن عمر بن محمد شیرازی بیضاوی (۷۹۱ھ)۔ **أنوار التنزیل**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۶ء۔

۲۵۔ **بیہقی**، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴۔۴۵۸ھ/ ۹۹۴۔ ۱۰۶۶ء)۔ **الأسماء والصفات**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۲۶۔ **بیہقی**، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴۔۴۵۸ھ/ ۹۹۴۔ ۱۰۶۶ء)۔ **دلائل النبوۃ**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۲۷۔ **بیہقی**، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴۔۴۵۸ھ/ ۹۹۴۔۱۰۶۶ء)۔ **السنن الکبریٰ**۔ مکہ مکرمہ، سعودی عرب: مکتبہ دار الباز، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء۔

۲۸۔ **بیہقی**، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴۔۴۵۸ھ/ ۹۹۴۔ ۱۰۶۶ء)۔ **شعب الإیمان**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۲۹۔ **ترمذی**، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی (۲۱۰۔۲۷۹ھ/ ۸۲۵۔۸۹۲ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۸ء۔

۳۰۔ **تفتازانی**، سعد الدین مسعود بن عمر بن عبداللہ (۷۱۲۔۷۹۱ھ/ ۱۳۱۲۔۱۳۸۹ء)۔ **شرح العقائد النسفیۃ**۔ کراچی، پاکستان: مکتبہ خیر کثیر۔

۳۱۔ **جرجانی**، علی بن محمد بن علی، سید شریف (۷۴۰۔ ۸۱۶ھ)۔ **التعریفات**۔ بیروت، لبنان: عالم الکتب، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۶ء۔

۳۲۔ **عجیلی**، سلیمان بن عمر الشافعی (م ۱۲۰۴ھ)۔ **الفتوحات الإلٰھیۃ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الحنفیۃ (المعروف بہ: تفسیر الجمل)**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر۔

۳۳۔ **حاکم**، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد (۳۲۱۔۴۰۵ھ/ ۹۳۳۔۱۰۱۴ء)۔ **المستدرک علی الصحیحین**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۳۴۔ **خازن**، علی بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن خلیل (۶۷۸۔۷۴۱ھ/ ۱۲۷۹۔ ۱۳۴۰ء)۔ **لباب التأویل فی معانی التنزیل**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔

۳۵۔ **دار قطنی**، ابو الحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان (۳۰۶۔ ۳۸۵ھ/ ۹۱۸۔۹۹۵ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء۔

۳۶۔ **دارمی**، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن (۱۸۱۔۲۵۵ھ/ ۷۹۷۔۸۶۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ۔

۳۷۔ **ذہبی**، شمس الدین محمد بن احمد (۶۷۳۔۷۴۸ھ)۔ **میزان الإعتدال فی نقد الرجال**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۵ء۔

۳۸۔ **راغب اصفہانی**، ابو قاسم حسین بن محمد (م ۵۰۲ھ/ ۱۱۰۸ء)۔ **المفردات**۔ دمشق، شام: دار القلم۔

۳۹۔ **رازی، محمد** بن عمر بن حسن بن حسین بن علی تیمی (۵۴۳۔۶۰۶ھ/ ۱۱۴۹۔۱۲۱۰ء)۔ **التفسیر الکبیر**۔ تہران، ایران: دارالکتب العلمیہ۔

۴۰۔ **رشیدرضا**، علامہ محمد رشید رضا، (۱۳۵۴ھ)۔ **تفسیر المنار**۔ **بیروت**، دارالمعرفۃ

۴۱۔ **زمخشری**، امام جاراللہ محمد بن عمر بن محمد خوارزمی (۴۲۷۔۵۳۸ھ)۔ **الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل**۔ قاہرہ، مصر: ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء۔

۴۲۔ **سعید بن منصور**، ابوعثمان الخراسانی (م ۲۲۷ھ)۔ **السنن**۔ ریاض، سعودی عرب: دار العصیمی، ۱۴۱۴ھ۔

۴۳۔ **سیوطی**، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء)۔ **آية الكرسي: معانيها وفضائلها**۔ بغداد، عراق: دار التربیۃ۔

۴۴۔ **سیوطی**، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء)۔ **الجامع الصغير في أحاديث البشير ۵ النذیر**۔ **بیروت**، لبنان: دارالکتب العلمیہ۔

۴۵۔ **سیوطی**، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵۔ ۱۵۰۵ء)۔ **الدر المنثور في التفسير بالمأثور**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفۃ۔

۴۶۔ **سیوطی**، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء) + **محلی**، جلال الدین محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم بن احمد بن ہاشم (۷۹۱۔۸۶۴ھ/ ۱۳۸۹۔۱۴۵۹ء)۔ **تفسير الجلالين**۔ بیروت لبنان: دار ابن کثیر، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۴۷۔ **شاہ ولی اللہ**، محدث دہلوی (م: ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۲ء)۔ **التفهيمات الالهٰيه**۔ حیدر

آباد / پاکستان: مطبع حیدری، ۱۹۶۷ء۔

۴۸۔ **شاہ ولی اللہ**، محدث دہلوی (م: ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۲ء)۔ **حجۃ اللہ البالغۃ**۔ لاہور، پاکستان: المکتبۃ السّلفیہ۔

۴۹۔ **شعرانی**، ابو العمران عبدالوہاب بن احمد بن علی ال الشافعی المصری المعروف بالشعرانی، (۸۹۸۔۹۷۳ھ)۔ **الیواقیت والجواھر فی بیان عقائد الأکابر**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۵۰۔ **طبرانی**، سلیمان بن احمد (۲۶۰۔۳۶۰ھ/۸۷۳۔۹۷۱ء)۔ **المعجم الأوسط**۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ المعارف، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

۵۱۔ **طبرانی**، سلیمان بن احمد (۲۶۰۔۳۶۰ھ/۸۷۳۔۹۷۱ء)۔ **المعجم الکبیر**۔ موصل، عراق: مکتبۃ العلوم والحکم، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۳ء۔

۵۲۔ **طبری**، ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید (۲۲۴۔۳۱۰ھ/۸۳۹۔۹۲۳ء)۔ **جامع البیان فی تفسیر القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء۔

۵۳۔ **عبد بن حمید**، ابو محمد بن نصر الکسی (م ۲۴۹ھ/۸۶۳ء)۔ **المسند**۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ السنہ، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء۔

۵۴۔ **عسقلانی**، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳۔۸۵۲ھ/۱۳۷۲۔۱۴۴۹ء)۔ **فتح الباری بشرح صحیح البخاری**۔ لاہور، پاکستان: دارنشر الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔

۵۵۔ **قاضی ثناء اللہ پانی پتی** (۱۲۲۵ھ)۔ **التفسیر المظھری**۔ کوئٹہ، پاکستان: بلوچستان بک ڈپو۔

۵۶۔ **قاضی عیاض**، ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض یحصبی (۴۷۶۔۵۴۴ھ/۱۰۸۳۔۱۱۴۹ء)۔ **الشفا بتعریف**

حقوق المصطفی۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی۔

۵۷۔ **قرطبی**، ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن محمد بن یحییٰ بن مفرج اُموی (۲۸۴۔۳۸۰ھ/۸۹۷۔۹۹۰ء)۔ **الجامع لأحکام القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۵۸۔ **قضاعی**، ابو عبد اللہ محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون بن ابراہیم بن محمد بن مسلم قضاعی (م ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء)۔ **مسند الشھاب**۔ بیروت، لبنان: مؤسسة الرسالہ، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۶ء۔

۵۹۔ **مالک**، ابن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث اَصبحی (۹۳۔۱۷۹ھ/ ۷۱۲۔۷۹۵ء)۔ **الموطأ**۔ بیروت، لبنان: داراحیاء التراث العربی، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۶۰۔ **محمد عبدہ**، الشیخ۔ **نھج البلاغة**۔ بغداد، عراق: دار الکتب العلیمہ۔

۶۱۔ **مسلم**، ابن الحجاج قشیری (۲۰۶۔ ۲۶۱ھ/ ۸۲۱۔۸۷۵ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۶۲۔ **مقدسی**، شیخ ضیاء الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد الواحد بن عبد الرحمان حنبلی مقدسی (۵۶۷۔۶۴۳ھ)۔ **الأحایث المختارة**۔ مکۃ المکرّمۃ، مکتبۃ النھضۃ، ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء۔

۶۳۔ **ملا علی قاری**، نور الدین بن سلطان محمد ہروی حنفی (م ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۶ء)۔ **مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰة المصابیح**۔ بمبئی، بھارت، اصح المطابع۔

۶۴۔ **منذری**، ابو محمد عبد العظیم بن عبد القوی بن عبد اللہ بن سلامہ بن سعد (۵۸۱۔۶۵۶ھ/ ۱۱۸۵۔۱۲۵۸ء)۔ **الترغیب و الترھیب من الحدیث الشریف**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ۔

۶۵۔ **نسائی**، احمد بن شعیب (۲۱۵۔۳۰۳ھ/ ۸۳۰۔۹۱۵ء)۔ **السنن**۔ بیروت،

لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء۔

۶۶۔ **نسائی**، احمد بن شعیب (۲۱۵۔۳۰۳ھ/ ۸۳۰۔۹۱۵ء)۔**السنن الکبریٰ**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء۔

۶۷۔ **نسفی**، عمر بن محمد نسفی (۵۳۷ھ)۔ **العقیدۃ النسفیۃ**۔ بیروت، لبنان، مرکز الخدمات والأبحاث الثقافیہ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

۶۸۔ **نسفی**، عبداللہ بن محمود بن احمد نسفی (۷۱۰ھ) ۔**مدارک التنزیل و حقائق التأویل**۔ **بیروت**، لبنان، دار احیاء التراث العربی۔

۶۹۔ **ہیثمی**، نور الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر بن سلیمان (۷۳۵۔۸۰۷ھ/ ۱۳۳۵۔۱۴۰۵ء) ۔**مجمع الزوائد و منبع الفوئد**۔ قاہرہ، مصر: دار الریان للتراث + بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۷۰۔ **ہندی**، حسام الدین، علاء الدین علی متقی (م ۹۷۵ھ)۔ **کنز العمال**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۳۹۹/ ۱۹۷۹۔

71. Haroon Yahyah, *ALLAH IS KNOWN THROUGH REASON*. Translated by. Dr Tsadduq Husain Raja, Islamic Research Centre Pakistan, 2000.

www.MinhajBooks.com